خدا بخش لائبریری جرنل

شمارہ : ۱۸۳ــ ۱۸۶ جنوری ــ دسمبر ۲۰۱۶

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ایڈیٹر
ڈاکٹر شائستہ بیدار
ڈائریکٹر، خدابخش لائبریری

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۱۸۳-۱۸۶

زرسالانہ
افراد : ۴۰۰/-
ادارہ : ۵۰۰/-
غیر ممالک
افراد : **۳۰ڈالر**
ادارہ : **۶۰ڈالر**

مقالہ نگاروں کے افکار و آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

محمد جاوید اشرف نے پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	پانچ-چھ
ہند اسلامی میں اسلام اور مسلمان، از مولانا مناظر احسن گیلانی	۱
نقش و نگارِ طاقِ نسیاں : خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک بھولی بسری طویل ترقی پسند نظم (ش)	۶۹
نواب سید امیر علی خاں بہادر : احوال و آثار، از ڈاکٹر منظر اعجاز	۹۳
بہار کا سب سے پہلا اردو کتب خانہ: الفلاح استھانواں، از ڈاکٹر طلحہ نعمت ندوی	۱۰۷
نثر کے بنیادی خصائص : چند مباحث، از ڈاکٹر ممتاز احمد خاں	۱۲۱
سردار جعفری کے اہم خطوط بنام ڈاکٹر محمد حسن، پیشکش از ڈاکٹر فردالحسن	۱۳۰
آزادی کے بعد اردو کے بڑے تبصرہ نگار : ہماری زبان کے تبصروں کا اشاریہ (ش)	۱۶۵
کتاب الہند مصدر مھم للاندولوجیۃ۔ للدکتورۃ عائشہ رئیس کمال	۱۹۴
تازہ کتب و رسائل: تعارف (ادارہ)	۲۰۳

انگریزی۔ ہندی

غلام حسین طباطبائی، از ڈاکٹر منیش کمار (انگریزی)	۱-۶
مولانا آزاد کیوں بڑے تھے : ان کی تحریروں سے اقتباسات (ہندی)	۱-۵۱

مقالہ نگار

☆ ڈاکٹر طلحہ نعمت ندوی، استھانواں، بہار شریف

☆ ڈاکٹر عائشہ رئیس کمال، صدر شعبۂ عربی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

☆ ڈاکٹر فرد الحسن، فیلو خدا بخش لائبریری (سابق)

☆ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، حاجی پور (بہار یونیورسٹی)

☆ مولانا مناظر احسن گیلانی، سابقاً صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔
متوطن: گیلانی، ضلع پٹنہ

☆ ڈاکٹر منظر اعجاز، سابق صدر شعبۂ اردو، پاٹلی پتر ایونیورسٹی، پٹنہ

☆ ڈاکٹر منیش کمار، ڈی اے وی پبلک اسکول، ٹرانسپورٹ نگر، کنکر باغ، پٹنہ

اداریہ

خدا بخش لائبریری ۲۰۱۴ء یا اس سے کچھ قبل ہی سے کچھ ایسے ناگزیر حالات سے گذری جس سے اپریل ۲۰۱۹ء سے پہلے نکل نہ پائی۔ لائبریری کا ایک سہ ماہی جرنل جو مرحوم قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی میں ۱۹۷۷ء سے نکلنا شروع ہوا، ۲۰۱۴ء میں پچھلی سیریز کا گویا آخری شمارہ نکلا، جو پورے ایک سال کے چار شماروں کی جگہ سال میں ایک شمارہ کے حساب سے شائع ہوا، اس کے بعد ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء، ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء کے دوران جو تعطل رہا، ایک سال کے ایک شمارے کے حساب سے تو ہو ہی جاتا؛ سو اب ہو گیا، اور ۲۰۱۴ء کی طرح ان چار برسوں کا بھی بھرت پورا ہو گیا، یعنی ایک سال کے ایک شمارہ ہی کا حساب بن پایا، مگر تسلسل رکھنے کے لئے نمبروں کو مسلسل کر دیا گیا، آگے پھر یہ ہوا کہ ۲۰۱۹ء میں سال میں ایک شمارے کی اوسط بڑھا کے سال میں دو شماروں تک لے آیا گیا ہے، یعنی جنوری تا جون ۲۰۱۹ء –اور– جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء۔

۲۰۱۵ تا ۲۰۱۹ء کے 'مقروض' شماروں میں بیشتر تو نئی تحریریں ہیں، مگر ایک آدھ وہ

بھی جو ہماری قدیم میراث میں شامل تھیں، اوران کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ انھیں ازسرِ نو شائع کیا جائے۔

ان برسوں کے قرضے کی ادائی میں ہمیں عبدالرحمٰن صاحب (ساکن ضلع ارریہ سابق ضلع پورنیہ) کا تعاون حاصل رہا، اس کے لئے دلی شکریہ۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب نے سال ۲۰۱۹ء میں اس سیکشن کا چارج سنبھالا، ان سے بھی تعاون ملا۔ چند مضامین کا پروف بھی اچھے طور سے پڑھا، اور مجموعی ہیئت کو سنوارنے میں بھی (فہرست وغیرہ) انھوں نے مدد دی، اس کے لئے ان کا شکریہ۔ سب سے اہم شکر گزاری پرانے خریداروں کی ہم پر واجب ہے، اور نئے خریداروں کی شکر گزاری بھی۔ مزید شکر گزاری ان رسائل کی بھی جو خدا بخش لائبریری کے ذخیرے کو بھرپور بنانے کے لئے اپنے مجلّات بھیجتے رہے ہیں۔ ان رسائل میں جو لائبریری کو موصول ہوتے رہے ہیں، اکثر کو ہم نے اپنی مستقل مبادلہ فہرست میں رکھا ہے، مبادلے والے رسائل کے مدیران کرام پر ہمارے جرنل کی رسید واجب ہے جب یہ تازہ شمارے ان تک پہنچ جائیں۔

ہمارا جرنل ان مضمون نگاروں کو پہنچنا ضروری ہے، اور متوقع مضمون نگاروں کو بھی، جو خدا بخش لائبریری اور اس کے جرنل سے تعلق بنائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

(ش)

اسلامک اسٹڈیز (علومِ اسلامیہ) کی ایک منی انسائکلوپیڈیا

ہندِ اسلامی میں اسلام اور مسلمان

ہندستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت

انتخاب وترتیبِ نو، مصنف ہی کے الفاظ میں

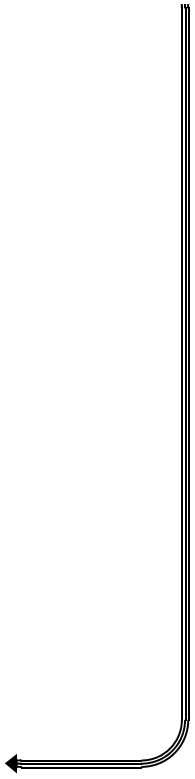

مولانا مناظر احسن گیلانی

گیلانی موضوعات کی فہرست

بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں،۱۰

برکات احمد ٹونکی،۱۲

طلبہ اساتذہ رشتے،۱۲

منصور لاہوری، شیخ،۱۴

بحر العلوم،۱۴

عبد الحی فرنگی محلی،۱۵

ثناء اللہ پانی پتی، قاضی،۱۶

غلط عمر: مجبور جھوٹ،۱۷

غیر ملکی زبانیں سیکھئے،۱۷

جھجھر کے نجف علی،۱۷

اکبری عہد،۱۷

زین العابدین بہاری،۱۸

بچوں کا حفظ قرآن،۱۹

چھتاری: حفظ قرآن،۱۹

خلیل شاہزادہ کا حفظ قرآن،۲۰

بیگڑہ،۲۰

علم سے علم الیقین تک،۲۰

مدرسہ سے خانقاہ،۲۰

اردو،۲۱

تبلیغ، گا بجا کر،۲۱

ہر قوم راست راہے...،۲۲

اسلام، جوڑنے والا،۲۲

حمید الدین ناگوری،۲۴

سلطان المشائخ کا فرمودہ،۲۴

مانڈو،۲۵

غیاث الدین،۲۶

خواجہ اجمیری کی قبر،۲۶

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو...،۲۷

شکر وصبر،۲۸

فاتحہ،۳۰

خانقاہ،۳۱

جیتل،۳۲

امیر خسرو،۳۲

دکن میں تصوف،۳۳

زین الدین شیرازی،۳۴

حسن سجزی،۳۴

آٹھوی صدی ہجری کا نصاب تعلیم،۳۴

منیری،۳۵

عورتیں، نماز با جماعت،۳۵

سماع میں تالی بجانے کی ممانعت،۳۵

مزامیر کی ممانعت،۳۶

سلطان جی،۳۶

میر خورد،۳۶

سلطان جی مرید ہونے والے،۳۸

پیری مریدی کا مقصد،۳۹

پابوسی،۴۰

غریبوں کا تعلق خانقاہوں سے،۴۳

سجدۂ تعظیمی،۴۱

شاہ بھیک،۴۵

روشن الدولہ کی ستر ہزار رقم،۴۶

شاہ بھیک: تین لاکھ کا مصرف،۴۷

مجدد الف ثانی کے پوتے کا حال،۴۸

شاہ بولن کا دستر خوان،۴۸

شیخ عزیز اللہ کی داد ودہش،۴۹

غریبوں سے ہمدردی،۵۰

خانقاہ محتاجوں کا سہارا،۵۱

سلطان المشائخ سے حسد،۵۲

سماع پر مباحثہ،۵۲

ہندو شاہ فرشتہ،۵۶

سلطان المشائخ: حدیث برتر یا فقہ،۵۶

تغلق اور مولانا زراوی،۵۸

بلگرام کے دل والے،۶۲

جادو،۶۳

ہندستان کی عظمت، مجدد،۶۵

دنیا کی پہلی سائکلو پیڈیا، ہند میں،۶۶

☆

O

''ترتیب مضامین کے متعلق تصنیفی نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی اس میں آورد کی بدمزگی آنے کے ساتھ آمد کا لطف جاتا رہے گا۔ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو،ان کے لئے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ ان کو آب پاشی کی رپورٹ یا بنیوں کا مدواری کھاتہ بنا دیا جائے۔ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے،اسی حال میں اس کو چھوڑ دیا جائے۔لاکھوں مرتّبہ کتابوں کے ساتھ آخر،کیا بگڑے گا اگر،ایک غیر مرتّب کتاب بھی لوگوں کے سامنے ہو''

اوپر کی سطور آپ نے ملاحظہ فرمالیں!

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ خود مولانا مناظر گیلانی کے دیباچے کا اقتباس ہے،جو مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت نامی اپنی اُس تصنیف پر لکھا ہے جو اردو کی مشہور کتابوں میں ہے، اس دیباچہ میں انھوں نے بڑی صفائی سے جو کچھ اقراری کیا اضطراری طور سے کہہ دیا ہے وہ بڑا قابل قدر ہے،مصنف اور تصنیف دونوں کو سمجھنے کے لئے!

تو جناب،یہ مولانا گیلانی کے بقول ایک ''غیر مرتّب کتاب''تو یقیناً ہے، مگر،بہت اہم کتاب بھی ہے!

ایک غیر مرتّب کتاب،ایک غیر منظّم مصنف کے قلم سے، جو اردو میں عرصہ سے معروف رہی ہے، مگر اس سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا،اس سے 'غیر مرتّب' ہونے کے سبب ہم محروم رہ گئے۔

اور،کیا شاندار کتاب ہے یہ :

انسائکلو پیڈیا کا لفظ اس پہ سجتا ہے،(اگر غیر مرتّب صفت کو نظر انداز کر دیا جائے)۔

علم کا سمندر تھے، مولانا گیلانی : سمندر کی لہریں کوئی پابندی قبول نہیں کرتیں:
مصنف نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے،
اس کا ضروری حصہ ہم نے آغاز میں نقل کر دیا،
اس سے، اب کتاب سے لطف اٹھانے میں، آپ کو سہولت ہو جائے گی،
آسانی کے لیے ہم نے ایک فہرست کا اضافہ ضروری سمجھا،
کہ سارا مواد ایک نظر میں سامنے آ جائے۔
ایک ایسی کتاب جیسی کہ ہمارے پیش نظر رہی، اس کی ایڈٹنگ 'دو گونہ عذابست جانِ مجنوں را':
یعنی پہلے تو فالتو حصے نکال دیئے جائیں،
پھر کام کے حصوں کا مرکزی خیال ذہن میں رکھ کے سرخیاں دی جائیں۔
تو،
پہلے تو ہم نے سات سو پچاس (۷۵۰) صفحوں کو ۲۰۰، میں ڈھالا،
پھر دو سو کو ۱۰۰ میں،
اور فی الحال سو میں سے پچاس انتخاب کر کے آپ کے لیے لے آئے ہیں۔
مزید براں، اتنا اور کیا ہے کہ،
مرکزی خیال تک پہنچنے کے لیے،
ان پر مناسب سرخیاں اپنی طرف سے دیدی ہیں۔

تو، فی الحال یہ نمونہ : پچاس ایک صفحے!
ابھی اصل کے اندر اتنا اور رہ گیا کہ چالیس پچاس صفحے کا مزید اہم مواد مل جائے گا،
سو، بقیہ سے، اس قرضے کی ادائی، اگلی بار!
اس طرح تقریباً سو صفحے میں، تمام و کمال، مولانا گیلانی کی دونوں جلدوں کی سمائی ہو جائے گی۔

میرے خیال میں مرحوم و مغفور نے اچھا کیا کہ
'برآور ہر چہ اندر سینہ داری' پر عمل کر کے
گھٹن سے بچ گئے!

ذراسی بولڈنس (Boldness) ہوتی تو،
ہم بھی گیلانی سنت پر عمل پیرا ہو جاتے! کاش!

کتاب تو بڑی زبردست لکھی ہے، مگر سو میں نوّے محروم رہ جائیں گے، عام قاری کے پڑھنے میں کیسے آئے! اتنی مفید کتاب، اور ایسی محروم کن!

ابھی زمین کی بات ہو رہی ہے تو ابھی آسمان کی، ابھی مولانا برکات کی تو ابھی مجدد صاحب کی، ابھی مغلیہ سکہ جیتل کی تو ابھی علما کے عبرانی زبان سیکھنے کی، ابھی یہ تو ابھی وہ!

ایک موضوع پر تو ہے نہیں یہ کتاب،
اس میں ڈیڑھ دو سو موضوعات سے کیا کم ہوں گے،
تو، مرکزی خیال سامنے رکھ کے، صحیح صحیح موضوع نکال کے،
اسے نئی شکل کیوں نہ دی جائے کہ افادہ عام ہو سکے۔
ہم نے بھی ایسا ہی سوچا، اور
علومِ اسلامیہ کے اس دائرۃ المعارف کو تین چار بار پڑھ کے ایسی شکل دینے کی کوشش کی کہ یہ زیادہ مفید بن سکے،
الفاظ سب مولانا گیلانی کے؛ ترتیب ہماری!
سو، یہ کوشش حاضر ہے۔

(ش)

مولانا گیلانی کی کتاب:

مولانا گیلانی کی کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۴۳ء (۳۲۸ص)، دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۴ء (۴۱۴ص)

انتخاب کرنے میں، بعض وجوہ سے ہم نے الٹے چلنا مناسب سمجھا یعنی جلد دوم کا ضروری مواد پہلے لیا، جلد اول کا بعد میں لیں گے۔ لکھنے کا جو طور مولانا گیلانی کا ہے، اس کی موجودگی میں اس الٹے شروع کرنے سے مواد پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

پہلی جلد کے اگلے صفحے پر ۱۹۴۴ء/۱۳۶۳ ہجری لکھا ہے۔ مصنف کے دیباچہ کی تاریخ ۱۹۴۲ء کتاب ۴/جنوری ۱۹۴۲ء کو پوری ہوئی جو مطابق تھا ۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲۲ ہجری کے۔ جو مطابق تھا حیدرآباد میں جاری فصلی کلینڈر کے اسفندیار ۱۳۵۲ فصلی کے۔ اس سے قبل کی ایک تاریخ مولانا گیلانی نے اپنے دیباچہ کے اختتام کی تاریخ اس طرح لکھی ہے: جمعہ ۲۵ ذی القعدہ ۱۳۶۱ ہجری = ۴/دسمبر ۱۹۴۲ء۔

(تاریخ تصنیف کے لحاظ سے تو یہ تاریخ اہم ہے ہی، یہ **تطابق** بھی بعض حوالوں میں بڑے کام آتا ہے، اس لیے ہم نے نقل کر دیا)

یہ پہلی بار ۱۳۶۳ ہجری مطابق ۱۹۴۴ء میں چھپی، ندوۃ المصنّفین دہلی سے۔ دوسری بار جلد اوّل ۱۹۶۶ء میں چھپی، جلد دوم ۱۹۸۴ء میں۔

●

مولانا گیلانی کی تصانیف کے بارے میں ایک عزیز، علی گڑھ کے ایک اسکالر، عبدالسلام صدیقی صاحب نے ہمیں کبھی جو خط (۲۸/اگست ۱۹۹۸ء) لکھا تھا، ان کے شکریہ کے ساتھ اسے نقل کیا جاتا ہے:

''آپ کا خط ملا، حوصلہ افزائی کے لیے بہت بہت شکریہ۔ میری معلومات اور تحقیق کے مطابق مولانا مناظر احسن گیلانی کی تالیفات درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ابوذر غفاریؓ، (۲) سوانح (قاسمی ۳ جلدوں میں)، (۳) تدوین حدیث، (۴) مقالات احسن، (۵) الدین القیم، (۶) ہزار سال پہلے، (۶) النبی الخاتم، (۸) حضرت اویس

قرنی، (۹) تدوین قرآن، (۱۰) تذکرہ شاہ ولی اللہ، (۱۱) ہندستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت (۲ جلدوں میں)، (۱۲) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ، (۱۳) ایک ہندستانی صحابیؓ بابارتن ہندی، (۱۴) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، (۱۵) اسلامی معاشیات، (۱۶) مسئلہ سود، (۱۷) اسلامی اشتراکیت، (۱۸) اسلام اور ہندومت کی بعض مشترکہ تعلیمات، (۱۹) تذکیر سورۃ الکہف، (۲۰) ظہور نورؐ، (۲۱) تدوین فقہ، (۲۲) کائنات روحانی، (۲۳) احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، (۲۴) اسفار اربعہ (ترجمہ)، (۲۵) طبقات (ترجمہ)، (۲۶) روزہ اور قرآن، (۲۷) دربار نبویؐ کی حاضری، (۲۸) شہادت حسنؓ، (۲۹) مثنوی خواب وطن، (۳۰) مکاتیب گیلانی (مرتبۂ مولانا منت اللہ رحمانی)، (۳۰) حیات گیلانی (مرتبۂ مفتی ظفیر الدین مفتاحی)

مولانا گیلانی کا انتقال ۱۹۵۶ء میں ہوا۔ پٹنہ کے قریب قصبہ گیلانی کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے، مگر ساری عمر حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں گزاردی، جہاں وہ شعبۂ دینیات کے چیئرمین تھے۔ آزادی کے بعد جو چیلنج امت کے سامنے آئے، مولانا گیلانی نے ان سے آنکھیں چار کرتے ہوئے جو کچھ لکھا وہ آج بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا مضمون ''اسلام اور ہندو مذہب کی مشترک تعلیمات'' اور ''مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام'' قابل ذکر ہیں۔ اللہ ان کی مغفرت کرے''۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی: کچھ مولانا گیلانی کے بارے میں

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ان چند گنے چنے علما میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، مولانا موصوف نے جو کتاب بھی لکھی، اس میں معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آئے گا، ترتیب وتہذیب پر کبھی کوئی خاص توجہ نہیں کی، مگر نتائج کے اخذ کرنے اور ایک واقعہ سے دسیوں استدلال قائم کرنے میں اپنی مثال آپ تھے۔

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ حیدرآباد (دکن) اسلامی ہند کے علمی اور دینی حلقوں میں ایک بلند مقام کے مالک ہیں، سیکڑوں بلند پایہ محققانہ مقالات اور متعدد علمی اور وقیع تصنیفات آپ کی وسعتِ نظر اور علوم اسلامیہ ودینیہ میں آپ کی محققانہ بصیرت کی شاہدِ عدل ہیں۔ مولانا موصوف نے نہایت جامعیت اور تفصیل سے اپنے مخصوص طرزِ انشا میں یہ بتایا ہے کہ ہندستان میں شروع سے لے کر اب تک مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت کیا رہا ہے، نصاب تعلیم

میں کن کن علوم وفنون کا درس شامل ہوتا تھا۔طریقِ تعلیم کیا تھا؟ علما کے قیام وطعام کا کیا انتظام ہوتا تھا؟ اساتذہ اور طلباء کے آپس کے تعلقات کس نوعیت کے ہوتے تھے، عام لوگ اور امراء داعیانِ ملک ان طلباء کو کس نگاہ سے دیکھتے تھے، پھر تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت اور تزکیۂ نفس کا بھی کتنا اہتمام ہوتا تھا۔غرض یہ ہے کہ تعلیم اور تعلم سے متعلق بحث کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنہ رہ گیا ہو اور جس پر فاضل مصنف نے سیر حاصل کلام نہ کیا ہو۔ بے شبہ اردو لٹریچر میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں اس جامعیت سے ہمارے گزشتہ نظامِ وتربیت پر بحث کی گئی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی: کچھ اپنی تحریر کے بارے میں

عجب اتفاق ہے، دار العلوم دیوبند کے مجلۂ شہریہ ''دار العلوم'' کے مدیر کا عنایت نامہ آیا کہ مضمون لکھ کر بھیج دو، دار العلوم ایک تعلیمی ادارہ ہے، اسی مناسبت کا خیال کر کے چار پانچ صفحوں کے مختصر مضمون کا ارادہ کر کے میں نے مولانا غلام علی آزاد بلگرامی مرحوم کی کتاب مآثر الکرام کو الٹنا پلٹنا شروع کیا، بعض کارآمد دلچسپ باتیں ہاتھ آئیں، قلم اٹھانا، لکھنا شروع کیا، اب میں نہیں جانتا کہ پھر کیا ہوا، قلم رواں ہوا، چلا، چلتا گیا، بات میں بات کا خیال آتا جاتا تھا، اور میں لکھتا جاتا تھا، پانچ صفحوں کے لکھنے کے لیے بیٹھا تھا، وہی اس وقت ۵۰ ۷ صفحات کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

یہ کیا ہے، کوئی مضمون ہے، مقالہ ہے، کتاب ہے، تجویزوں کا مجموعہ ہے یا تاریخی واقعات کا ذخیرہ، مجھے خود نہیں معلوم کیا ہے۔ ساری عمر پڑھنے پڑھانے میں گزری اور وہ بھی ایک خاص حال میں، تعلیم کے ابتدائی دن اپنے دیہاتی مستقر گیلانی (بہار) میں گزرے، وہاں سے اٹھا، راجپوتانہ ٹونک کی ایک معقولی اور منطقی آزاد درس گاہ مولانا برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں پہنچایا گیا، آٹھ نو سال وہاں گزارے، قسمت نے ٹونک سے دار العلوم دیوبند کے دینی ماحول میں پہنچا دیا، وہاں حدیث پڑھی، شیخ الہند حضرت سیدی ومرشدی مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت کی سعادت میسر آئی، علامہ کشمیریؒ سے مستفید ہونے کا موقع ملا''۔

فکرِ گیلانی: ان کی اپنی زبانی:

ہم نے یہ کیا ہے کہ پہلے ان کے فرمودات فکر شروع تا آخر پڑھ لیے پھر کام کی باتیں منتخب کر

لیں۔ پھر انھیں عنوانات دے دیے۔

ساتھ ساتھ فکر گیلانی کن موضوعات کے گرد گھومتی ہے، اس کا احاطہ: اس طرح ان موضوعاتِ سخن میں علامہ کی سوچ کو سمیٹ لیا گیا۔

مناظر احسن گیلانی: کچھ اپنے بارے میں مزید:

ترتیب مضامین کے متعلق تصنیفی نفسیات کے ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل بھی اختیار کی جائے گی اس میں آورد کی بدمزگی آنے کے ساتھ آمد کا لطف جاتا رہے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لیے نہیں لکھی گئی ہیں بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ان کو بنایا گیا ہو ان کے لیے یہ قطعاً غیر مناسب ہے کہ آب پاشی کی رپورٹ یا بنیوں کا مدواری کھاتہ ان کو بنا دیا جائے، ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے اسی حال میں اس کو چھوڑ دیا جائے۔ لاکھوں مرتّبہ کتابوں کے ساتھ آخر کیا بگڑے گا اگر ایک غیر مرتّب کتاب بھی لوگوں کے سامنے ہو۔

(ش)

بھوپال کے نواب صدیق حسن خان:

مرحوم نواب صدیق حسن خاں بھوپال والے، مفتی صدرالدین خاں صاحب کے یہاں دلی میں پڑھتے تھے۔ مفتی صاحب نے ان کی خاص دماغی حالت کو دیکھ کر ان کے لیے اسباق کا الگ مستقل انتظام کر دیا تھا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ بیان تقریباً نواب صاحب کے اپنے قلم ہی کا قلم بند کیا ہوا ہے۔

ایک سال آٹھ ماہ کی مدت میں کتب دانشمندی کو سبقاً سبقاً حاصل کیا۔ تحصیل سند حاصل کی (کذا)۔ کتب متداولہ علوم رسمیہ جن کو اس مدت میں حاصل کیا یہ ہیں:

مختصر معانی تا آخر عبادات۔ شرح وقایہ، معاملات۔ ہدایہ، اوائل۔ توضیح وتلویح اصول فقہ میں۔ سلّم مع ملاحسن۔ وحمداللہ وقاضی مبارک منطق میں۔ میبذی تمام وقدرے شمس بازغہ وصدرا، مایعلم الاجسام تک۔ میرزاہد، ملا جلال تا بحث دلالت۔ میرزاہد شرح مواقف تا بحث وجود۔ میرزاہد رسالہ تا مذہب منصور۔ صحیح بخاری کے تین جز سماعاً۔ اولِ تفسیر بیضاوی قرأۃ۔ دیوان متنبّی نصف اول۔ بعض دیوان حماسہ۔ سبعہ معلقہ۔ مقالہ اول اقلیدس۔ قطبی مع میر قطبی۔ شرح عقائد نسفی تمام۔ حاشیہ بحرالعلوم و برمیرزاہد۔ مقامات حریری وہندی چند مقالات۔ شرح مطالع سماعاً، ص ۳۴۶۔

ایک سال آٹھ مہینے کی مدت خیال کیجئے اور چھبیس کتابوں کے اس پشتارے کو ملاحظہ کیجئے۔

ہندستان کے ان عالموں میں، جن کی کتابیں ہند کے سوا مصر وقسطنطنیہ میں بھی طبع ہوئی ہیں ان میں، نواب صاحب بھی ہیں۔ خدا نے ان کو ایک موقع دیا تھا جس سے علم و دین کی خدمت میں انھوں نے پورا پورا نفع اٹھایا۔ اسلامی علوم میں شاید ہی کوئی فن ہوگا جس میں نواب صاحب کی کتاب نہ ہو لیکن مجھے مصر کی ایک کتاب ''اکتفاء القنوع'' میں یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اس نے نواب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

اصله من عوام الناس الا انه توصل الى ملكة بهوپال فى اقليم الدكن فى الهند وتزوج بها وسمى نائبا عنها فعند ما اختنى بالمال جمع اليه العلما وارسل الناس لاتباع الكتب الخطية من كل جهة وجمع مكتبته كبيرة وكلف من حوله من العلما بالتاليف ثم اخذ مصنفاتهم ونسبها لنفسه بل كان يختار الكتب القديمة التى لم تكن لها سوى النسخة الواحدة ويغير العنوان وتبدله باسم آخر

ویضع علی الصحیفة الاول اسماء القاب الفخر۔

(دراصل ان کا تعلق عوام کے خاندان سے ہے لیکن کسی طرح بھوپال دکن کی ملکہ تک رسائی حاصل کی اور ان سے شادی کر لی اور ان کی طرف سے نائب بن بیٹھے۔ پھر جب دولتمند ہو گئے تب علما کو اپنے اردگرد جمع کیا اور لوگوں کو کتابوں کے خریدنے کے لیے ادھر ادھر دنیا کے مختلف حصوں میں روانہ کیا جو ہاتھ کی لکھی ہوئی قلمی کتابیں فراہم کر کے ان تک پہنچاتے تھے۔ اس ذریعہ سے ایک بڑا عظیم کتب خانہ اس شخص نے جمع کر لیا اور اپنے دربار کے علما کو حکم دیا کہ کتابیں تصنیف کریں۔ پھر انہی کی تصنیف کردہ کتابوں کو اپنی طرف منسوب کر لیتے تھے بلکہ ایسی قلمی کتابیں ہیں جن کا دنیا میں ایک ہی نسخہ تھا اس کا نام اور ابتدا کا دیباچہ بدل کر لوح کتاب پر اپنا نام القابِ فاخرہ کے ساتھ درج کر دیتے تھے)۔

اس میں شک نہیں کہ نواب صاحب مرحوم کے متعلق اس قسم کی باتیں ہندستانی مولویوں میں بھی مشہور ہیں اور غالباً کسی ہندی مولوی ہی سے مصر کے اس عیسائی عالم کو اس کا سراغ ملا۔ لیکن خود نواب صاحب کے ملنے والوں سے جہاں تک میں نے سنا ہے عقیدتاً وعملاً ان کی حالت جیسی کچھ ہو لیکن علم کی سب تعریف کرتے ہیں۔

استاد کا جب یہ حال ہو، مثلاً اکبری عہد کے ایک عالم جو طبیب بھی تھے اس لیے حکیم الملک گیلانی کے نام سے مشہور تھے اصلی نام شمس الدین تھا، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ملازم تو دربار کے تھے، اکبر کے خصوصی معالجوں میں یہ بھی داخل تھے لیکن:

''پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نخوردے'' (مسلسل طلبہ کو اسباق پڑھاتے رہتے اور ان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے)۔ (تذکرہ علما ہند، ص ۵۱)۔

تنخواہ صیغہ طبابت سے مل رہی ہے، ایک حرف بھی نہ پڑھاتے تو ان کی تنخواہ میں پیسے کی کمی نہیں ہو سکتی تھی، نہ پڑھانے سے اضافہ، لیکن تعلیم کے لیے معاوضہ کی ضرورت اس زمانہ کا سوال ہی نہ تھا، اور اسی کے ساتھ طلبہ کو اپنے گھر سے کھانا بھی دینا، ان کا اتنا خیال کہ جب تک سب طالب العلم جمع نہیں ہو لیتے، خود بھی وہ کھانا نہیں کھاتے، سوچا جا سکتا ہے کہ ایسے استادوں کا قدرتاً تلامذہ کے قلوب پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔

مولانا برکات احمد ٹونکی:

میں نے عرض کیا تھا کہ خود ہمارے استاد مولانا برکات احمد ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کا قریب قریب یہی معاملہ تھا، وہ بھی تنخواہ طبابت کی راہ سے پاتے تھے لیکن عمر بھر پڑھاتے رہے، اور دس بیس طالب العلموں کو کھانا دے کر پڑھاتے رہے۔ اس راہ میں وقت کی، مال کی، دل کی، دماغ کی جو قربانیاں حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کرنی پڑیں، ان سے وہ یا ان کا خدا ہی واقف ہے لیکن اس کا اثر کیا تھا، میں نے نہیں دیکھا کہ کوئی طالب علم حضرت سے رخصت ہوا ہو اور بچوں کی طرح بلبلا کر رونہ پڑا ہو، دوسروں کا حال کیا بیان کروں خود راقم الحروف کا حال بھی یہی تھا، اور اب بھی حضرت والا کی پدرانہ شفقتوں کا جب خیال آتا ہے دل تڑپ اٹھتا ہے، بیتے ہوئے دن زندگی کے سامنے آجاتے ہیں۔

بے ساختہ یہاں اس واقعہ کے ذکر پر اپنے کو مجبور پاتا ہوں، حضرت حکیم صاحب بعض خاص پیچیدگیوں کی وجہ سے چند دنوں مالی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے لیکن ایک اندرونی واقعہ تھا جس کی دوسروں کو خبر نہ تھی، مصارف اپنے حال پر جاری تھے۔ طلبہ کی جتنی تعداد پہلے کھانا کھاتی تھی اندر سے ان کے لیے ہمیشہ کھانا آتا رہا۔ ایک حضرت کی اہلیہ محترمہ کو بالآخر انہی طلبہ کے لیے یہ کرنا پڑا کہ سونے کے کنگن انھوں نے اپنے ایک معتمد طالب العلم کو حوالے کیے بازار سے بیچ کر یا گروی رکھ کر ان کے روپیے سے گیہوں اور گھی خرید کر لا دے کہ طالب العلموں کے کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ کنگن فروخت کیے گئے اور ان طالب العلموں کو کھلا دیے گئے جن کی طرف سے دنیا میں حکیم صاحب ان کے اہل خاندان کو ایک حبہ کا نفع نہ اس وقت پہنچتا تھا اور نہ اب پہنچ رہا ہے۔

طلبہ سے استادوں کے رشتے:

میاں عبداللہ بداؤنی کے متعلق ملا عبدالقادر کی یہ شہادت پیش کرنی ہے کہ میاں صاحب کی منجملہ دوسری خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی:

''از پئے ابتیاع متاع خانہ خواہ قلیل باشد یا خواہ کثیر و سائر مصالح ضروری مایحتاج الیہ پیادہ بدکان و بازار تشریف می بردہ و برداشتہ بمنزل آورد''۔ (اپنے گھر کے لیے سودا خواہ زیادہ ہو یا کم اور تمام دوسری ضرورت کی چیزیں میاں صاحب پیادہ پا دکان اور بازار سے جا کر لاتے اور خود اپنے اوپر لاد کر ان کو گھر پہنچاتے)۔

''درمیانِ راہ جماعت طلبا را سبق نیز می فرمود و ہر چند می گویند کہ حاجت تصدیع مخدوم

نیست ما ایں خدمت را بجا می آریم قبول ندارد‘‘ (راستہ میں طلبہ کی ایک جماعت کو سبق پڑھاتے، وہ سب کہتے کہ حضرت کو تکلیف کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ اس خدمت کی بجا آوری کے لیے حاضر ہیں، انجام دے لیں گے لیکن آپ اسے قبول نہیں فرماتے)۔(ج ۳، ص ۵۶)۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ عبرت آموز واقعہ حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی رحمۃ اللہ کا ہے جن کا ذکر ابھی گذرا ہے۔ قاری صاحب کے سعادت مند حفید رشید جناب قاری عبدالحلیم صاحب معلم حالی ہائی اسکول پانی پت نے قاری صاحب کی جو سوانح عمری تذکرہ رحمانیہ کے نام سے مرتب کی ہے، اسی میں اس قصہ کو شیخ محمد ابراہیم حسن صاحب کی ایک کتاب منظوم ’’درۂ قرشی‘‘ سے بایں الفاظ درج فرمایا ہے:

’’میں (یعنی شیخ محمد ابراہیم) حضرت کے پاس بیٹھا تھا، آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادم خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوایا جائے کسی مستفید شاگرد نے حاضر خدمت ہوکر عرض کیا ’’لائیے یہ خط میں ڈال آؤں‘‘ اور بے حد اصرار کیا۔ حضرت نے فرمایا ’’میں تم سے یہ کام لینا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے۔ میرا حق استادی سمجھ کر یہ خط ڈاک میں ڈالو گے۔ میرے لئے یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے۔ اس لیے کہ لوجہ اللہ تعلیم کا خلوص باقی نہ رہے گا لہذا میں تم سے یہ معمولی کام لے کر اپنا ثواب کیوں ضائع کروں (ص ۱۹۹)‘‘۔

تذکرہ غوثیہ جو حضرت شاہ غوث علی بہاریؒ وطناً، و پانی پتی نزیلاً کے حالات میں ایک دلچسپ کتاب ہے۔ اس میں ایک قصہ مولانا فضل امام خیر آبادی کا درج ہے۔ غالباً شاہ غوث علی صاحب کے ساتھ کا واقعہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مولانا فضل خیر آبادی جو مولانا فضل امام کے صاحبزادے ہیں، جوان تھے، اور اپنے والد کے ساتھ خود بھی دلی میں درس دیتے تھے، جہاں مولانا فضل امام ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے صدر الصدور تھے۔ ایک طالب علم مولانا فضل امام سے پڑھنے آیا۔ انھوں نے مولوی فضل حق صاحب کے پاس اس کو بھیج دیا کہ مجھے فرصت نہیں ہے تم ہی پڑھا دیا کرو، یہ طالب علم بے چارا کچھ غبی تھا، مولوی فضل حق صاحب کی جوانی کا زمانہ چند اسباق کے بعد ان کا جی اکتا گیا۔ ایک دن پڑھاتے ہوئے کتاب پھینک دی اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا۔ طالب العلم مولانا فضل امام کے پاس پہنچا، اور حال بیان کیا۔ یہی سننے کی بات ہے، مولانا فضل امام آپے سے باہر ہو گئے۔ مولوی فضل حق کو اسی وقت طلب کیا۔ طلبی کا فقرہ تھا ’’بلاؤ اس خبیث کو‘‘، جوان عالم بیٹا ہے،

لیکن ایک طالب العلم کی تحقیر کی ہے۔مولوی فضل حق سامنے آتے ہیں۔لکھا ہے کہ بے تحاشا ایک تھپڑ مولوی فضل امام نے رسید کیا۔پگڑی دور جا پڑی اور فرماتے جاتے تھے: تو طلبہ کی قدر کیا جانے، بسم اللہ کے گنبد میں پلا ہے، خبردار! میرے طالب العلموں کو اگر کبھی کچھ کہا۔

شیخ منصور لاہوری:

بہرحال میں تو اساتذہ کے باہمی تعلقات کی مثالیں پیش کر رہا تھا۔ملا عبدالقادر بداؤنی نے اپنی تاریخ میں ایک واقعہ نقل کیا ہے شیخ منصور لاہوری اکبری دربار کے امراء میں تھے۔ایک زمانے تک مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے، پھر پنجاب کے علاقہ بجواڑہ اور حدود دامن کوہ کے ضبط و ربط کی خدمت ان ہی کے سپرد ہوئی۔یوں ہی وہ مختلف عہدوں اور مناصب پر سرفراز ہوتے رہے۔بڑی جاگیر کے مالک تھے۔علاوہ امیر کبیر ہونے کے علم میں بھی ان کا پایہ غیر معمولی تھا۔ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:

''در ہمہ علوم عقلی کہ در ہندستان متعارف است متحضر وخوش طبع وسلیم الفہم ومتصرف وبا امراو ملوک صحبت بسیار داشت'' (ان تمام علوم عقلیہ میں آپ کو کمال حاصل تھا جو ہندستان میں متعارف ہیں اور رؤسا اور بادشاہوں کے ساتھ عموماً آپ کا اٹھنا بیٹھنا تھا)۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری خدمات کی مشغولیت کی وجہ سے درس و تدریس میں زیادہ حصہ نہ لے سکے، مگر ان کے صاحبزادے ملا علاء الدین کا رنگ دوسرا تھا۔ملا عبدالقادر ہی نے لکھا ہے کہ اکبر نے:

''وہر چند کہ تکلیف سپاہی گری نمودند قبول نہ کردہ بدرس وافادہ مشغول شد'' (فوجی خدمت کے لیے بہت کچھ کہا مگر قبول نہیں کیا اور درس و تدریس میں برابر مشغول رہے)۔

چاہتے تو کوئی ہزار منصب فوج رکھنے کے صلے میں ان کو بھی مل جاتا، لیکن جو موروثی جاگیر والد سے ملی تھی اسی پر قناعت کر کے ساری عمر پڑھنے پڑھانے ہی میں گزار دی۔طلبہ کے ساتھ ان کا جو سلوک تھا، اور اسی کو مجھے پیش کرنا ہے۔ملا عبدالقادر نے لکھا ہے:

''دہر چہ از جاگیر حاصل می شد ہمہ صرف طلبہ بود'' (جو کچھ جاگیر سے حاصل ہوتا سب طلبہ پر خرچ کر ڈالتے) (ص ۱۵۶)۔

مولانا بحرالعلوم:

بانی مدرسہ نظامیہ ملا نظام الدین فرنگی محلی رحمۃ اللہ کے خلف رشید مولانا عبدالعلی المخاطب بہ

بحرالعلوم کے متعلق لکھا ہے کہ:

''منشی صدرالدین بہاری ویرا برائے تدریس مدرسہ خود کہ در بہار بنا کردہ بود خرچ معتد بہ فرستادہ طلبید'' (منشی صدرالدین بہاری نے اپنے مدرسہ میں درس دینے کے لیے ان کو کافی رقم بھیج کر طلب کیا)۔

جس وقت مولانا کو طلب کیا گیا ہے اس وقت سخت پریشانی میں مبتلا تھے۔ منشی صدرالدین نے چار سو ماہوار تنخواہ آپ کی اور آپ کے ایک فرنگی محلی عزیز مولوی اظہارالحق کی مقرر کی تھی لیکن مولانا نے لکھ کر بھیجا کہ میرے ساتھ طلبہ بھی ہوں گے جن کی تعداد سو سے کم نہ ہوگی۔ اگر ان کے قیام وطعام کا نظم کر سکتے ہو تو میں آ سکتا ہوں۔

''اغصان اربعہ'' جو فرنگی محل کے علما کی تاریخ ہے، اس میں لکھا ہے کہ منشی صدرالدین نے جب تک باضابطہ معاہدہ کی شکل میں ان طلبہ کے مصارف کی ذمہ داری اپنے سر نہ لی مولانا اپنی جگہ سے ہلے بھی نہیں حالانکہ ان دنوں سخت معاشی دشواریوں میں مبتلا تھے۔

مولانا عبدالحی فرنگی محلی:

مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

دس سال کی عمر ہوئی تو حفظ قرآن سے فارغ ہوگیا اور گیارہویں سال سے تحصیل علوم میں مشغول ہوا۔ رسمی فنون کی درسی کتابوں یعنی نحو، صرف، معانی، بیان، منطق، حکمت، (فلسفہ) طب، فقہ و اصول فقہ، علم کلام، حدیث، تفسیر وغیرہ علوم سے سترہویں سال کی عمر میں فارغ ہوگیا۔

قرأت عليه فی ثمان وثمانين شرح الچغمنی مع مواضع من حواشی البرجندی وامام الدين الرياضی ورسالة الاصطرلاب للطوسی وقدرا كثيرا من شرح التذكره للسيد وشرحها للخضری، وشرحها للبرجندی، وزيچ الغ بيك مع شرح البرجندی وغير ذالك.

(۱۲۸۸ء میں مولانا نعمت اللہ فرنگی سے بھی شرح چغمنی، برجندی اور امام الدین ریاضی کے حواشی کے ساتھ، میں نے پڑھی اور طوسی کے اسطرلاب کا رسالہ، میر کے تذکرہ کی شرح کا بھی ایک حصہ خضری و برجندی کی شرح کے ساتھ الغ ابیگ کی زیچ، برجندی کی شرح، یہ ساری کتابیں بھی مولانا سے پڑھیں)۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی:

یہ جوعوام میں اپنی کتاب ''مالا بدمنہ'' کی وجہ سے مشہور ہیں لیکن اہل علم قاضی صاحب کی علمی بلند پائیگی کوان کی تفسیر مظہری سے پہچانتے ہیں۔

قاضی صاحب کو جو وسعت نظر علم حدیث اور فقہ واصول فقہ وتصوف میں حاصل تھی حقیقت یہ ہے کہ ان کی تفسیر کے دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس جامعیت کے علما ہندستان میں کم ہی گذرے ہیں اور ہندستان ہی نہیں اگر مبالغہ نہ خیال کیا جائے تو قاضی صاحب کو بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علما کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ ان کو بیہقی وقت بلاوجہ نہیں کہتے تھے حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ سے قاضی صاحب نے اگر چہ ارشاد، اپنے پیر شیخ محمد عابد کے حکم سے، حاصل کیا تھا لیکن خود مرزا صاحب قاضی صاحب کو علم الہدیٰ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ تفسیر کے سوا قاضی صاحب نے ایک بڑی معرکۃ الآرا مبسوط کتاب فقہ میں لکھی ہے جو فقہ جامع کی ایک بہترین استدلالی کتاب ہے۔ اس میں ہر باب میں ائمہ اربعہ کے مسائل دلائل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ اس کتاب سے الگ کر کے آپ نے اخذ الاقویٰ کے نام سے ایک اور کتاب لکھی جس میں آپ نے ان مسائل کو جمع کیا ہے جو دلیل کے لحاظ سے آپ کے نزدیک قوی تر تھے۔ افسوس کہ ملک کی ناقدریوں نے اب تک ان کتابوں کی اشاعت کا موقع بھی بہم نہ پہنچایا۔ تفسیر مظہری متعدد بار چھپنی شروع ہوئی لیکن آج تک مکمل نہ ہوسکی حکومت آصفیہ سے ایک صاحب نے روپیہ بھی وصول کرلیا لیکن تفسیر چھاپ کر نہ دی۔ الحمدللہ کہ ندوۃ المصنفین دہلی نے تفسیر مظہری کا ترجمہ ۴ جلدوں میں شائع کر دیا۔

غلط عمر لکھوانا: مجبور جھوٹ:

حکومت نے یہ قانون بنا کر کہ سولہ سال کی عمر سے پہلے کوئی میٹرک پاس نہیں کرسکتا تھا اور چوبیس سال کی عمر کے بعد کسی کو سرکاری ملازمت میں نہیں لیا جاسکتا، اس عجیب وغریب قانون نے لوگوں کو جھوٹ بولنے اور بلوانے پر آج مجبور کر دیا ہے حالانکہ ان عجیب وغریب قیود کا مطلب آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا ہے۔ ایک لڑکے میں اگر میٹرک پاس کرنے کی صلاحیت سولہ سال سے پہلے پیدا ہوگئی ہے تو آپ اس زبردستی اس امتحان میں کامیاب ہونے سے کیوں روک رہے ہیں۔ ممکن ہے یوروپ کے سرد ملک میں لوگ دیر میں ہوش وحواس سنبھالتے ہوں لیکن ہندستان کی تاریخ آپ کو بتا رہی ہے کہ میٹرک تو علم کا ابتدائی دروازہ ہے، یہاں تیرہ چودہ سال کی عمر میں لوگ فارغ التحصیل ہوکر فیضی اور بحر العلوم بنتے

تھے۔ یہی حال ملازمت کا ہے۔ کارکردگی کی صلاحیت جس میں پائی جاتی ہو وہ ملازمت کا مستحق ہوسکتا ہے خواہ اس کی عمر کچھ بھی ہو، آج بھی یہی ہورہا ہے لیکن جھوٹ کے پردہ میں حقیقت کو چھپا کر بلاوجہ ایک اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہونے پر لوگوں کو مجبور کرنا اس زمانہ کا عجیب مذاق ہے۔

غیر ملکی زبانیں سیکھیے:

''بشوق آموختن زبان عبرانی بہ کلکتہ رفتہ در آنجا سالے چند پابند اقامت گشتہ از احبار زبان عبرانی آموخت'' (عبرانی زبان سیکھنے کے شوق میں کلکتہ تشریف لے گئے اور کئی سال رہ کر علما یہود سے عبرانی زبان سیکھی اور اچھی استعداد پیدا کی) (ص۱۵۲)۔

حبر و (عبرانی) زبان میں قاضی ثناء اللہ کو جو دست گاہ حاصل تھی اس کا اندازہ ان کی کتاب ''بشریٰ'' اور اس رسالہ سے ہوسکتا ہے، جو حضرت ہاجرہ ام اسماعیل علیہا السلام کے متعلق آپ نے عبرانی حوالوں سے مرتب فرمایا تھا، سرسید احمد خاں نے اپنی مشہور کتاب ''خطبات احمدیہ'' کا جزو بنا کر اسے شائع کیا ہے۔

جھجر کے نجف علی:

مولوی نجف علی جھجر کے رہنے والے، نواب ٹونک محمد علی خاں کے دربار کے مولوی تھے، لکھا ہے کہ ''پنجاہ رسائل بالسنہ خمسہ کہ دری و پاژندی و عربی و فارسی دارد و عبارت از آنست'' (تذکرہ علما ہند، ص۲۳۶)۔ جس کا یہی مطلب ہے کہ عربی، فارسی، اردو کے سوا دری اور پاژندی زبانوں کو بھی انھوں نے تحصیل علم کے بعد کسی پارسی عالم سے سیکھا تھا، حالانکہ خود عربی زبان میں ان کو اتنی قدرت حاصل تھی کہ:

''شرح مقامات حریری بہ زبان عربی بہ صنعت اہمال تصنیف کرد'' (مقامات حریری کی شرح عربی زبان میں اس طرح کی کہ کہیں نقطہ والا حرف نہیں لائے)۔

پوری حریری کی شرح غیر منقوط الفاظ میں کرنا آسان نہیں ہے۔ ان کے متعلق یہ بھی بیان کیا ہے کہ پارسیوں کی مذہبی کتاب ''دساتیر'' کی ایک شرح ''ویمزا'' نامی پاژندی زبان میں اور ''زبان سفرنگ'' دری زبان میں لکھی تھی۔

عہد اکبری:

معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ اور ریاضی میں یا تو خود ملا مبارک زیادہ مہارت نہیں رکھتے تھے یا ابوالفضل کو ان سے پڑھنے کا موقع نہ ملا تھا۔ خود ملا عبدالقادر نے اپنے متعلق بھی لکھا ہے کہ شاہ فتح اللہ

شیرازی کے بھتیجے میر تقی سے:

''فقیر پارہ از بست باب اصطرلاب پیش او گزرانید'' (خاکسار نے ایک حصہ بست باب اصطرلاب کا ان سے پڑھا تھا) (ج ۳،ص ۲۹۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ اطلبو العلم من المهد الی اللحد پر مسلمانوں کا عمل زبانی حد تک نہیں تھا، اور جب قوموں کے اقبال وعروج کا زمانہ ہوتا ہے تو ان میں یہی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ خود ان انگریزوں کا کیا حال تھا جو شروع شروع ہندستان آئے، ان میں کتنے تھے جو عربی وفارسی اور سنسکرت ہندستان کے مولویوں اور پنڈتوں سے سیکھے تھے۔

واقعہ زین العابدین بہاری:

اس زمانہ میں پڑھ لکھ لینے یا فارغ التحصیل ہونے کے بعد یہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اب کچھ نہیں سیکھا جا سکتا، جو کچھ پڑھنا تھا پڑھ چکے، بلکہ ایک طبقہ ہمیشہ ایسے لوگوں کا نظر آتا ہے، جس نے کہ ضرورت کے وقت نہ عمر کا خیال کیا، اور نہ وقت کا، ذہن بندی اور کام میں لگ گئے، حیدرآباد میں ایک اہل حدیث مولوی زین العابدین پندرہ سولہ سال ہوئے وظیفہ حسن خدمت لے کر آرہ اپنے وطن گئے اور چند سال بعد انتقال کر گئے۔ عجب مزاج کے آدمی تھے جو دھن بندھ گئی کر گذرتے تھے، خط پاکیزہ تھا کئی کئی جلدوں کی کتابیں نقل کر کے کتب خانہ آصفیہ میں داخل کیں، تہذیب التہذیب ابن حجر کی بارہ جلدوں میں مولانا کے ہاتھ کی کتب خانہ میں موجود ہے۔ وطن آرہ شاہ آباد بہار تھا، اسکول میں عربی کے معلم تھے، اپنا قصہ خود مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ علوم عربیہ کی تکمیل کے بعد طب پڑھ کر چھپرہ میں میں نے مطب شروع کیا، کسی مریض کے پاس گیا ہوا تھا، ایک ڈاکٹر بھی اس عرصہ میں بلایا گیا مجھے دیکھ کر میرے منہ پر اس نے تیمارداروں سے کہا کہ اس نے مرض کی کیا تشخیص کی ہے؛ جو میری تشخیص تھی میں نے بیان کی جس پر وہ ہنسا اور میری ناواقفیت کا اس نے مضحکہ اڑایا، مجھے اس کی یہ حرکت اتنی ناگوار گذری کہ مریض کے گھر سے مطب آیا، اسی وقت مطب کو بند کر کے میں نے کلکتہ کا ٹکٹ لیا، وہاں انگریزی شروع کی، انٹرنس پاس کیا، مقصود یہ تھا کہ اس کے بعد ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر کے اس ڈاکٹر کو جواب دوں گا، اب یہ محفوظ نہ رہا کہ ڈاکٹری بھی انھوں نے پڑھی یا نہیں، لیکن اسی جھونک میں انٹرنس تک انگریزی تو پڑھ ڈالی۔

پورے وثوق کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے اکابر اساتذہ سے ہی غالباً یہ بات بعد کو

تذکرہ رحمانیہ یعنی قاری عبدالرحمٰن محدث پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری میں بحمد للہ یہ الفاظ بھی مل گئے۔ایک دفعہ حضرت مولانا (محمد قاسم) حج بیت اللہ کو تشریف لے جارہے تھے، جہاز میں ماہ رمضان المبارک آ گیا، مولانا ممدوح نے قرآن مجید حفظ کرنا شروع کر دیا، دن میں بمقدار تراویح یاد کر کے رات کو سنا دیتے تھے) میرے کان میں پہنچی ہے کہ بانی دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اس وقت یاد کیا جب حج کے ارادہ سے آپ جہاز پر سوار ہوئے۔ مجھے ایسا خیال آتا ہے کہ جہاز ہی پر رمضان کا چاند دیکھا گیا تراویح کا مطالبہ ان لوگوں کی طرف سے ہوا جو اسی جہاز میں مولانا کے ہمسفر تھے، اتفاقاً ان میں کوئی حافظ نہ تھا۔آخر مولانا ہی تیار ہو گئے۔روزانہ ایک پارہ یاد کر کے رات کو تراویح میں سنا دیا کرتے تھے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، حدائق حنفیہ میں مولوی غلام محی الدین بگوی جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ان کے متعلق یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ان کے والد نے تراویح سننے کی ان سے خواہش کی، انھوں نے کہا کہ روزانہ ایک پارہ کا دور سن لیں تو سنا سکتا ہوں۔آخر یہی ہوا کہ روز ایک پارہ کا دور جو صرف چاشت کے وقت کرتے تھے اور رات کو وہی پارہ سنا دیتے تھے۔

معمر ہونے کے بعد قرآن کو یاد کرنے کا دستور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندستان میں شروع سے جاری رہا ہے اور سچ پوچھیے تو حفظ قرآن کے مسئلہ میں شاید سنت یہی عمل قرار پا سکتا ہے، آخر رسول اللہ ﷺ نے ظاہر ہے کہ چالیس سال کے بعد ہی قرآن یاد فرمایا، صحابہ میں بھی جو لوگ حافظ تھے کھلی ہوئی بات یہی ہے کہ اس کا موقع معمر ہونے کے بعد ہی ان کو ملا۔

بچوں کا حفظ قرآن:

بچپن میں قرآن یاد کرانے کا جو ذوق وشوق ہندی مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پایا جاتا ہے، اس کے لیے تو کسی تاریخی شہادت کی بھی حاجت نہیں، شاید ہی مسلمانوں کی کوئی معقول آبادی ہوگی جس میں آپ کو ایک دو آدمی پورے قرآن کے حافظ نہ مل جائیں۔پنجاب سے بنگال تک اور نیپال کی ترائی سے راس کماری تک جہاں کہیں مسلمان آباد ہیں، انشاء اللہ آپ کو یہ کیفیت نظر آئے گی، امیر وغریب متوسط حال، ہر طبقہ میں یہ حال عام ہے، دلی جب مسلمانوں کی دلی تھی اس وقت اس کا کیا حال ہوگا، اس کا اندازہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے ہوسکتا ہے۔ان کے ملفوظات میں ہے:

''شبے در جامع مسجد شمار کردہ بودم سی وپنج (۳۵) جا تراویح مع الجماعت حفاظ می خواندند'' (ایک رات میں جامع مسجد پہنچ کر شمار کیا تو دیکھا پینتیس جگہ حفاظ باجماعت تراویح پڑھ رہے ہیں)۔(ص ۴۷)۔

ظاہر ہے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب لال قلعہ کے باہر مسلمانوں کے بادشاہ کی بادشاہی باقی نہ تھی۔

چھتاری:

خود اس زمانہ میں ہندستان کی سب سے بڑی ریاست کے صدر اعظم عالی جناب نواب سر حافظ احمد سعید خاں بالقابہ حفظ قرآن کی دولت سرمدی سے سرفراز ہیں، التزاماً ہر سال تراویح بھی سناتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ جن دنوں آپ برطانوی حکومت کی طرف سے صوبجات متحدہ کے گورنر (حاکم اعلیٰ) تھے، اس زمانہ میں بھی گورنر ہاؤس (دارالحکومت) میں تراویح کے سلسلے کو آپ نے برابر جاری رکھا۔

شاہزادہ خلیل کا حفظ قرآن:

اس فہرست کو اپنی معلومات کے لحاظ سے اگر بڑھاؤں تو غالباً چند اوراق نذر کرنے پڑیں گے، وہی تاریخی مثال کم کیا ہے کہ سلطان محمد بیگڑہ جیسا باجروت وجلال بادشاہ جو گجرات کاٹھیاواڑ، کوکن خاندیش اور دکن کے ایک بڑے علاقہ کا مطلق العنان بادشاہ تھا، تاریخ گجرات میں اسی بادشاہ کے متعلق یہ واقعہ درج ہے کہ:

بیگڑہ:

''ایک روز رمضان میں حافظ قرآن کی بہت تعریف ہو رہی تھی، خود محمد بیگڑہ سلطان گجرات کہنے لگا افسوس ہماری اولاد میں کوئی حافظ ہوتا تو ہم کو بھی جنت ملتی۔ شاہزادہ خلیل نے سنا، یہ صاحب علم تھا، دل میں چوٹ لگی اسی روز سے خفیہ طور پر حفظ شروع کیا، آئندہ سال پہلی رمضان کو باپ سے کہا، حکم ہو تو میں نماز تراویح میں تمام قرآن مجید سناؤں۔ سلطان بہت خوش ہوا اور معقول انعام دیا۔ (مرآۃ محمدی، ص ۹۱)۔

علم سے علم الیقین تک:

مدرسہ سے خانقاہ:

قرآن کی پہلی نازل شدہ آیتوں میں قرأت (خواند تعلیم بالقلم (نوشت) کا ذکر کرنے کے بعد:

علم الانسان مالم یعلم (سکھائیں انسان کو وہ باتیں جنھیں وہ نہیں جانتا تھا)۔

کی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، لیکن اسی کے بعد ارشاد ہے:

کلا ان الانسان لیطغیٰ (خبردار بلاشبہ انسان سرکش ہو جاتا ہے)۔

''الانسان تعلیمی حقیقت ہے'' پھر ایک تنبیہی کلمہ ''کلا'' کے بعد فرمانا کہ ''الانسان سرکش

ہوجاتا ہے'' ظاہر ہے کہ محض کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ جو مشاہدہ ہے اسی کا اظہار ہے یعنی جانی ہوئی چیزوں کے جاننے کی جوں جوں آدمی کی صلاحیت بڑھتی جاتی ہے دیکھا جاتا ہے کہ اسی نسبت سے اس میں طغیان اور سرکشی کی لہریں بھی اٹھنے لگتی ہیں، وساوس وشکوک، تنقید واعتراض یہ قصے ظاہر ہے کہ جاہلوں اور کند دماغوں میں نہیں پیدا ہوتے، بلکہ یہ سارے عوارض علم کے ہیں، شاید یہ مبالغہ نہ ہو کہ دماغوں پر جتنا اچھا اثر جس تعلیم سے زیادہ پڑتا ہے اسی قدر اس تعلیم سے سرکشی اور طغیان کی تولید بھی زیادہ ہوتی ہے۔

اردو:

اختلاف زبان کی وجہ سے ان مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھ سکتے۔ اردو اکبر کے زمانہ میں، ہندستان کی مختلف بولیوں کی تقسیم ان کے مختلف مرکزوں کے اعتبار سے بایں الفاظ:

دلی، بنگالی، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹ، کرناٹک، سندھ، افغانستان، شان (کہ میان سندھ کابل وقندھار است)، بلوچستان، کشمیر۔

جن زبانوں میں اس قسم کا اختلاف ہے کہ ان کے بولنے والے ایک دوسرے کی نہیں سمجھ سکتے، ابوالفضل کے حساب سے عہد اکبری میں ان کی تیرہ قسمیں تھیں جن میں بارہ قسمیں ایک طرف اور دلی کی زبان ایک طرف، جس کا حاصل یہ ہوا کہ ان بارہ علاقوں کے سوا سارے ہندستان کی زبان اسی زمانہ سے ایک تھی، مقامی اختلافات سے اس زبان کی وحدت متاثر نہیں ہوتی تھی، آج کل اس کو ہم اردو کہتے ہیں جس کی صحیح تعبیر ''از فہمیدگی یک دگر بار ندارد'' ابوالفضل نے جو کی ہے بالکل صحیح ہے۔

تبلیغ گا بجا کر:

جیسے نقشبندیہ کا مرکز بخارا اور ترکستان، شاذلیہ کا مغرب اور تیونس، سہروردیہ کا بغداد، بدویہ کا مصر ہے اسی طرح چشتیہ طریقہ کو کچھ ہندستان کے ساتھ خصوصیت ہے۔ میں نے قادریہ کا ذکر اس سلسلہ میں قصداً اس لیے نہیں کیا کہ جہاں تک میرا خیال ہے طریقہ قادریہ کو کسی اسلامی ملک سے کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں اسلام ہے قادریہ طریقہ بھی وہاں اس کے ساتھ پہنچا ہے۔ یہ حضرت سیدنا شیخ ببلی رضی اللہ عنہ کی جلالت قدر کا اثر ہے کہ وہ سارے اسلامی ممالک پر حاوی ہیں۔

ذالك فضل الله يوتيه من يشاء، قدمی علی رقبه كل ولی کا شاید یہی مطلب ہو۔

یہاں عام باشندوں میں موسیقی سرود ونغمہ وغیرہ کا شدید میلان پایا جاتا تھا، باشندگان ملک میں رقاصی اور نغمہ نوازی کے اسی میلان کو دیکھ کر بزرگان چشت نے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے لیے یہ مناسب خیال کیا کہ ان کے اس مذاق سے نفع اٹھایا جائے اور یوں چشتی طریقہ میں اسی مصلحت سے گانے بجانے کو مروج کیا گیا۔

ہر قوم راست راہے:

دینے وقبلہ گاہے:

دنیا میں ایسا کون سا مذہب ہے جس کے پاس کوئی اخلاقی نظام نامہ نہیں ہے، کس مذہب میں جھوٹ، چوری، زنا، دغا بازی، فریب کی اجازت دی گئی ہے اور راست بازی، دیانت، امانت، پارسائی، پاک دامنی کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ حتی کہ خالص عبادتی چیزیں الصلوۃ، الزکوۃ، الصوم (روزہ) آپ کو قرآن ہی بتائے گا کہ قدیم سے قدیم دیانات وملل کے عناصر بھی یہی تھے۔ انتہا یہ ہے الحج، ماسوا اس کے کہ یہ ایک قدیمی ابراہیمی نسک ہے، یوں بھی جب اقوام کے قبلے، کسی زمانہ میں یعنی ان ہی دنوں میں جب ہر قوم کے لیے ان کا مخصوص قومی نبی ہوتا تھا، قبلے بھی قومی تھے تو اس کی تردید کیسے ہوسکتی ہے کہ عیسائی یا دیہودی پلگرمس اگر بیت المقدس میں جاتے تھے یا دنیا کی قومیں مختلف تیرتھ گاہوں کو جاتی تھی، ان کی کوئی اصل نہ تھی۔

میں نے اپنے دیوبندی اساتذہ سے جن کا نام صحیح طور پر اس وقت محفوظ نہ رہا، یہ بھی سنا ہے کہ دیوبند کے سابق صدر مدرس حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ یعنی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ امام جو اپنے کشفی بیانات میں جماعت دیوبند میں خاص امتیاز رکھتے تھے کبھی کبھی یہ فرماتے کہ ہردوار (ہر بمعنی خدا دوار = گھر یعنی بیت اللہ) میں ہر کی پیڑی کے نام سے جو مقام موسوم ہے مجھے اس میں ایک لاہوتی نسبت محسوس ہوتی ہے۔ الفاظ شاید کچھ اور ہوں لیکن معنی یہی تھے اور اس سے اس بات کی توثیق، کہ "لکل امة جعلنا نبیا" کا جب زمانہ تھا تو اس وقت بالکل ممکن ہے کہ اقوام کے قبلے جیسے مختلف تھے، جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے اسی طرح ان کے مناسک کے مقامات بھی مختلف ہوں، ولکل امة جعلنا منسکا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔

اسلام، جوڑنے والا:

رہا خالق کائنات اور اس کی توحید کا مسئلہ، سو قرآن سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ من خلق

السمـــوات والارض (کس نے آسمان وزمین پیدا کیے) کا سوال جس کسی سے بھی کیا جائے گا۔ لیـقـولـن اللـه وہ یہی کہیں گے اللہ، صرف خلق کی حد تک نہیں بلکہ تدبیر وتصرف کے کلی وجزئی اعمال بارش برسانا، روزی دینا ان ساری چیزوں کے متعلق بھی قرآن نے اعلان کیا ہے کہ یہ انسانی اعتقادات کے اجزاء عامہ ہیں، یوں ہی مجازات ومکافات کا قانون جس شکل میں بھی ہو لھا ما کسبت وعلیھا مـااکتسبت یعنی آدمی کو اپنے اچھے کاموں کا نفع بھی پہنچتا ہے اور برے کاموں کا ضرر بھی، ان ساری باتوں کی آپ ہی بتایئے کہ دنیا کی کون سی قابل ذکر قوم منکر ہے، جب سارے اخلاقی قوانین، عباداتی عناصر، عقائد کے اصول سارے جہاں کی قوموں میں مشترک ہیں، تو آپ ہی غور کیجئے کہ قوموں کے مقابلے میں آپ اسلام کا کیا امتیاز پیش کر سکتے ہیں؟ جزئیات نہ سہی کلیات میں تو سب آپ کے ساجھی اور شریک ہیں اور اس کا مخبر علاوہ واقعات کے خود قرآن ہے، اس کا تو دعویٰ ہی یہ ہے کہ مسلمانوں کو وہی دین دیا جا رہا ہے جو نوح کو ابراہیمؑ کو موسیٰ، عیسیٰ سب ہی کو دیا گیا تھا، قرآن میں وہی ہے جو صحف ابراہیم وموسیٰ میں تھا۔

(شیخ عبدالکریم جیلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الانسان الکامل'' میں لکھا ہے کہ ہندستان میں دو قسم کے لوگ ہیں عوام تو وثنیوں (بت پرستوں) کا گروہ ہے، لیکن وہاں کے خواص براہمہ، دین ابراہیمی کی یادگار ہیں)۔

بنی آدم کے سارے گھرانوں اور امتوں میں قرآن کے سوا قطعا کوئی دوسری کتاب (الہامی) ایسی باقی نہیں رہی ہے جو بغیر کسی کمی بیشی اور سر مو تفاوت کے ٹھیک اسی حال میں موجود ہو۔

اور، وہ نئی بات کا مدعی ہی کب ہے بلکہ جو کچھ ڈھونڈنا ہے دنیا کے تمام ارباب مذاہب کو ڈھونڈنا ہے، وہ یہی ہے کہ معمہ کائنات اور راز حیات کے جن بنیادی سوالات کے جوابات بیرونی آمیزشوں سے مشکوک ہو گئے ہیں اور ایسے مشکوک کہ اب خدا کی بات کو آدمی کی بات سے آپ کسی طرح جدا نہیں کر سکتے، ناخن کو گوشت سے چھڑا نہیں سکتے، قرآن ان ہی بنیادی امور کا قطعی واضح غیر مشتبہ علم ویقین آپ کو عطا کرے گا، گویا دوسرے لفظوں میں ہر مذہب اور دین والے قرآن میں کسی جدید دین کو نہیں بلکہ اپنے اپنے آبائی دین ہی کو بجائے مشکوک حالت کے یقینی شکل میں پانا چاہیں تو پا سکتے ہیں، یہودیوں کو حضرت موسیٰ کی، عیسائیوں کو حضرت عیسیٰ کی، ابراہیمیوں کو حضرت ابراہیم کی، نوحیوں کو حضرت نوح کی، ازیں قبیل ہر پیغمبر کی امت اپنے پیغمبروں کی تعلیم قرآن سے پا سکتی ہے اور

بچھڑنے کے بعد قرآن کے ذریعہ سے پھر اپنے اپنے پیغمبروں تک ہر امت واپس ہوسکتی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ قوموں کو ان کے پیشواؤں سے توڑنے کے لیے نہیں بلکہ جوڑنے کے لیے آئے تھے، اور مصدق لما معکم، اور "النبیین" کے خاتم کا حقیقی منصب ہے بھی یہی۔

سلطان المشائخ کا فرمودہ:

''اول درجہ کار علم است'' سیر الاولیاء، ص ۲۸۸، (اس کام میں پہلا درجہ علم کا ہے)۔

اور سلطان المشائخ کا یہ کوئی ذاتی خیال نہ تھا ان کے شیخ حضرت فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی اسلامی تصوف اور درویشی کی بنیاد علم ہی پر قائم تھی، سلطان جی ہی ان سے ناقل ہیں کہ:

''درویش را قدرے علم باید'' ص ۱۰۷، (راہ خدا کے درویش کو قدرے علم چاہیے)۔

ان کی مجلس مبارک میں سب سے آگے علما کی نشست ہوتی تھی اور اس کے بعد دوسرے لوگ بیٹھتے تھے۔ حضرت والا کی طرف سے آدابِ مجلس کے سلسلہ میں اس کا اعلان کر دیا گیا تھا، سیر الاولیاء میں ان ہی کی زبانی یہ فقرہ منقول ہے کہ:

''من نخواہم کہ شیخ مجعدے بالاتر متعمی بہ نشیند، من چہ کنم مرا از ایشاں مطلوبے دیگر است و ایشاں ہم چو پیاز پوست در پوست اند'' ص ۲۰۲، (میں نہیں چاہتا کہ کوئی کاکل والا کسی عمامہ والے سے اونچی جگہ بیٹھے۔ میں کیا کروں میں ان لوگوں سے کچھ اور مقصد رکھتا ہوں اور یہ لوگ پیاز کی طرح چھلکے پر چھلکے ہی ہیں)۔

حمید الدین ناگوری:

آپ کی بیوی صاحبہ کا ایک دلچسپ لطیفہ تاریخوں میں نقل کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ ناگور کے مقطع (صوبہ دار) نے شیخ سے چاہا کہ کچھ اس کی امداد قبول کریں، لیکن پذیرائی نہ ہوئی۔ اس نے بادشاہ غالباً نصیر الدین محمود یا التمش کو ان کے حالات لکھ بھیجے۔ دلی سے پانصد تنکہ نقرہ و فرمان یک دیہ صوبہ دار کے پاس آیا کہ فوراً شیخ کی خدمت میں حاضر کرو۔ صوبہ دار لے کر حاضر ہوا۔ آپ دیوان خانہ میں بیٹھے ہوئے تھے، صوبہ دار نے حال سنایا، کچھ نہ بولے، اندر زنانہ میں تشریف لے گئے۔ بیوی سے جا کر واقعہ کا ذکر کیا۔ اس وقت بیوی صاحبہ کی اوڑھنی پھٹی ہوئی تھی اور شیخ کی لنگی میں بھی پیوند تھے مگر سنتے ہو، اس حال میں بھی اسلام کی خاتون کا حال سنتے ہو، شیخ سن رہے تھے۔ اے خواجہ تو چہ می خواہی کہ فقر چندیں سالہ خود را باطل کنی، تو خاطر جمع دار من دو سیر ریسماں بدست خود رشتہ ام (دو سیر سوت کات لیا

ہے)ازاں مقصد ترا جامہ خواہد شد کہ ترا فو (لنگی) ومرادمن (اوڑھنی) مرتب خواہد شد (سیر،ص ۱۵۷)، ظاہر ہے کہ جس کی بیوی کا یہ حال ہو اس کا شوہر سلطان التارکین اگر ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔

مانڈو:

دلی کی مرکزی حکومت کی مرکزیت ٹوٹ کر چند حصوں میں جب تقسیم ہوگئی تو ان میں ایک مستحکم علم دوست دین پژدہ حکومت شادی آباد مانڈو کی بھی تھی، شادی آباد مانڈو کے بادشاہوں میں ایک مشہور بادشاہ محمود خلجی ہیں جنہوں نے مالوہ کے سوا:

''تمام ولایت بوندی و مارواڑ بزورِ شمشیر برگرفت (سیر المتاخرین، ص ۱۷۱)، (جنہوں نے بوندی اور مارواڑ کا تمام علاقہ قوت سے حاصل کیا)۔

اسی وجہ سے اجمیر، ناگور وغیرہ کے علاقے بھی اسی کے دائرۂ حکومت میں شریک ہو چکے تھے محمود خلجی کی عظمت وشوکت کا چرچا ہندستان سے باہر نکل کر دوسرے اسلامی ممالک کے مسلمانوں تک پہنچا ہوا تھا، ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے:

خواجہ جمال الدین استر آبادی از جانب سلطان ابوسعید مرزا بادشاہ ابوسعید مرزا کی طرف سے خواجہ جمال الدین نے قیمتی تحفے باگزیں ارمغان آورندلا کر پیش کیے۔

یعنی تیمور کے پوتے نے دربار مانڈو میں اپنی سفارت بھیجی تھی۔ ہندستان کی اس نئی طاقتور حکومت کا شہرہ سن کر حسب دستور مختلف بلاد وامصار سے لوگ شادی آبادی کی طرف کھنچے چلے آتے تھے، شاید پہلے بھی کہیں ذکر آیا ہے کہ علما اور صلحاء کو اپنے شہر میں لاکر بسانے اور اپنے ملک میں آباد کرنے کا محمود کو خاص شوق بھی تھا، مآثر رحیمی میں محمود خلجی (سلطان مالوہ) کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''چوں کہ سلطنت باوقار گرفت در تربیت علما وفضلاء کوشید ومدارس ساختہ'' (جب حکومت نے قوت حاصل کر لی تو شاہ نے علما اور فضلاء کی تربیت کی کوشش کی اور مدارس کھولے)۔

اس نے صرف یہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ:

''زر بہ اطراف واکناف عالم فرستادہ مستعداں را طلب داشت'' (دنیا کے دور دراز گوشوں میں روپے بھیج کر وہاں سے مستعد لوگوں کو بلایا)۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے اس عجیب وغریب ذوق وشغف کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی دنوں میں مولہ کے جنگلوں کے بیچ کا یہ شہر ''درزمان او یونانِ ثانی گشت'' (ص، ۳۵) (اس کے زمانہ میں

یونان ثانی بن گیا)۔

غیاث الدین:

غیاث الدین کا یہ حال تھا کہ اس نے محل کی عورتوں کو حکم دے رکھا تھا ''جہت نماز تہجد اورا بیدار کردہ می باشند وعندالاحتیاج آب بروئے اومی پاشیدہ باشند اگر درخواب گراں باشد بزور باز و جنبانند اگر بآں ہم بیدار نشود دستش گرفتہ برخیزانند'' (تہجد کی نماز کے لیے اس کو بیدار کریں اور بوقت ضرورت چہرہ پر پانی چھڑکیں، اگر گہری نیند میں ہوں تو بازو پکڑ کر زور سے ہلائیں اگر اس سے بھی نہ جاگوں تو ہاتھ پکڑ کر ان کو بٹھادیں۔ اور یہ ترکیب تو بادشاہ نے مادی نیند سے بیدار کرنے کی اختیار کی تھی۔ غفلت کے خواب سے چونکنے کے لیے اس نے اپنے درباریوں کو یہ عجیب حکم دے رکھا تھا، کہ جب: ''در وقت عشرت و مشغولی بسخنان دنیا ہر چہ کہ اسمِ کفن برونہادہ بودند بنظرش می آوردند تا تنبیہ عبرت گرفتہ از مجلس می برخواست وتجدید وضو کردہ باستغفار وتوبہ وانابت می پرداخت'' (دنیاوی باتوں میں مشغول اور راحت کے وقت میں وہ کفن جو رکھے ہوئے ہیں اس کے سامنے لائیں تاکہ تنبیہاً درس عبرت حاصل کر کے مجلس سے وہ اٹھے اور وضو کرے گناہوں کی معافی اور توجہ اور رجوع الی اللہ کا اہتمام کرے)۔

خواجہ اجمیریؒ کی قبر:

شیخ محدث نے اخبار الاخیار میں خواجہ بزرگ اجمیری کی قبر شریف کے متعلق یہ واقعہ درج کیا ہے: ''در اجمیر کہ موضع اقامت او بود مدفون گشت اول قبر خواجہ از خشت بود'' (اجمیر! جس جگہ آپ قیام پذیر تھے وہیں دفن ہوئے، خواجہ کی قبر پہلے اینٹ کی تھی)۔

غالباً ''خشت'' سے کچی اینٹیں ہی مراد ہیں، سلطان المشائخ رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ کبیر شکر گنج کے روضۂ طیبہ کے متعلق یہ مروی ہے کہ:

''بجہت لحد شیخ شیوخ العالم خشت خام حاجت شد، چوں موجود نمی شد در خانہ شیخ شیوخ العالم کہ بخشت خام برآوردہ بودند ازاں خشت فرو آورندتا در لحد خرچ شد طاب اللہ ثراہ'' سیر الاولیاء، ص ۹۱ (جب فراہم نہ ہوئی تو شیوخ العالم کے گھر میں جو کچی اینٹیں لگی ہوئی تھیں ان کو اکھاڑ لائے تاکہ لحد میں خرچ کی جائے)۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طریقہ چشتیہ کے معماران اولین کی قبروں میں کچی اینٹوں ہی کے لگانے کا رواج تھا، محدث دہلوی نے خواجہ بزرگ کے مزار مبارک کے متعلق یہ تاریخی بیان بھی دیا ہے

کہ جس زمانہ میں خواجہ حسین ناگوری نے جوار خواجہ میں قیام فرمایا، اس وقت:

''حوالی او بیشۂ شیراں گشتہ دوراں زماں بالائے قبر شریف عمارت نہ بود'' (اس کے اردگرد شیروں کی جھاڑی تھی اس زمانہ میں قبر کے اوپر کوئی عمارت نہ تھی)۔

یہ بھی لکھا ہے کہ اطراف میں کوئی خانقاہ وغیرہ بھی نہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد جو محدث دہلوی نے یہ لکھا ہے کہ:

''دروازہ خانقاہ بعضے از ملوک ہند ساختند'' ص ۲۳، (دروازہ اور خانقاہ شاہان ہند میں سے کسی نے بنایا)۔ بعضے ملوک ہند سے یہی غیاث الدین خلجی ہی مراد ہے، کیوں کہ غیاث الدین ہی کے عہد میں غالباً اپنے قیام اور واردین صادرین کے قیام کے لیے جیسے کہ شیخ محدث ہی نے لکھا ہے:

''اول کسے کہ در مقبرہ خواجہ عمارت کرد، خواجہ حسین ناگوری بود، ص ۲۳، (خواجہ حسین ناگوری پہلے شخص تھے جنہوں نے خواجہ اجمیری کا مقبرہ تعمیر کیا)۔

● سلطان المشائخ نے علما رسوم (علما ظاہر) اور صوفیہ میں فرق بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ دونوں ہی دراصل محمد رسول اللہ ﷺ کے اسی ''لا ریبی علم'' القرآن الحکیم اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کی دعوت دیتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ:

''ہر چہ علما بزبان دعوت کنند، مشائخ بہ عمل دعوت کنند'' سیر الاولیاء بحوالہ نوشتہ دست خاص سلطان المشائخ، ص ۳۲۱ (علما جس کی زبان سے دعوت دیتے ہیں مشائخ اپنے عمل سے اس کی طرف بلاتے ہیں)۔

مشائخ چشت بیعت لیتے ہوئے پہلا معاہدہ یہ لیتے تھے جیسا کہ سلطان المشائخ سے منقول ہے کہ:

''پیر اورا (مریدرا) تلقین کند دیدہ را نادیدہ کنی دشنیدہ را نا شنیدہ'' سیر الاولیاء، ص ۳۲۱ (پیر مرید کو تلقین کرتا ہے کہ دیکھے ہوئے کو نہ دیکھا ہوا اور سنے ہوئے کو نہ سنا ہو بنا دو)۔

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب:

فوائد الفواد میں تلاوت کے جن قاعدوں کا ذکر ہے ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مرتبہ اس کا یہ ہے:

''آنچہ می خواند معانی آں بر دل گذراند'' (جو کچھ پڑھیں اس کے معانی کا دل پر نزول ہو)۔

دوسرا مرتبہ اس کا یہ ہے کہ:

''در حالت قرآن خواندن، جلال وعظمتِ حق بر دل بگذراند'' (قرآن پڑھتے وقت حق تعالیٰ کی عظمت اور اس کے جلال کا دل پر نزول ہو)۔

اور تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ:

''وقت خواندن قرآن باید کہ دل خواننده را تعلق بحق باشد'' ص،۱۷ (قرآن پڑھتے وقت حال یہ ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کا دل حق تعالیٰ سے وابستہ ہو)۔

میر خورد نے لکھا ہے کہ سلطان المشائخ کا عام حکم قرآن خوانی کے متعلق یہ بھی تھا کہ:

''یک سیپارہ بہ سکونت حرفا بعد حرف خواندن بہتر از پانزدہ سیپارہ بسرعت خواندن ست'' (سکون کے ساتھ ایک پارہ پڑھنا پندرہ پارے تیز پڑھنے سے بہتر ہے)۔

خود آخر عمر تک جو اسّی سے متجاوز تھی، پوچھنے والے نے جب یہ پوچھا کہ:

''شما ہر روز چہ مقدار می خوانند فرمود یک سیپارہ'' (آپ ہر دن کس قدر تلاوت فرماتے ہیں فرمایا صرف ایک پارہ)۔

شکر وصبر:

''فقیر صابر بر غنی شاکر رجحان دارد'' (صبر کرنے والا محتاج، شکر گزار مالدار پر فوقیت رکھتا ہے)۔

دلیل میں شیخ کبیر نے جو بات پیش کی اسی سے اس کا سُراغ ملتا ہے کہ ان بزرگوں کے نزدیک قرآن فہمی اور قرآنی آیات پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہوتا تھا؟ سلطان المشائخ ہی راوی ہیں کہ شیخ کبیر نے دعوے کو پیش کر کے دلیل یہ بیان کی کہ:

''زیرا کہ غنی شاکر را بر شکر وعدہ چیست؟'' (اسلیے کہ شکر گزار مالدار کے لیے شکر پر کیا وعدہ ہے؟)

یعنی دیکھنا یہ چاہیے کہ تونگروں کو شکر پر خداوند تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں کسی چیز کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے بعد آیت:

ولئن شکرتم لازیدنکم (اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں بڑھاتا چلا جاؤں گا)۔

تلاوت فرمائی اور فرمایا کہ ''وعدہ مزید نعمت'' ہے لیکن:

''در صبر بشارت چیست؟ نعمت معیت'' (اور صبر میں کیسی بشارت ہے معیت حق کی نعمت کی)۔

اور ثبوت میں آیت قرآن:

ان اللہ مع الصابرین (یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

حاصل یہ ہوا کہ شکر میں تو وہی نعمتیں جو آدمی کو ملتی ہیں، ان ہی کے اضافہ کی بشارت قرآن میں دی گئی ہے۔ لیکن صبر میں تو نعمت ہی نہیں، صاحب نعمت کی رفاقت اور معیت کا مژدہ سنایا گیا ہے، شیخ کبیر نے اس کے بعد فرمایا:

''میانِ ایں مرتبہ وآں، ببیں آں فرق از کجا تا بہ کجاست'' (اس مرتبہ اور اس کے درمیان دیکھو کتنا فرق ہے)۔

جس وقت سلطان المشائخ شیخ کبیر کے اس قول کو بیان فرما رہے تھے، حضرت کے ممتاز مریدوں میں سے قاضی محی الدین کاشانی بھی موجود تھے، انہوں نے دریافت کیا کہ:

ھو معکم اینما کنتم (وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں تم ہو)۔

کی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ صابر و غیر صابر ہر ایک کو معیت حق حاصل ہے، پھر صبر کی خصوصیت کیا ہوئی، سلطان المشائخ نے فرمایا کہ صبر میں:

''معیت باعنایت است یعنی بحب و برضا'' (معیت حق عنایت کے ساتھ ہے یعنی محبت و خوشنودی کے ساتھ)۔

یعنی صرف ''معیت'' ذاتی یا علمی نہیں بلکہ محبوبیت کے ساتھ حق تعالیٰ کی یہ معیت صابر کو میسر آتی ہے، اور صابر کو محبوبیت کے اس مقام کا قرآن میں جتنی بار ان اللہ یحب الصابرین (پیار کرتا ہے قطعاً اللہ صبر کرنے والوں کو) دہرایا گیا ہے یا اسی قسم کی آیتوں سے قرآن کے پڑھنے والوں میں اس سے کون ناواقف ہے، نص محکم قطعی کے رو سے صابر محبوب الٰہی بن جاتا ہے۔

قرآن پر عمل کرنے کا کیا مطلب ہے، اس میں نہ زراعت کا طریقہ بتایا گیا ہے نہ صنعت کا، نہ حرفت کا، نہ تجارت کا، ان چیزوں کا اگر ذکر قرآن میں ہے بھی تو محض ضمنی طریقہ سے 'لفظ دو لفظ' کسی دوسرے مقصد کے ذیل میں، ان کا ذکر بھی آ گیا ہے، یہ تو ان اعمال کا حال ہوا جن کا تعلق دنیا سے ہے، اور دینی اعمال کی کیفیت تو آپ سن ہی چکے ہیں کہ قریب قریب ان میں اکثر کے عنوانوں کا ذکر ہے، تفصیل جیسی کہ چاہیے وہ ان کی بھی نہیں، اگر صرف قرآن ہی کو پیش نظر رکھ کر کوئی نماز کے اجزاء کو مرتب کرنا چاہے تو اس میں شک نہیں کہ قیام، رکوع، سجود یہ مختلف اجزاء تو قرآن میں مل جائیں گے لیکن ان میں کس جزء کو مقدم رکھا جائے کن کن کو مؤخر کیا جائے، قرآن سے اس کا فیصلہ کیا ممکن ہے؟ جب تک کہ پیغمبر کی زندگی سے ہم اس کو نہ سمجھیں۔

لیکن شیخ کبیر نے قرآن کی دو آیتوں "لئن شکرتم لازیدنکم" "ان اللہ مع الصابرین" کو جس طرح سمجھایا ہے، اور عمل سے ان دونوں کا جو تعلق دکھایا ہے، اگر آپ اس طرح قرآن کو پڑھنا شروع کریں اور اپنے دیدہ کو نادیدہ اپنے شنیدہ کو ناشنیدہ بنا کر قرآن سے پھر علم لینا شروع کر دیں یعنی آپ سارے دیدوں اور شنیدوں کو باہر نکال کر ان ہی قرآنی علوم کو اپنی فطرت کی گہرائیوں میں یقین واذعان کی بنیادوں پر جمانا شروع کر دیں، صبر کے ساتھ حق تعالیٰ کے جو مواعید ہیں، توکل پر جن ثمرات کی بشارتیں سنائی گئی ہیں، ذات حق کے ساتھ آپ کا تعلق تقویٰ کا جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے ثمرات وآثار قرآن نے جو بیان کیے ہیں اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر آپ قرآنی آیات کو سکون کے ساتھ حرفا بعد حرف پڑھنا شروع کیجئے تو یقین مانیے کہ ہر آیت آپ کو عمل کے لیے ایک نیا اور جدید علم دے گی۔ چشتیہ کی دوسری شاخ حمیدیہ جس کے متعلق گذر چکا کہ صدیوں تک مدارس کا درس طریقۂ سلوک کے ایک حزب کی حیثیت سے ان میں جاری تھا۔ اور یہ تھا اس زمانہ میں قرآن کی تلاوت کا طریقہ، جسے ہندستان میں بزرگان چشت نے جاری کیا تھا، ان ہی بزرگوں نے جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ڈھول سارنگی، ستار کے سوا اس ملک میں وہ اور کچھ نہیں لائے۔

فاتحہ:

فاتحہ یہ اس زمانے کا دستور تھا، کہ جب کوئی کسی کے لیے دعا کرتا تھا تو سورۂ فاتحہ پڑھ کر دعا کی جاتی تھی، اس بنیاد پر محاورہ ہو گیا تھا کہ کسی دوسرے سے جب کوئی دعا کی درخواست کرتا تو یہی کہتا کہ ''برائے من فاتحہ بخوانید''۔

شیخ کبیر حجرہ میں چلے گئے۔ سلطان المشائخ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ:

''در حجرہ سر برہنہ کردہ و بشرہ متغیر کردہ می گشت'' (حجرہ میں جا کر ننگے سر اور پریشان حال پھرنے لگے)۔ یعنی سر سے ٹوپی اتار کر شیخ کبیر حجرہ میں ٹہل رہے تھے، چہرہ متغیر تھا۔ فرماتے تھے کہ اسی خاص حال میں سن رہا تھا کہ ایک خاص کیفیت کے ساتھ شیخ کبیر کی زبان مبارک پر یہ اشعار جاری ہیں:

خواہم کہ ہمیشہ بہ وفائے تو زیم
خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود منِ خستہ ز کونینِ توئی
از بہرِ تو میرم ز برائے تو زیم

(میری تمنا ہے کہ ہمیشہ آپ کی وفاداری میں زندہ رہوں۔ مٹی ہوجاؤں اور آپ کے قدموں میں زندگی گزاروں مجھ بدحال کا مقصد دونوں جہاں میں آپ کی ذات ہے، آپ کے واسطے مروں اور آپ کے ہی لیے زندہ رہوں)۔

گویا آیت قرآنی: ان صلوٰتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین (میری نماز (عبادت) میری قربانیاں میری زندگی میری موت، اسی اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا پالنے والا ہے) کا ترجمہ ہورہا تھا۔ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے لیے دعا کی جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کی دعا کی اس وقت درخواست کی تھی فرمایا۔ (سلطان المشائخ کے خلیفۂ اعظم حضرت چراغ دہلوی کے حوالہ سے، شیخ کبیر کے مشہور وابستوں میں شیخ جمال الدین ہانسوی تھے۔ لا الہ الا اللہ پر استقامت ہی کا وہ نشہ تھا جو شیخ کبیر کی صحبت نے سلطان المشائخ میں بھرا تھا)۔ ''استقامت خواستم'' (میں نے اپنی مضبوطی کی خواہش کی تھی)۔

خانقاہ:

میں نے بھی مختلف مقامات پر شیخ کبیر اور سلطان المشائخ دونوں حضرات کی طرف خانقاہ کا انتساب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مشائخ چشت کی منجملہ اور خصوصیتوں کے ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اصطلاحی صوفیوں والی خانقاہ کا نظام ان کے یہاں نہ تھا، فوائد الفواد میں شیخ کبیر کا قول سلطان جی نے نقل کیا ہے ''پیرانِ ما رارسم خانقاہ نبود'' ص ۷۹۔ اس لیے جہاں جہاں میں نے خانقاہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے باضابطہ خانقاہ نہ سمجھا جائے ٹھیک جیسے اسی چشتی ملک ہندستان میں باضابطہ مدارس کم تھے۔

صوفیہ کے ملفوظات سے اس زمانہ یعنی ہندستانی اسلام کی پہلی صدی میں دلی اور دلی کی زندگی، طریقۂ بود و باش وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مثلاً سہ منزلہ مکانات بھی بن گئے تھے، چھپر کی مسجد بھی ہوتی تھی، مسلمان بھی بقالی، میوہ فروشی، گلاب فروشی وغیرہ کے پیشے اس زمانہ میں کرتے تھے، وغیرہ وغیرہ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنبول خوری کی عادت مسلمانوں کو ہندستان پہنچ کر ابتدائی صدیوں میں پڑ گئی تھی، اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج بھی پان کھاتے تھے (ص ۱۹۴) سلطان جی بھی عادی تھے، (ص ۴۲) بلکہ آپ نے پان کا نام ہی ابوالیاس رکھ دیا تھا، فرماتے تھے کہ پان کھانے کے بعد پھر کسی چیز کے کھانے کی امید باقی نہیں رہتی، نمک کا نام آپ کے دسترخوان پر ابوالفتح تھا، دستور تھا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے لوگ نمکدانوں سے ایک انگلی نمک پہلے ضرور چکھ لیتے تھے تب کھانا

شروع ہوتا تھا۔

لا اله الا انت سبحانك انی کنت من الظالمین (یعنی الٰہ آپ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا، آپ کی الوہیت میں کوئی دوسرا شریک ہو، اس سے آپ کی ذات پاک ہے، تو میں ہی ظالم تھا کہ جوالٰہ تھا اس کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھٹکتا رہا جوالٰہ نہ تھے)۔

''کہ در عہد غیاثی (غیاث الدین بلبن) کہ دراں وقت در دوجیتل منے خربزہ بود، لیکن بیش تر از فصل گذشتہ بود کہ من خربزہ نہ چشیدہ بودم'' (غیاث الدین بلبن کے عہد میں کہ جب دوجیتل (دمڑی) میں ایک من خربوزہ بکتا تھا مگر فصل کا بڑا حصہ گذر چکا تھا، اس میں میں نے خربوزہ چکھا بھی نہ تھا)۔

جیتل:

شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ کے حوالہ سے کسی جگہ میں نے جیتل کا ترجمہ دمڑی کیا ہے، اور دمڑی پیسہ کی چوتھائی کو کہتے ہیں، ایسی صورت میں اندازہ کرنا چاہیے کہ اس وقت چیزوں کا بھاؤ کیا تھا۔

''دراں ایام بہ یک جیتل دوسیر نان میدہ می دادند'' (ان دنوں میں ایک دمڑی میں دوسیر گیہوں کا میدہ بکتا تھا)۔

عہد اسلامی میں ہندستان نے کن ارزانیوں کا لطف اٹھایا ہے، میرے خیال میں اس سے بہتر شہادت کسی تاریخ میں نہیں مل سکتی ہے۔ شہادت ادا کرنے والے سلطان المشائخ ہیں۔ اور جس کتاب سے شہادت نقل کی گئی اس کے مصنف سلطان المشائخ کے مرید وہم زمانہ ہیں۔

امیر خسرو:

''امیر خسرو در ایام آغاز شعر گفتن، ہر نظمے کہ گفتے بخدمت سلطان المشائخ گذراند تا روزے حضرت سلطان المشائخ فرمود بہ طرز صفاہانیاں بگو'' (امیر خسرو شعر گوئی کے ابتدائی زمانے میں جو کچھ کہتے سلطان المشائخ کی خدمت میں پیش کرتے، یہاں تک کہ ایک روز حضرت نے فرمایا کہ صفاہانیوں کے طرز پر شعر کہو)۔

کہتے ہیں کہ اسی زمانہ میں امیر نے ایسی شاعری شروع کی جس میں حقیقت کا اظہار مجاز کے پردہ میں کیا گیا ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ امیر خسرو نے:

''دیوان مبتدا و منتہیٰ برابر قاضی معزالدین پائچہ پدر مولانا رفیع الدین پائچہ بخدمت سلطان المشائخ تمام گزرانید و رموز اشارات آن را تحقیق کرد'' ص ۳۰۱۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطان جی سے اگر

ہندستان کو اور کچھ نہ ملتا، صرف امیر خسرو ہی ملتے تو اس ملک کی سپاس گذاری اور منت شناسی کے لیے یہی کافی تھا۔

شیخ ابوسعید ابوالخیر کے متعلق اس مشہور قصہ کا ذکر فرماتے کہ اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کو جن سے بے تعلق ہو چکے تھے ایک دفعہ اٹھا کر چاہا کہ مطالعہ کریں، غیب سے آواز آئی:

''ابوسعید عہد نامہ بازدہ'' (ابوسعید عہد نامہ واپس کرو)۔

حضرت سلطان المشائخ اس قصہ کا ذکر فرماتے۔ علا سجزی راوی ہیں کہ:

''چوں بریں حرف رسید بگریست وایں دو مصرعہ برزبان مبارک راند:

تو سایۂ دشمنی کجا در گنجی، جائے کہ خیال دوست زحمت باشد'' (فوائد، ص۹۱) (جب اس حرف پر پہونچے رو پڑے اور یہ مصرعے زبان پر جاری ہو گئے)۔

یہ بھی اسی کتاب میں آپ کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت سیدؒ کا معمول تھا کہ:

وقت چاشت و بعد از نماز ظہر درس می گفت و بیش تر درس در علم تفسیر و حدیث و سلوک می گفت و گاہے علم کلام'' (ص۲۳) (چاشت کا وقت اور بعد نماز ظہر درس دیتے تھے اور عموماً علم تفسیر و حدیث اور تصوف کا دیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی علم کلام کا)۔

دکن میں تصوف:

مولانا غلام علی آزاد جن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دکن ہی میں گزرا ہے۔ حضرت گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دکن کے عوام (جن میں ہندو اور مسلمانوں کی خصوصیت نہیں ہے) نے ان کے عقیدت مندوں کا ذکر کرتے ہوئے عجیب باتیں نقل کی ہیں، ایک تو یہ کہ شخصے بہ یکے از اہل دکن پرسید کہ رسول اللہ بزرگ تر است یا سید محمد گیسو دراز، جواب داد کہ محمد رسول اللہ ﷺ اگرچہ پیغمبر خدا است اما سبحان اللہ مخدوم سید محمد گیسو دراز چیزے دیگر ست (ص۲۳)، دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ گلبرگہ کے نواح میں کوئی تالاب ہے ''از حضرت سید نقل کنند کہ فرمود، کسے کہ دریں تالاب غسل کند سعید می شود یعنی نیک بخت از گناہاں پاک می گردد'' بہر حال روایت جیسی کچھ ہو، لطیفہ نگار صاحب نے یہ درج کیا ہے کہ سعید کے لفظ کو بگاڑ کر، عوام سادہ لوح گویند کہ حضرت سید فرمود، کسے کہ دریں تالاب غسل می کند سید می شود، بہ نیت تحصیل سیادت غسلہا بجا آرند (ص۲۴)، اب بھی لوگوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے یا نہیں، مجھے معلوم نہیں۔ دکن میں عموماً ایک عجیب بات یہ پائی جاتی ہے کہ مسلمانوں کا ادنیٰ ترین طبقہ جس کا کام عموماً

خدمت گذاری کرنا جھٹکے ہنکانا ہے ان کی اکثریت سے جب پوچھیے تو اپنے نام کے ساتھ سید کے لفظ کا اضافہ کرتے ہیں، حالانکہ اعلیٰ طبقوں میں بہت زیادہ احتیاط پائی جاتی ہے، مشکل ہی سے ان میں کوئی اپنے کو سید کہتا ہو۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس طبقہ کی سیادت غالباً اسی تالاب کی کرامت کا نتیجہ ہے (میر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسن علا سجزی کو جو خلد آباد میں مدفون ہیں لوگ حسن شیر کہتے ہیں حالانکہ صحیح تلفظ اس کا حسن شاعر ہوگا)۔

مولانا زین الدین شیرازی:

''دو ماہ شد کہ ہر روز یک ختم کلام اللہ بہ روح پرفتوح سلطان المشائخ می کنم'' (دو ماہ ہوئے کہ روزانہ ایک قرآن ختم کا میں نے (حضرت) سلطان المشائخ کی روح کو ثواب بخشا)۔

حسن سجزی:

حضرت سید محمد حسینی گیسودراز نے ایک ہی نہیں بلکہ قرآن مجید کی دو دو تفسیریں لکھ کر اپنے اس خاندانی مذاق کا ثبوت پیش کیا ہے جو اکابر چشت سے منتقل ہو کر ان میں پیدا ہوا تھا، مولانا غلام علی آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''تصانیف حضرت سید ملتقط تفسیر قرآن بطور سلوک و تفسیرے دیگر بطریق کشاف پنج جزو (ص ۲۴) یعنی حضرت سید کی تصانیف قرآن کی تفسیر سلوک کے انداز میں اور پانچ جز تفسیرِ کشاف کے طرز پر ملتی ہیں۔

آٹھویں صدی کا نصاب تعلیم:

اپنی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد ہوا:

''درایام خوردگی چندیں کتابہا مارا یاد کرانیدند چنانکہ مصادر و مفتاح اللغات و جز آں کتابہا، مفتاح اللغات جزوے بستے خواہد بود مقدار یک جلد یاد کرانیدند و ہر بار یاد تمام می شنیدند'' (بچپنے میں بہت سی کتابیں یاد کرائیں جیسے مصادر و مفتاح اللغات اور ان کے علاوہ مفتاح کی ایک جلد یاد کرائی اور ہر مرتبہ پوری سنی)۔

اس سے کم از کم مجھے تو ہندستان کی آٹھویں صدی کے کتبی نصاب کے بعض اجزاء کا سراغ ملتا ہے، مصادر سے مراد غالباً کوئی اس قسم کی کتاب ہے جس کو مکاتب میں آج کل بھی ''آمد نامہ'' یا دکن میں جسے ''آمدن نامہ'' کہتے ہیں، صفوۃ المصادر یا ''مصدر فیوض'' وغیرہ مختلف ناموں سے لوگوں نے

فارسی کے مصادر ایک جگہ جمع کر دیے ہیں، بچوں کو ابتداء میں وہی کتاب یاد کرائی جاتی ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ آئندہ زندگی بھر بچپن کی یہ محنت لوگوں کو کام آتی ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں علاوہ مصادر کے لغت کی کوئی کتاب بھی زبانی یاد کراتے تھے، جس کا اب رواج باقی نہیں رہا ''ہر بار یاد تمام شنیدند'' آموختہ سننے کا قاعدہ تھا۔

منیری:

حضرت شاہ شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ جو عام طور پر مخدوم الملک کے نام سے کم از کم صوبۂ بہار میں مشہور ہیں، ان کی ابتدائی تعلیم سنارگاؤں (بنگال) میں ایک عالم علامہ شرف الدین توامہ سے ہوئی تھی، جو دلی سے بنگال بھیجے گئے تھے، کہتے ہیں جہاں پر آج ڈھاکہ شہر کی آبادی ہے، اسی کے قریب کسی جگہ یہ سنارگاؤں آباد تھا۔

عورتیں نماز باجماعت:

حسن علا سجزی راہ راست حضرت سلطان المشائخ سے راوی ہیں کہ ایک دن آپ نے اس مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے، یعنی امام کو جب نماز میں سہو ہو جائے تو یاد دلانے کا طریقہ: جیسا کہ فقہ کا مشہور مسئلہ یہ ہے کہ اگر مرد یاد دلانا چاہتا ہو تو چاہیے کہ وہ سبحان اللہ کہے، لیکن یاد دلانے والی اگر عورت ہو تو مسئلہ یہ ہے کہ بجائے زبان کے وہ تصفیق سے کام لے یعنی بجائے سبحان اللہ کہنے کے دستک سے کام لے، مگر فقہ کا مسئلہ یہ ہے کہ دستک کا جو عام طریقہ ہے وہ صورت اختیار نہ کرے، مطلب یہ ہے کہ کف دست بر کف دست نزند سلطان المشائخ نے اس امتناعی حکم کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آں بہ لہومی ماند یعنی ہتھیلی کو ہتھیلی کے ساتھ جوڑ کر پیٹنے میں ایک قسم کے کھیل اور لہو کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ بجائے اس کے ''پشت دست بر کف زند'' ایک ہاتھ کی پشت پر دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پٹکے، گویا اس شکل میں لہو اور کھیل تماشے والی تالیوں سے یہ صورت جدا ہو جاتی ہے۔

سماع میں تالی بجانے کی ممانعت:

میر حسن کا اس کے بعد بیان ہے کہ سلطان المشائخ نے اس فقہی مسئلہ کا ذکر کر کے فرمایا کہ:

''تا این غایت از ملاہی (کھیل تماشے) و امثال آں احتراز آمدہ ست''، پس دوسرے مشاغل سے پرہیز کا حکم آیا ہے پس سماع میں تو بدرجۂ اولیٰ یہ نہیں در سماع بطریق اولی کہ ازیں بابت نہ باشد، ہونا چاہیے۔

آگے اپنے مقصد مبارک کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

''یعنی در منع دستک چندیں احتیاط آمدہ است، در منع مزامیر بہ طریق اولے'' (اس قدر تالی پیٹنے سے احتیاط کا حکم آیا ہے تو باجہ وغیرہ کی ممانعت بدرجہ اولیٰ ہوگی)۔

مزامیر کی ممانعت:

ان ہی حسن علا سجزی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت والا سے کسی نے آکر عرض کیا کہ آج فلاں مجلس میں مزامیر کے ساتھ سماع سنا جا رہا تھا سننے کے ساتھ ہی حضرت کا چہرہ بدل گیا اور فرمانے لگے۔

''من منع کردہ ام کہ مزامیر و محرمات درمیان نہ باشد'' (میں نے روک دیا ہے کہ باجے وغیرہ اور ناجائز چیزیں نہ ہونے چاہئیں)۔

سلطان جی:

اس ملک میں اسلام جن بزرگوں کے ذریعہ سے پہلی دفعہ داخل ہوا، ان ہی میں سے ایک مسلم الثبوت ہستی، نظام الدین الاولیاء کے ملفوظات قلم بند ہو کر متواتر کی شکل اختیار کر لی، کہ آج اسی کے ذریعہ سے بیسیویں غلط فہمیوں کے متعلق جو اصل واقعہ ہے، اس کا سراغ لگانا ہمارے لیے آسان ہو گیا اور مزامیر کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ اس کے متعلق صرف حسن علاء سجزی ہی کی یہ روایتیں نہیں ہیں، بلکہ میر خورد جن کی کتاب ظاہر ہے کہ اعتماد و وثوق میں فوائد الفواد کی ہم رتبہ نہیں ہے بلکہ بعض خاص حالات کے تحت اس کی بعض چیزیں محل غور و تامل ہیں۔

میر خورد:

میر صاحب کے متعلق یہ عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ سادات کے ایک شریف گھرانے کے صاحب علم بزرگ ہیں، میں بتا چکا ہوں کہ حضرت سلطان المشائخ سے براہ راست شرف بیعت بھی ان کو حاصل ہے، اور حضرت کی خانقاہ کے متصل ہی ان کے والد کا مکان تھا، تعلیم بھی ان کی سلطان جی کے خلفاء سے ہوئی ہے، خود لکھتے ہیں کہ نعمت دیدار و مشاہدہ آں بزرگوار (سلطان المشائخ) بھی ان کو مسلسل حاصل ہوتی رہی اور ذوق مجلس ارادت و مساس دست مبارک سلطان المشائخ سے سرفراز ہوتے رہتے تھے (ص ۳۵۹)، اسی لیے میں ان کے بیان کو عام تذکروں کے بیان سے خصوصا سلطان جی اور ان کے خلفاء کے متعلق ایک ایسا تاریخی بیان قرار دیتا ہوں جس کا مقابلہ دوسری تاریخی کتابوں سے مشکل ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ حضرت والا کی بیعت ان کو

ایسے زمانہ میں حاصل ہوئی کہ بقول خود ''درک معانی دراں ایام چنداں نہ بود'' ص ۳۵۹۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت والا کی وفات پر خود ہی لکھتے ہیں کہ معاملہ نفس کہ دشمن دینی ست برحسب مطلوب آنحضرت (سلطان المشائخ) نہ بود اور اس کی وجہ بیچارے نے خود ہی لکھ دی ہے کہ یہ جو کچھ ہوا، از غلبۂ جوانی چنانکہ افتد و دانی مزاحم شد'' ص ۳۶۳، یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سلطان جی کو خواب میں جو دیکھا تو میں قدموں کی طرف بڑھا لیکن ''کسانیکہ بودند مانع ایں دولت می شدند'' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حضرت والا کا وہ پختہ چشتی گہرا رنگ نہیں چڑھا تھا جو سلطان جی کے خلفاء اور مریدوں کی خاص شان ہے اسی لیے بعض مواقع میں ان کی تعبیریں حدود احتیاط سے متجاوز نظر آتی ہیں، کچھ ان میں ایک رنگ تعصب کا بھی ہے، یعنی حضرت بابا فرید شکر گنج کے دوسرے خلفاء خصوصا سلسلہ صابریہ کے شیخ حضرت علی صابر صاحب کلیر شریف کا ذکر کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ گویا ان کو بابا صاحب کے یہاں چنداں اہمیت حاصل نہ تھی۔ اگرچہ الفاظ یہ بھی لکھے ہیں ''شیخ علی صابر درویشے قدمے ثابت و نفسے گیر داشت ساکن قصبہ ڈیگری بودے و پیوند بخدمت شیخ شیوخ العالم داشت اور از حضرت شیخ شیوخ العالم اجازت بیعت بود'' یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کبیر سے شیخ علی صابر نے کچھ چاہا تو فرمایا: ''بوگا گاہی کرد'' بھوگا کا ترجمہ کیا ہے ''عیشے خوش خواہد گشت'' مگر شیخ کا جو مقام ہے اس لحاظ سے اتنے الفاظ ناکافی خیال کیے جاتے ہیں شیخ محدث بھی متنبہ ہوئے ہیں، لکھا ہے کہ یہ طرز تحریر ''خالی از غرابت نیست'' بلکہ ان کو یہ شبہ ہے کہ کسی دوسرے علی صابر کا تو یہ تذکرہ نہیں ہے۔ (الاخیار، ص ۶۹)۔

لیکن باوجود اس کے سماع و شرائط سماع کے متعلق حضرت سلطان المشائخ کے مسلک کو ان الفاظ میں درج کرتے ہوئے کہ:

''چندیں چیزے می باید کہ تا سماع مباح شود مستمع مسموع اسماع'' (اتنی چیزیں ہونی چاہئیں کہ سماعِ مباح سنانے والا کون ہے، سننے والے کیسے لوگ ہیں، جو چیز سنائی جارہی ہے وہ کیا ہے، کن آلات سے سماع ہورہا ہے)۔

پھر ہر ہر جزو کی خود تفصیل کرتے ہیں۔ ''مسمع'' سنانے والے کی شرط یہ ہے کہ ''کودک نہ باشد، عورت نہ باشد، مستمع'' یعنی سننے والوں کے متعلق یہ شرط ہے ''از یادِ حق خالی نہ باشد۔ ''مسموع'' ۔ جو چیز سنائی جائے اس کی شرط یہ ہے کہ ''فحش و مسخرگی نہ باشد''۔ سنانے والے کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ نابالغ نہ ہو عورت نہ ہو اور سننے والوں کے لیے شرط یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے خالی نہ ہو اور جو چیز سنائی

جائے اس کے لیے شرط یہ کہ فحش اور مضحکہ خیز نہ ہو۔

آخر میں ''آلہ سماع'' کے متعلق لکھتے ہیں:۔

''آلۂ سماع مزامیر است چوں چنگ ورباب ومثل آں می باید کہ درمیان نہ باشد'' ص۴۹۲

(آلۂ سماع باجے ہیں جیسے چنگ ورباب اوراس کے مثل دوسری چیزیں نہ ہونی چاہئیں۔

میر خورد ہی نے حضرت سلطان المشائخ سے نقل کیا ہے کہ گانا سننے والوں کا:

''اگر میل بکلی طرف مجاز است آں حرام است'' (رجحان اگر صرف مجاز کی طرف ہے تو وہ حرام ہے)۔

یعنی مزامیر ہوں یا نہ ہوں، لیکن جن لوگوں کے قلوب مادی حسن و جمال سے مالوف ہیں، ان کے لیے ہر قسم کا گانا سننا حرام ہے۔ یہ سلطان جی کا فتویٰ ہے۔ لوگ ''فرعون'' سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ اس سے زیادہ ضرورت ہے کہ ''فرعونیت'' سے نجات پانے کی کوشش کی جائے۔

حسن علا سجزی نے سلطان المشائخ کی زبانی نقل کیا ہے کہ: ''مردم را ہمہ روز حضور کجا میسر است اگر روزے وقتے خوش وقت دریافت ہمہ اوقات متفرقہ آں روز پناہ آں وقت باشد''۔ لوگوں کو ہر دن حضور کہاں میسر آتا ہے اگر کسی دن کوئی اچھا وقت آ گیا تو تمام متفرقہ اوقات اس دن اس وقت کی پناہ میں رہے۔

آپ کا ضرور خیال تھا کہ جو لوگ اس طریقہ سے بھی اشعار سننے کو حرام سمجھتے ہیں، تو ان لوگوں کو بھی اس پر اتنا اصرار نہ کرنا چاہیے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ:

''خود نشنو دا ما با دیگراں خصومت نہ کند'' فوائد، ص ۲۲۸ (خود نہ سنیں مگر دوسروں کے ساتھ جھگڑا بھی نہ نکالیں)۔

سلطان المشائخ سے مرید ہونے والے:

آپ اس کے ساتھ علاء الدین خلجی کے اس مشہور فقرہ کو ملائیے جس کے ناقل بہت سے لوگ ہیں۔ یعنی سلطان المشائخ کی دن دونی مقبولیت کو دیکھ کر گو دوسروں کے اشارے سے سہی لیکن اس کو خطرہ ہوا کہ سلطان المشائخ کی موجودہ مقبولیت عامہ روزے از روز ہا کوئی سیاسی کروٹ نہ لے علاء الدین کے یہ الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔

''مقربان لوازم وجوانب تخت من وسائر خلق بندہ ومرید او (سلطان المشائخ) شدہ اند، حیلہ باید انگیخت تا از ضمیر او چیزے ازاں روشن شود'' (سیر الاولیاء، ص ۱۳۳)۔ علاء الدین نے اس کے لیے جو حیلہ کیا مجھے اس سے بحث نہیں ہے، بلکہ بتانا یہ ہے کہ عہد علائی کے اکثر امراء وملوک وعمائد سلطان

المشائخ کے مرید ہو گئے تھے، حتیٰ کہ خود علاء الدین کا ولی عہد خضر خاں جسے دیول رانی کے قصہ کی وجہ سے امیر خسرو نے ذکر دوام کی سند دے دی ہے، وہ بھی حضرت کے خاص مریدوں میں تھا، میر خورد اسی زمانہ کے آدمی ہیں، ان کی بھی یہی شہادت ہے:

''خلقے از علما و مشائخ و امراء ملوک مرید آں حضرت گشتند'' (علما و مشائخ اور امراء و ملوک میں بہت سارے آپ کے مرید ہو گئے)۔

بہر حال اتنا تو سب ہی کو مسلّم ہے کہ عہد علائی وہ زمانہ ہے جس میں حق تعالیٰ کی طرف سے سلطان المشائخ کے حسنِ قبول کا آفتاب سمت الراس پر پہنچ چکا تھا، مسلمانوں کا عام رجحان ان ہی کی طرف تھا، ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا پیشہ فوجی خدمت ہی تھا، حضرت والا کے دونوں مشہور شاعر مرید امیر خسرو اور امیر حسن علاء ان دونوں بزرگوں کو بھی ہم مختلف فوجی مہموں میں شریک پاتے ہیں۔

''می بینم مسلمانے بعجز و اضطراب و مسکنت و بیچارگی بر من می آید و می گوید کہ از جملہ گناہاں تو بہ می کنم من بہ نیت آں کہ شاید سخن او راست باشد دست بیعت می دہم'' (ص ۳۴۷)، (میں دیکھتا ہوں کہ ایک مسلمان عاجزی اور بے چینی اور بے چارگی کے ساتھ میرے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، میں اس خیال سے کہ یہ اپنی بات میں سچا ہو بیعت کر لیتا ہوں)۔

پیری مریدی کا مقصد:

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان بزرگوں کی اصلی غرض عام پیری مریدی سے کیا تھی؟ ہاں! جن کی ساری عمر اسی سوز و ساز، درد و تپش میں گزری کہ جس طرح بھی ممکن ہو، پیغمبر کی امت کو پیغمبر کے قدموں تک پہنچا دیا جائے۔ سلطان المشائخ عموماً فرمایا کرتے کہ ہمارے طریق کی پہلی شرط یہ ہے کہ:

''طلب جاہ و کرامت نباشد''۔

ایک ناجائز، جائز صورت کے متعلق الفاظ مبارک یہ ہیں:

''جائز خلاف نشستن جوگیان است، کہ ہر دو قدم زیر ہر دو زانو باشد'' (ص ۴۴۴) (جائز طریقہ یہ ہے کہ جوگیوں کی نشست کے خلاف ہو اس طرح کہ دونوں قدم دونوں زانو کے نیچے ہوں)۔

ظاہر ہے کہ اٹھنے بیٹھنے کا معاملہ چنداں اہمیت نہیں رکھتا، اسی لیے جواز و عدم جواز کے الفاظ کو اولیٰ اور خلاف اولیٰ ہی پر محمول کیا جائے گا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جن بزرگوں کا حال یہ ہو کہ معمولی بات یعنی بیٹھنے کی ہیئت تک کے متعلق بھی ان کا خیال تھا کہ جوگیہ کی چونکہ وہ نشست ہے اس لیے

مسلمانوں کو یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، انہی بزرگوں کے متعلق یہ کہنا کہ انہوں نے اپنا سارا طریقہ جوگیہ یا اشراقیہ کو دیکھ کر مرتب کیا ہے، کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے۔

پابوسی:

قال صهيب رأيت عليا يقبل يدا لعباس ورجله (ص ٣٤٠) (حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ وہ حضرت عباسؓ کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیتے تھے)۔

یعنی حضرت علیؓ اپنے چچا عباسؓ کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ پاؤں کو بھی احتراماً چومتے تھے، اب آپ خود غور کیجئے اس سے کیا ثابت ہوا، صرف یہی نا کہ پاؤں چومنے کے وقت چومنے والے کا سر چونکہ بالکل زمین سے قریب جاتا ہے، اس لیے ثابت ہوا کہ پاؤں چومنے کی وجہ سے اگر سر کسی کے سامنے اتنا جھک جائے کہ پاؤں سے اور زمین جس پر پاؤں عموماً رکھے رہتے ہیں، قریب ہوجائے، تو صہیب کی اس روایت سے اتنے جھکاؤ کا جواز نکلتا ہے، مقصد یہ ہے کہ پائے بوسی کی وجہ سے سر میں اتنا جھکاؤ جو پیدا ہوجاتا ہے کہ قریب قریب سر زمین ہی پر چلا جاتا ہے، اس لیے ایک صورت سجدے کی سی پیدا ہوجاتی ہے اس لیے چاہیے تو یہی تھا کہ جب غیر اللہ کے سجدہ کو اسلام میں حرام کر دیا گیا ہے، پائے بوسی بھی جس میں سجدے کی سی شکل پیدا ہوجاتی ہے، ناجائز ہوجاتی ہے لیکن جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے پائے بوسی کا ثبوت ملتا ہے تو پائے بوسی کے جواز کی ایک صورت نکل آتی ہے۔

''در پیش من کہ روئے بر زمین می آورند من کارہ ام'' ص ۲۴۱، (میرے آگے جو اپنا سر جھکاتے ہیں میں اسے پسند نہیں کرتا)۔

اور وہ چاہتے تھے کہ قدم بوسی جس کی وجہ سے خواہ مخواہ لوگوں کے سر زمین کی طرف چلے جاتے ہیں ایک گونہ سجدے کی شکل پیدا ہوجاتی ہے، اس کو منع کر دیں لیکن ان کا بیان ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ بھی قدم بوسی سے لوگوں کو منع نہیں فرماتے تھے، اس لیے منع کرنے کی ہمت نہیں پڑتی، عجب جملہ لکھا ہے کہ:

''از دو چیز یکے لازم آید یا تجہیل مشائخ یا تفسیق ایشاں'' (دو چیزوں میں سے ایک لازم آتا ہے، مشائخ کو جاہل ثابت کرنا یا ان کی تفسیق کرنا)۔

یعنی یہ سمجھا جائے کہ شیخ کبیر اس حکم ہی سے ناواقف تھے کہ قدم بوسی جائز نہیں ہے، یا عدم

جواز کے علم کے باوجود شریعت کے حکم کی خلاف ورزی العیاذ باللہ کرتے تھے، جو ظاہر ہے کہ فسق ہے، اس کے علاوہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، حضرت علیؓ کے اس اثر سے بھی ان کو گونہ مدد مل گئی تھی، یہی وجہ ہے کہ باوجود ''کارہ'' ہونے کے لوگوں کو انہوں نے اس فعل سے منع نہیں کیا۔

حتی کہ اسی جھکاؤ کی وجہ سے فقہا نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلام کرنے کے وقت آدمی کو بالکل سیدھا رہنا چاہیے، بدن یا سر میں کسی قسم کا جھکاؤ نہ پیدا کرنا چاہیے، عالم گیری میں ہے۔ حدیث میں اس کے بعد ہے کہ:

فقبلا یدیه ورجلیه وقالا نشهد انك نبی (پس ان دونوں یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ کے دونوں ہاتھوں اور پائے مبارک کو بوسہ دیا اور بولے کہ ہم اس کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ نبی ہیں)۔

آگے اور باتیں ہیں مجھے تو یہ کہنا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ والا اثر معلوم نہیں کس کتاب میں ہے لیکن یہ حدیث تو صحاح ستہ کی مشہور حدیثوں میں ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی قدم بوسی ان یہودیوں نے کی۔

تا آنکہ بات حکومت تک پہنچی خود غیاث الدین تغلق کو اپنے شاہی دربار میں مجلس مناظرہ منعقد کرانی پڑی، دونوں طرف کے علما جمع ہوکے، وہ ہنگامہ برپا ہوا کہ آج چھ سو سال گذر جانے کے بعد بھی تاریخ میں اس مجلس مناظرہ کا شور غوغا گونج رہا ہے، حالانکہ جو کچھ بھی ہو ''سماع وہ بھی بغیر مزامیر والا، کیوں کہ گذر چکا ہے کہ مزامیر کو تو خود سلطان المشائخ محرمات میں شمار فرماتے تھے، اس غیر مزامیری سماع کا مسئلہ اتنا اہم تو نہیں تھا، جتنا کہ سجدہ والا مسئلہ، سجدہ کا حال کہ غیر اللہ کے سامنے بہ نیت عبادت تو کفر ہے، شرک ہے، میں نہیں سمجھتا کہ اسلام کے کسی فرقہ کو بھی اس کے کفر وشرک ہونے میں اختلاف ہوگا، رہ گیا وہ سجدہ جس میں ساجد اپنی عبدیت اور بندگی اور فقر وتذلل کو نہیں، بلکہ جسے سجدہ کیا جائے یعنی مسجود لہ کے احترام اور عظمت کا اظہار اپنے سجدوں سے کرنا چاہتا ہو، وہی جسے عموماً سجدۂ تعظیمی کہتے ہیں، چونکہ کسی دوسرے کی عظمت یا فضل کا اعتراف جو سجدۂ تعظیمی کی روح ہوتی ہے، یہ ناجائز نہیں ہے اس لیے بظاہر اس سجدہ میں وہ خرابی جو سجدۂ عبادت میں پائی جاتی ہے نہیں پائی جاتی ہے۔

سجدۂ تعظیمی:

اسی لیے فقہائے اسلام تعظیمی سجدہ جو غیر اللہ کو کیا جائے اس کو کفر وشرک تو نہیں قرار دیتے،

لیکن چونکہ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خود اپنے لیے بھی صحابہ کو سجدہ کی اجازت نہیں دی، تو ظاہر ہے کہ اور کسی کو کیسے اس کی اجازت ہوسکتی ہے خود قرآنی آیت: واسجدو لله ان کنتم ایاه تعبدون۔ (اللہ ہی کو سجدہ کرو اگر تم اللہ ہی کی عبادت کرتے ہو)۔ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے، اسے چاہیے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرے، بہر حال ان ہی وجوہ سے سجدۂ تعظیمی، فقہاء کا فیصلہ یہ ہے کہ، غیر اللہ کے لئے وہ بھی جائز نہیں ہے، عالم گیری میں تو لکھا ہے۔

لا یکفر ولکن باثم لارتکا به الکبیرة وهو المختار، ص ۳٦۹، (غیر اللہ کو تعظیمی سجدہ کرنے والوں کی تکفیر تو نہیں کی جائے گی لیکن گنہگار ٹھہرایا جائے گا اس لیے کہ کبیرہ کا ارتکاب کیا)۔

جس سے معلوم ہوا کہ مذہب مختار فقہاء کا یہی ہے کہ سجدۂ تعظیمی کفر تو نہیں ہے لیکن کبیرہ گناہ ہے۔

یہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ العیاذ باللہ اگر فی الحقیقت سلطان المشائخ اپنے مریدوں سے سجدہ کراتے تھے، خواہ تعظیمی ہی سہی، تو فقہ کی کتابوں میں جسے ''کبیرہ'' قرار دیا گیا ہے یہ اس الزام ان پر کیوں لگاتے۔ اسی قسم میں سماع کا مسئلہ جو اتنا تو سخت نہ تھا، جتنا کہ سجدہ کا مسئلہ۔ سماع میں تو بہت کچھ گفتگو ہوسکتی تھی، دیگر ائمہ کے سوا غیر مزامیری سماع کی حد تک تو فقہ حنفی میں بھی گنجائش پیدا ہوسکتی تھی، بخاری اور مسلم کی حدیثوں سے اس قسم کے سماع کا جواز پیدا کیا جاسکتا تھا۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت صحابہ کا رجز پڑھنا، اور آنحضرت ﷺ کا بھی ساتھ دینا ''ابینا ابینا'' کے لفظ کو ذرا بلند آواز کے ساتھ ادا فرمانا انجشہ والی روایت، جواری مغنیات کی روایت، عبداللہ بن رواحہ سے ''ھات من ھنیا'' تک وغیرہ، بیسیوں صحیح آثار اس کے ثبوت میں پیش ہوسکتے تھے۔ (حتی کہ مشہور عالم حدیث جو اپنی سخت گیری و ظاہریت میں شہرت عام رکھتے ہیں یعنی علامہ ابن حزم جیسی ہستی مزامیری و غیر مزامیری ہر قسم کے غناء کی اباحت و جواز کے مدعی ہیں)۔ لیکن سجدہ کے جواز کی کیا صورت تھی ان کو گرفت کرنی تھی، تو سب سے آسان بات تو یہی تھی خدانخواستہ اگر واقعی ان کے سامنے لوگ سجدے کرتے تھے تو سلطان المشائخ کے پاس اس کے جواز کی کیا سند ہوتی، نہ کوئی قرآنی آیت، نہ حدیث، نہ فقہ، میرے نزدیک یہ خود دلیل ہے کہ وہ سجدہ ہی نہ تھا بلکہ وہی قدم بوسی کی شکل تھی، جس میں الحناء مفرط کا پیدا ہونا لازمی ہے، آپ فوائد الفواد اٹھا کر پڑھیے میر حسن علا سجزی عموماً یہی لکھتے ہیں:

''سعادت پائے بوس بدست آمد''، ''بہ سعادت پائے بوس رسید''، ''سعادت پائے بوس

حاصل شد۔ دولت پائے بوس حاصل آمدہ''۔

میں نے یونہی کتاب کھولی اور صفحہ ۱۵۴، صفحہ ۱۵۵، ۱۵۶ سب ہی جگہ یہی الفاظ نظر آئے، اگر یہ لوگ سجدہ کرتے تھے تو پھر وہی لکھتے، ہوسکتا ہے کہ اسی کیفیت کی تعبیر کبھی انھوں نے ''سر برزمین آورد'' وغیرہ الفاظ سے کی ہو، گو مجھے خیال نہیں ہے لیکن اس کا مطلب بھی وہی ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے۔ مجھے تو حضرت والا کے دوستوں اور دشمنوں دونوں سے شکایت ہے، دوست تو اس کے درپے ہیں کہ عیاذ باللہ ان کو تفسیق کا سامان مہیا کریں اور دشمن شاید تجہیل کے درپے ہوں۔

پہلے کسی موقع پر ذکر کیا جاچکا ہے کہ سجدہ تحیۃ کا رواج بادشاہوں کے سامنے بھی ہندستان میں اکبر سے پہلے نہ تھا، اور شاہجہاں کے عہد میں اس کا انسداد ہوگیا جیسا کہ تمام تاریخوں میں لکھا ہے، پھر جب سجدہ تحیت کا رواج بادشاہوں میں بھی نہ تھا تو فقراء میں کیا ہوتا۔ لوگوں کو اکبری عہد کے سجدۂ تحیت سے مغالطہ ہوا کہ شاید یہ سجدہ بادشاہوں کے سامنے ہندستان میں پہلے سے چلا آتا تھا اور ان ہی کی دیکھا دیکھی جیسے ''شاہ'' کا لفظ صوفیوں نے اپنے متعلق استعمال کیا اس سجدہ کو بھی اپنے سامنے کرانے لگے۔

غریبوں کا تعلق خانقاہوں سے:

اور صوبوں کا حال معلوم نہیں لیکن بہار میں شادیوں میں رواج ''کندوری'' کا ہے۔ لوگ عموماً اس کو ہندوؤں سے ماخوذ کوئی رواج سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ترکی لفظ ہے معنی دسترخوان: جو کھانا برادری کو کھلایا جاتا ہے اس کو کندوری کہتے ہیں۔

کھانا شروع ہوگیا، اس وقت سلطان المشائخ ایک قصہ کسی بزرگ کا ان الفاظ میں بیان فرمانے لگے:

''بزرگے گفتہ است کہ خلق پیش من طعام می خورند من آں طعام را در خلق خود یابم یعنی گوئی آن طعام من می خورم'' (ص ۷۷) (ایک بزرگ نے کہا ہے کہ مخلوق میرے سامنے کھانا کھاتی ہے، میں اس کھانے کو اپنے حلق میں پاتا ہوں یعنی تم کہہ لو کہ کھانا میں ہی کھاتا ہوں)۔

آج جن میزوں پر ایوانِ نعمت کے لقموں کے ساتھ غریبوں کا دکھڑا رویا جاتا ہے گویا یہ بھی ایک قسم کا حدیث المائدہ (ٹیبل ٹاک) اور ہضم کرنے کا چورن ہے، ان کو کیا معلوم کہ اسلامی تاریخ میں غریبوں اور امیروں کے درمیان صوفیائے اسلام کی یہ خانقاہیں درمیانی کڑی کا کام دیتی تھیں، ان بزرگوں کا دربار وہ دربار تھا جہاں سلاطین بھی خراج داخل کرتے تھے، خود سلطان المشائخ کا کیا حال تھا:

''ہزار من میدہ و پانصد من مسلوخ گوشت و سہ صد من شکر خرچ شیخ بود کہ در لنگر بکاری رفت''
ص ۲۷۰، (شیخ کے لنگر خانہ میں ہر روز ہزار من میدہ پانچ سو من گوشت تین سو من شکر خرچ ہوتی تھی)۔

اگر من سے یہی چالیس سیر والا ہندستانی من مراد ہے اور غالباً وہی مراد ہے بھی، کہ اور جہاں کہیں بھی من کا لفظ اس زمانہ کی کتابوں میں استعمال کیا گیا ہے اس سے وہی ہندستانی من مقصود ہے، سوچنے کی بات ہے کہ ایسی صورت میں ہزار ہزار من آٹے کی روٹیوں اور پانچ پانچ سو من گوشت کے روزانہ کھانے والوں کی تعداد کیا ہوگی اور واقعہ تو یہ ہے کہ بجائے خود یہ اس اولوالعزمی کی دلیل ہے جو اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر پائی جاتی تھی۔ اللہ اللہ ہم آج جس چیز کو سوچ بھی نہیں سکتے، حکومت نہیں بلکہ مسلمانوں کے عام افراد انجام دیتے تھے آخر روزانہ اتنی بڑی مقدار میں کھانا پکوانا اور کھلانا بغیر کسی معمولی سلیقہ و نظم کے، ممکن ہے؟ لیکن قومیں جب زندہ ہوتی ہیں تو ان پر ایسی باتیں بلکہ ان سے بھی عجیب تر باتیں آسان تر ہو جاتی ہیں۔ اور جب مردنی چھا جاتی ہے تو دو آدمی کے کھانے پینے کا انتظام بھی دشوار ہو جاتا ہے۔

سیدی مولہ ان تصرفات کے باوجود خود سادہ لباس رکھتے تھے، ایک سوتی چادر ایک لنگی، کھانے میں چاول کی روٹی کسی ترکاری کے ساتھ جس میں گوشت وغیرہ کچھ نہ ہوتا، مجاہدہ اور ریاضت کے سختی کے ساتھ پابند تھے۔ ان کی نہ بیوی تھی نہ کوئی غلام خدمت کرنے والا، لوگوں سے نذر و فتوحات بھی نہیں لیتے تھے پھر یہ خرچ کہاں سے مہیا ہوتا تھا۔

''شبے بہ لباس ناشناس در خانقاہ او رفتہ تصرف او را آنچہ شنیدہ بود زیادہ یافت''۔ (ایک رات اجنبی لباس میں ان کی خانقاہ میں حاضر ہوا تھا اور جو کچھ سن رکھا تھا اس سے زیادہ خرچ دیکھا)۔

اکبر کے ابتدائی عہد میں شیخ فخر الدین نامی ایک بزرگ تھے، ملا عبدالقادر ہی نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سماع کے بعد دستور تھا کہ:

''سفرہ (دسترخوان) می کشیدند و شاہ و درویش گرد او برابر بود'' (دسترخوان بچھتا اور بادشاہ و فقیر اس پر برابر ہوتے تھے)۔

جس دن سیدی مولہ شہید کیے گئے، سخت آندھی آئی، طوفان کا سماں قائم ہو گیا، شیخ محدث کا تو بیان ہے کہ گویا قیامت برپا شد، عالم تاریک گشت، بداؤنی کا بیان ہے کہ قحطے چناں واقع شد کہ ہندواں از غایت گرسنگی و جماعہ دستہائے یک دیگر را گرفتہ خود را در آب جون انداختہ طعمہ نہنگ فنا می

شدند، ومسلمانان نیز بآتش گرسنگی سوختہ غریق بحر عدم بودند' عام خیال یہی تھا کہ شیخ مولہ کے خون ناحق کا یہ اثر ہے، لیکن بقول عبدالقادر ''بریں طور چیز ہا مدار ہم نہ تواں نہاد کہ شاید از جملہ اتفاقیات باشد''۔

انتہا عمومیت کی یہ تھی کہ بیرم خان خاناں جو اسی زمانہ میں وزیر ہی نہیں بلکہ مدار کل اور حقیقی معنوں میں وہی حکمراں تھا، لکھا ہے کہ:

''بیرم خان نماز جمعہ اکثر در مسجد ادا می کرد و تناول طعام و سائر آداب مجلس ہیچ امتیاز از سائر الناس نداشت (ج ۳، ص ۸) (بیرم خانخاناں عموماً جمعہ کی نماز ان کی مسجد میں ادا کرتے اور کھانا کھانے اور آداب مجلس میں عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں برتتے تھے)۔

غربت وامارت کا یہ سنگم یعنی صوفیہ صافیہ کا یہ طبقہ جہاں امراء وغرباء دونوں ایک حیثیت سے حاضر ہوتے تھے، اس نظم سے غریب حاجت مند مسلمانوں کی کتنی حاجت روائیاں ہوتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی عہد کا کوئی زمانہ، اور ان دنوں ہندستان کا شاید ہی کوئی صوبہ کوئی علاقہ، ایسا ہوگا جہاں: توخذ من اغنیائھم وتقسم علی فقرائھم (امیروں سے ان کے، لیا جائے، اور غریبوں پر بانٹ دیا جائے) کے نبوی فرمان کی تعمیل میں ارباب صدق وصفا کا یہ طبقہ مشغول نہ تھا خصوصاً جن بزرگوں کو کسی خاص وجہ سے امراء اور ارباب ثروت پر اثر قائم ہوجاتا تھا یوں سمجھیے کہ غربا کی قسمت جاگ اٹھتی تھی)۔

شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ:

گیارہویں صدی کے اواخر اور بارہویں کے آغاز میں ایک مشہور ہستی حضرت شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ کی تھی جن کا اصلی نام سید محمد سعید تھا، لیکن عوام میں آپ کا یہ عرفی ہی نام مشہور ہوگیا اور اب تک اسی نام سے یاد کیے جاتے ہیں، ہمارے مخدوم ومکرم جناب مولوی غلام بھیک نیرنگ صاحب وکیل انبالہ کا نام انتساب آپ ہی کے اسم گرامی کی طرف ہے۔

یہ شاہ بھیک قدس سرہٗ حضرت شاہ ابوالمعالی (انبیٹھا) ضلع سہارن پور کے ارشد خلفاء میں ہیں، بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جب معزالدین جہاندار شاہ دلی کے تخت پر قابض ہوگیا، تو اس زمانہ کا ایک امیر ظفر خاں حضرت سے مشورہ گیر ہوا کہ جہاندار شاہ کے مقابلہ میں فرخ سیر جو اٹھ کھڑا ہوا ہے، میں کس کا ساتھ دوں، آپ نے فرخ سیر کی رفاقت کا مشورہ دیا، وہ اپنی فوج کے ساتھ فرخ سیر سے جا ملا، جیسا کہ معلوم ہے قسمت نے دلی کے تخت کا فیصلہ فرخ سیر کے لیے کیا، ظفر خاں کی بن آئی اور نواب

روشن الدولہ ظفر خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے، سہ ہزاری کا منصب بخشی گیری کا عہدہ فرخ سیر کی طرف سے ان کو عطا ہوا۔ چونکہ یہ کامیابی حضرت والا کے مشورہ کی راہ سے روشن الدولہ کو حاصل ہوئی تھی، قدرتاً وہ شاہ بھیک صاحب کے انتہائی عقیدت کیشوں میں تھا اور نواب روشن الدولہ کی وجہ سے فرخ سیر خود، اس کے دربار کے امراء حضرت کے معتقدوں میں شریک ہو گئے۔ ان کے تذکرہ میں جس کا نام ''ثمرۃ الفوائد'' ہے اور ان کے براہ راست مرید مولوی محمد لطف اللہ مرحوم کی تصنیف ہے اس کتاب میں حضرت شاہ بھیک کے داد و دہش کے قصوں کی ایک طویل فہرست درج ہے، مولوی لطف اللہ نے لکھا ہے، حضرت کی خانقاہ میں ذاکرین و شاغلین کی تعداد ''پانصد کس در اوائل حال بدائرہ (خانقاہ) شریف بیاد الٰہی مشغول می بودند'' (شروع شروع میں پانچ سو آدمی خانقاہ میں یاد الٰہی میں مشغول رہتے تھے)۔

ان کے سوا ہمیں مجمع صادر و وارد ہر روز تین ہزار فی کس بودہ باشد (ص ۱۷۲) دونوں وقت انسانوں کی اتنی بڑی تعداد کو حضرت کی خانقاہ سے جانا پہچانا جاتا تھا۔

روشن الدولہ کی ستر ہزار رقم اور شاہ کا رویہ:

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ روشن الدولہ خود حضرت والا کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ حضرت کی خانقاہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائے، اپنے ساتھ مبلغ ہفتاد ہزار روپیہ بجہت روضہ شریف آوردہ، اور عرض گزار ہوا کہ ''ایں قدر زر را ہمراہ آوردہ انچہ دیگر مطلوب خواہد باشد طلبیدہ می شود''

شاہ بھیک نے روشن الدولہ سے یہ سن کر فرمایا کہ:

بالفعل مبلغ را یک جا جمع دارند شما آرام کنید بوقت سہ پہر تہیہ آں نمودہ معماراں را طلبیدہ شروع عمارت کردہ خواہد شد'' (ابھی نقد یکجا رکھیں آپ آرام کریں سہ پہر میں سامان کر کے اور معماروں کو بلا کر تعمیر کا کام شروع کیا جائے گا)۔

روشن الدولہ ستر ہزار کی ان تھیلیوں کو حضرت کے پاس چھوڑ کر اپنی بارگاہ کی طرف آرام کے لیے چلا گیا، ادھر شاہ بھیک صاحب نے ''درویشاں را طلبیدہ زر مذکور خانہ بخانہ بیوہ، زنان و محتاجان و مسکینیان ساکنان انبالہ و تھانیسر و سرہند و پانی پت وغیرہ تقسیم نمودند کہ یک حبہ باقی نگذاشتند (ص ۱۱۹) (درویشوں کو بلا کر ساری نقدی گھر گھر بیواؤں اور محتاجوں اور مسکینوں اور انبالہ و تھانیسر سرہند و پانی پت وغیرہ کے باشندوں میں تقسیم کر دیا اور ایک حبہ بھی باقی نہ چھوڑا)۔

روشن الدولہ بیچارہ سہ پہر کے وقت حاضر ہوتا ہے اور آپ فرماتے ہیں: ''بناء خانقاہ را چہ قبولیت شدہ کہ بچندیں گوشہ نشیناں محتاجاں رسیدہ، ما فقیر را عمارت عالی چہ کار ست'' (خانقاہ کی بنا ایسی مقبول ہوئی کہ بہت سے گوشہ نشینوں اور محتاجوں تک یہ رقم پہنچ گئی، میں فقیر آدمی ہوں مجھ کو ایسی بڑی عمارت کی کیا ضرورت ہے)۔

روشن الدولہ نے یہ سن کر عرض کیا: ''بسیار مستحسن و بجا شد خزانہ دیگر ہم موجود است'' (بہت بہتر، اور خوب ہوا، دوسرا خزانہ موجود ہے)۔

تین لاکھ کی رقم اور اس کا مصرف:

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ: ''روزے قاصد مرسلہ بادشاہ محمد فرخ سیر و نواب روشن الدولہ و نواب عبداللہ خاں مع عرائض و ہنڈیات مبلغ سہ لک روپیہ رسید'' (بادشاہ فرخ سیر و نواب روشن الدولہ نواب عبداللہ خاں کی طرف سے قاصد مع دستاویزات اور تین لاکھ کی نقدی کے ساتھ پہنچا)۔

شاہ صاحب کو خبر ہوئی، ارشاد ہوا کہ حسب استحقاق لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ''بموجب امر عالی قصبہ پانی پت رام پور کرنال و انبیٹھ و گنگوہ وغیرہ قسمت نمودہ'' (ص ۱۱۹) (حضرت کے حکم کے مطابق پانی پت، اور رام پور، کرنال، انبیٹھ اور گنگوہ وغیرہ میں تقسیم کر دیا گیا)۔

اسی میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ بھیک کا ''معمول چناں بود کہ در سفر و حضر نصف لیل دروازہ بازی ماند و سائلے کہ می آمد محروم نمی رفت، از نقد و جنس و طعام و پارچہ ہر چہ میسر و موجود بودے انعام می فرمودے''۔ ص ۱۱۸ (سفر و حضر میں آپ کا معمول تھا کہ آدھی رات تک دروازہ کھلا رکھتے اور جو سائل آتا تھا اسے محروم نہیں جانے دیتے تھے، نقد، غلہ، کھانا، کپڑا جو کچھ بھی موجود ہوتا اسے عطا فرماتے)۔

اس کتاب میں آپ کے داد و دہش اور عام بذل و کرم کے جو قصے درج ہیں، اگر ان کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل مضمون بن سکتا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی بیوہ عورتوں کی لڑکیوں کی شادیاں حضرت نے کرائیں، کتنوں کو ان امیروں کے پاس نوکریاں دلوائیں۔ کتنے مظلوموں کو ظالم حکام کے پنجوں سے اپنے اثر سے کام لے کر آپ نے خلاصی دلوائی۔

مجدد الف ثانی کے پوتے کا حال:

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ کسی ایک شخص کا حال نہ تھا ان بزرگوں کے دیگر مشاغل و

مکاسب میں ایک اہم چیز یہ بھی تھی، ان ہی دنوں میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کے پوتے شیخ سیف الدین بن عروۃ الوثقی شیخ محمد معصوم رحمۃ اللہ تھے، جن کا قیام عموماً دلی میں رہتا تھا، لکھا ہے کہ:

''محمد اورنگ زیب و شاہزادگان و امراء را بخدمت ایشاں ارادتے پیدا شد، در امر معروف ونہی عن المنکر کوشش بلیغ می داشتند'' (محمد اورنگ زیب شاہزادوں اور امراء کو آپ سے عقیدت پیدا ہوگئی تھی اور یہ سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بہت کوشش فرماتے تھے)۔

لیکن امراء کی ارادت سے جو نفع اٹھایا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ:

یک ہزار و چہار صد کس را موافق رغبت و فرمایش ہر یک از خانقاہ ایشاں ہر روز دو وقت طعام عنایت می شد'' (مناقب العارفین) (ایک ہزار چار سو اشخاص کو ان کی خواہش کے مطابق روزانہ دونوں وقت کھانا دیا جاتا تھا)۔

ہر شخص کی رغبت اور فرمایش کے مطابق ہزار ہزار چودہ چودہ سو آدمیوں کو روزانہ کھانا کھلانا کوئی معمولی بات ہے، لیکن وہ بیٹھے اسی لیے تھے کہ منجملہ دیگر مہمات کے ایک مہم ان غریبوں تک روزی پہنچانے میں ذریعہ بننا بھی تھا۔

شاہ بولن کا دسترخوان:

ایک دلچسپ کہیے یا دل دوز واقعہ اسی سلسلہ کا یہ ہے کہ تیرہویں صدی کے ایک بزرگ جن کا عرفی اور مشہور نام شاہ بولن تھا، سہوارہ کے رہنے والے تھے، صاحب مناقب العارفین جو ان کے دیکھنے والوں میں ہیں انھوں نے لکھا ہے:

''در خانقاہ خود وارد و صادر اطعام سفرہ عام بود چہ دشمن و چہ دوست در یغ نمی داشتند'' (اپنی خانقاہ میں تمام آنے جانے والوں کو کھانا دیتے گویا حضرت کا لنگر خانہ عام دسترخوان تھا جس پر دوست و دشمن کی تمیز نہ تھی سب کے لیے عام تھا)۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں غدر کا فتنہ، ہندستان میں شروع ہوا لیکن اس زمانہ میں بھی شاہ بولن کا لنگر خانہ جاری رہا اسی کتاب میں ہے:

''در ایام غدر ہندی در لنگر خانہ دے حضرت دوست و دشمن می آمدند و طعام می خوردند و می رفتند'' (زمانہ غدر میں آپ کے لنگر خانہ میں دوست و دشمن آتے تھے اور کھانا کھاتے اور چلے جاتے تھے)۔

انگریزی حکومت اور اس کے ارباب حل وعقد اسلامی فقراء کہ اس طرز عمل سے واقف نہ

تھے، ان تک یہ خبر پہنچی کہ شاہ بولن نامی فقیر سرکار کے باغیوں کو کھانا کھلاتا ہے، حالانکہ ان بے چارے کو کیا خبر کون باغی ہے اور کون غیر باغی، بقول صاحب مناقب:

''وے حضرت با کسے حاجتے وکارے نداشتند'' (آپ کسی شخص سے کوئی کام یا ضرورت نہیں رکھتے تھے)۔

لیکن حکومت کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ امیروں سے لے کر مفت غریبوں میں کھانا بلا وجہ تقسیم کرنے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے، شاہ صاحب پر بھی بغاوت کا مقدمہ قائم ہوا اور ''بجرم آں کہ دشمنانِ حاکم رامدارات می کردند وطعام میدادند، باعث گرفتاری ورسانیدن وے حضرت در جزیرہ مذکورہ (انڈمان) شدہ بود۔ (مناقب ص ۵۴۷) (اسی جرم میں کہ حکومت کے دشمنوں کی مدارات کرتے اور انھیں کھانا دیتے ہیں گرفتار کیے گئے اور جزیرہ انڈمان میں مقید کردیے گئے)۔

زندگی کا آخری حصہ عبور دریائے شور کی اسی سزا کی وجہ سے انڈمان ہی میں گذرا اور ''در جزیرہ انڈمان مدفون گشتند'' (جزیرہ انڈمان میں دفن ہوئے)۔

شیخ عزیز اللہ کی داد و دہش:

صوفیہ کرام میں عبادت کے اس طریقہ کو یعنی ''برآوردن کار امیدوار'' کو جو اہمیت حاصل تھی یہ کسی خاص بزرگ کے ساتھ مخصوص نہ تھی، آپ کو ان بزرگوں کے حالات میں بکثرت اس کی مثالیں ملیں گی، ان کا امراء وسلاطین پر جو اثر تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشکل ہی سے ان کی سفارش رد ہوسکتی تھی۔ شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار رؤسائے طریق میں ہے، حلب کا بادشاہ الملک الظاہر بامر اللہ حضرت کے عقیدت مندوں میں تھا، فتوحات میں ایک موقع پر شیخ نے لکھا ہے:

"لقد كلمت الملك الظاهر بامر الله صاحب حلب وثمانية عشر حاجة للناس ولو كان عندى فى ذالك اليوم اكثر من ذلك فقضاه يطيب النفس، (ج ۳، ص ۹۷) (میں نے حلب کے بادشاہ ملک الظاہر بامر اللہ سے مختلف امور کے متعلق سفارش کی بادشاہ نے میرے کہنے سے ایک سو اٹھارہ حاجتیں لوگوں کی ایک دن میں پوری کیں، اور اس وقت اگر میرے پاس کچھ اور ضرورتیں ہوتیں تو اسے بھی بخوشی وہ پوری کرتا)۔

''گویا شکستے دراعتکاف واقع نہ شد'' (گویا سمجھتے تھے کہ ان کے اعتکاف کا تسلسل اس سے نہیں ٹوٹتا تھا) کی اتباع میں ان کو جو لذت ملتی تھی، دردنا آشنا قلوب اس کی حلاوتوں کو محسوس کرسکتے ہیں۔

ملا صاحب نے لکھا ہے کہ: ''ایں عبادت متعدی را تقدم بر عبادت لازم نہادے''۔

ان کا خیال تھا کہ کسی غریب آدمی کی حاجت براری کا کام چونکہ ایسی عبادت ہے جس سے دوسروں کو نفع پہنچتا ہے، یعنی متعدی، اس لیے لازمی عبادت پر جس کے منافع صرف اپنی ذات کی حد تک محدود رہتے ہیں اس کو ترجیح حاصل ہے۔ اسی لیے سفارش کو چلہ کشی کی عبادت سے مقدم خیال کرتے تھے۔

غریبوں سے ہمدردی:

ذرا ان بزرگوں کی نگاہ کی بلندیوں کو دیکھئے صرف یہی نہیں کہ اعتکاف اور چلہ کو توڑ دیتے تھے بلکہ ملا صاحب کا جیسا کہ بیان ہے کسی قسم کا آدمی ہو دین سے بیگانہ ہی کیوں نہ ہو، فاسق ہو، فاجر ہو، لیکن غریب مسلمان کا کام نکلتا ہے، اس لیے ان کو ایسوں کے پاس جانے میں بھی عذر نہیں ہوتا تھا، کل کیا دن تھے اور آج ان ہی کے اخلاف کا کیا حال ہے، اور بات اسی حد پر ختم پر نہیں ہو جاتی ہے، ملا صاحب نے اس کے بعد جو یہ اضافہ کیا ہے کہ:

'' گاہے چناں بودے کہ اگر کافرے یا ظالمے بمرتبہ اول شفاعتش قبول نہ کردہ یا عمدا از خانہ بدر نیامدہ شیخ تمام روز بر خانہ او نشستہ'' (کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اگر کسی کافر یا ظالم حاکم کے پاس شیخ کی سفارش کارگر نہ ہوتی اور وہ اس کو قبول نہ کرتا، یا قصداً گھر سے باہر نہ نکلتا تو دن دن بھر شیخ اس کے دروازے پر بیٹھے رہتے)۔

نہ عزت کی پروا ہے اور نہ پوزیشن، کیوں کہ شیخ کوئی معمولی آدمی نہ تھے۔ ان کے علمی وقار کا اندازہ اسی سے کیجیے کہ ملا عبدالقادر جیسے آدمی ان کے شاگرد ہیں اور اس تلمذ پر ان کو فخر ہے خود لکھا ہے کہ:

''در درس آں صاحب کمال بعضے کتب رسائل تصوف استفادہ نمودہ الحمدللہ'' (اس باکمال بزرگ کی خدمت میں تصوف کے چند رسالوں کو پڑھنے کا مجھے بھی موقع ملا ہے، الحمدللہ)۔

علاوہ علوم باطنی کے ملا صاحب کا بیان ہے:

''در علوم ظاہری ہم کامل و مکمل بود و تفسیر غوامض و عوارف و فصوص الحکم و شروحش بہ تلامذہ درس گفتے، صاحب تصانیف مشہور ست''۔

بہرحال اگر عہدہ دار اس دن ہاتھ نہ آتا یا شیخ کی سفارش نہ سنتا تو شیخ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے ملا صاحب نے لکھا ہے کہ:

''روز دیگر بدر بار او مکرر رفتہ و دم نزدہ واز یں معنی ہیچ رنگ کدورتے بر آئینہ خاطر غیب نمایش نہ نشستہ'' (دوسرے دن پھر اسی کافر یا ظالم عہدہ دار کے دربار میں جاتے اور کوئی شکوہ یا گلہ نہ کرتے، نہ دل میں اس طرز عمل سے کوئی کدورت پیدا ہوتی)۔

کچھ اس طرح لپٹ جاتے تھے کہ بالآخر: ''تا آنکہ مشفوع عنہ خود شرمندہ وخجلت زدہ در پائے او می افتادہ وحاجت آں فقیر را سمعا وطاعۃ برمی آورد'' (وہ شخص جس سے سفارش کی جاتی تھی خود شرمندہ اور خجل ونادم ہو کر شیخ کے پاؤں پر گر پڑتا اور یوں بخوشی ورضا اس بے چارے غریب کا کام نکل جاتا)۔

خانقاہ سارے محتاجوں کا سہارا تھی:

اسلام کے ان اکابر کا حال پڑھیے اور اس پر غور کیجئے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ امراء اور غرباء کے درمیان ان ہی بزرگوں کا وجود باجود حلقہ اتصال بنا ہوا تھا، اور میرا خیال ہے کہ ان کی خانقاہوں کے لنگر خانے جہاں اپنے اندر دوسرے اغراض رکھتے تھے، ایک بڑا کام ان سے یہ بھی نکلتا تھا کہ ملک کے غریبوں، مسافروں، بے وسیلوں کی پناہ گاہ یہ خانقاہیں بنی ہوئی تھیں بلکہ ان ہی کے ذریعہ سے غریبوں تک بھی وہ نعمتیں پہنچ جاتی تھیں جن کا نام بھی اس زمانہ کے غریبوں نے شاید نہ سنا ہو۔

مسلمان جس ملک میں بھی پہنچے تھے اس کے طول وعرض میں آپ کو اس قسم کی خانقاہوں کا جال بچھا ہوا نظر آئے گا، خیال تو کیجئے عہد التمش وبلبن؛ یہ ہندستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کا زمانہ ہے لیکن دلی ہی میں نہیں، پایہ تخت سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں میل دور ہم دیکھتے ہیں کہ غرباء کے لیے ان ہی خانقاہوں کے ذریعہ سے لنگر جاری ہیں۔

سیر اولیاء میں سلطان المشائخ کی زبانی یہ روایت درج ہے کہ شیخ کبیر شکر گنج کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے ''در اوائل از آئندگان می شنیدم کہ شیخ خضر پارہ دوز در بہار خانقاہ دارد ودرویشاں را خدمت می کند'' (ص۱۱۲) (کہ بہار میں شیخ خضر پارہ دوز کی ایک خانقاہ ہے جہاں وہ درویشوں کی خدمت کرتے ہیں)۔

سلطان المشائخ کا ابتداء میں ان ہی کے پاس بہار جانے کا خیال تھا۔ ''نیت جزم کردم کہ بروم وغلام بچگان اورا تعلیم بکنم'' (میں نے عزم کر لیا تھا کہ وہاں جاؤں گا اور ان کے بچوں کے تعلیم و تربیت کروں گا)۔

غور کرنے کی بات ہے یہ زمانہ ظاہر ہے کہ سلطان المشائخ کی نوعمری کا زمانہ ہے، غالبًا

ناصرالدین بن التمش کا زمانہ ہوگا اور اسی زمانہ میں دلی سے اتنی دور بہار میں درویش کی خانقاہ جاری ہے، اور درویشوں کی خدمت ہورہی ہے۔

بہرحال ''فتوحات'' و ''نذور'' شکرانوں کی آمدنیاں ان خانقاہوں میں ضرور ہوتی تھیں، لیکن جب تک ہماری خانقاہیں واقعی خانقاہیں تھیں دکانوں کی شکل انھوں نے نہیں اختیار کی تھی، تو اس وقت خانقاہ کے درویش کی حیثیت مالک کی نہیں صرف قاسم کی رہتی تھی۔

جن دینی بادشاہوں نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین کی خدمت میں صرف کر کے اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر بنائے رکھا، آج ان پر زبانیں کھل رہی ہیں، ان لوگوں کی جن کا سرمایہ دینی جدوجہد کی راہ میں زبان سے نکلنے والے چند تقلیدی الفاظ، یا قلم سے بننے والے چند فرسودہ پامال حروف کے سوا اور کچھ نہیں ہے، جن سے بہ مشکل پانچ وقت کی نماز بھی ٹھیک طریقہ سے ادا نہیں ہوسکتی، خدا کی شان ہے وہی آج ان بزرگوں کو ٹوکنے کی ہمت کر رہے ہیں، جن کی زندگی میں ''دین'' اور دین کی حقیقی سچی خدمت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

غیاث الدین تغلق پر جب نوتعمیری دعوتی مکان گرا، تو کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ کے ستانے کا چونکہ ارادہ رکھتا تھا، حضرت سے لوگوں نے عرض کیا کہ اب تو وہ جمنا کے ساحل پر آ گیا، دو ایک روز میں دلی پہنچ کر معلوم نہیں کیا مصیبت پیدا کرے، بیان کیا جاتا ہے کہ اسی وقت زبان مبارک سے ''ہنوز دلی دوراست'' کا فقرہ نکلا۔ جو نسلوں اور پشتوں سے منتقل ہوتے ہوئے آج تک زبان زد عام ہے۔

اسی طرح خلجی فاسق سیہ کار بادشاہ قطب الدین مبارک جب اپنے غلام خسرو خاں کے ہاتھ مارا گیا، تو عموماً اس موقع پر بھی مورخین ذکر کرتے ہیں کہ جس رات کو مارا گیا اس کی صبح کو وہ سلطان المشائخ کے ساتھ گستاخی کا عزم کیے ہوئے تھا، کہتے ہیں کہ سلطان المشائخ ہی کی بددعا کا شکار ہوا۔

مجمل لفظوں میں میر خورد نے سیر الاولیاء میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، حاصل یہ ہے کہ خضر خاں چونکہ حضرت والا کا مرید تھا اور وہی علاء الدین کا ولی عہد تھا، جس سے قطب الدین نے حکومت غصب کی تھی اس لیے قطب الدین حضرت سے ناراض رہتا تھا، اس نے اپنی نئی جامع مسجد ''جامع میری'' کے نام سے بنوائی تھی اور تمام مشائخ وعلما کو حکم تھا کہ اسی میں آ کر نماز جمعہ ادا کریں، سلطان المشائخ نے کہلا بھیجا کہ ''مسجد نزدیک داریم وایں احق است ہمیں جا خواہم گذارد'' اور وہ جامع میری نہیں گئے، بادشاہ سخت برافروختہ ہوا، اسی کے ساتھ ہر نوچندی کو اعیان ومشاہیر شہر دربار شاہی میں پیش

ہوکر نذر گذرانتے تھے۔ سلطان المشائخ اس تقریب میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے، ادائے رسم کے لیے اپنے خادم اقبال کو بھیج دیتے تھے، اس سے بھی وہ برہم تھا۔ اس نے اپنے تمام امراء، وزراء کو حکم دیا کہ ''کسے بزیارت شیخ غیاث پور نرود'' میر خورد نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''بارہا می گفت کہ ہر کہ سر شیخ بیارد ہزار تنکہ زر اورا بدہم''۔

ایک دن شیخ ضیاء الدین رومی کی درگاہ میں سلطان جی اور قطب الدین کا آمنا سامنا بھی ہوگیا، سلطان جی نے بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے سلام کیا، قطب الدین نے جواب نہ دیا، یوں مسلسل واقعات قطب الدین کی حکومت کی چار سالہ مدت میں پیش آتے رہے، نوچندی کی حاضری پر اصرار کا قصہ سب سے آخر میں پیش آیا۔ قطب الدین نے بھرے دربار میں اعلان کیا کہ اگر ''درغرہ ماہ آئندہ نیابد بیاریم چنانکہ دانیم'' گویا یہ اس کی دھمکی تھی کہ بزور حکومت دربار میں گھسٹوا کر بلواؤں گا، شاید قتل ہی کا ارادہ ہو، سلطان جی کو بادشاہ کے اس عزم مصمم کی خبر پہنچی ''سلطان المشائخ ہیچ نگفت'' اب مہینہ ایک ایک دن کر کے ختم ہوتا جارہا تھا۔ ''ہر چند ماہ نزدیک رسید التفات مخلصاں را روئے پیش ترمی داد'' الغرض مہینہ ختم ہوا، چاند مغرب کے بعد دیکھا گیا، کل پہلی تاریخ ہے، شہر کے اعیان وامراء دربار میں جائیں گے، لیکن سلطان المشائخ یہی طے کیے ہوئے ہیں کہ میں نہیں جاؤں گا، قطب الدین بھی فیصلہ کیے ہوئے ہے کہ اگر ''نیاید بیاریم چنانکہ دانیم'' صرف شب درمیان است، دل میں کھلبلی مچی ہوئی ہے، دنیا اور دین کے دو بادشاہوں کا کل معرکہ ہے، رات گذرنے بھی نہ پائی کہ ''ہمدریں شبِ ماہ بلائے از آسماں بر جان بادشاہ نازل شد''۔

یعنی خسرو خاں حسن پروار بچہ ''موئے سر سلطان را گرفت وباہم درآویختند و پہلوئے سلطان را بہ خنجر شکافتہ بر زمین انداخت وسر آں شوم را از تن جدا کردہ از بام ہزار ستون بزیر افگند'' (طباطبائی) صبح کو ''سر اورا بالائے نیزہ کردہ بخلق نمود'' میر خورد کہتے ہیں کہ جس رات کو یہ واقعہ پیش آیا، سلطان المشائخ اپنے بالا خانہ کی چھت پر ٹہلتے ہوئے زبان مبارک سے یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

اے رو بہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
باشیر پنجہ کردی ودیدی سزائے خویش

میر خورد نے اس شعر پڑھنے کے واقعہ کو نہیں لکھا ہے، دوسرے تذکروں میں ہے البتہ سعدی کے نام سے اسی مقام پر میر نے بھی اس شعر کو استعمال کیا ہے، واللہ اعلم)۔

اسی کشمکش میں دلی ہی کے گویا ایک محلّہ میں رہنا، سلطان المشائخ کی ایمانی استقامت کی بڑی عجیب وغریب شہادت ہے، شخصی حکومت کے مطابق العنانہ اختیارات کا اندازہ کیجیے اور پھر اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے۔ یقیناً ابتلاء کی یہ چار سالہ مدت کم مدت نہیں ہے۔

سلطان المشائخ سے حسد: مسئلہ سماع پر مباحثہ:

مگر پھر بھی مجھے لوگوں پر تعجب ہے کہ جب تاریخی کتابوں میں سلطان المشائخ کے متعلق اس قسم کے واقعات درج ہی کیے جارہے تھے تو اس سلسلہ کا جو سب سے بڑا واقعہ تھا اسی کو قلم انداز کیوں کر دیا گیا، حالانکہ میر خورد نے اسی زمانہ میں اپنی کتاب سیر الاولیاء میں بہ تفصیل اس کا تذکرہ کیا تھا، خلاصہ یہ ہے کہ غیاث الدین تغلق کے عہد میں ''سماع'' کے مسئلہ نے ایک سخت فتنہ کی شکل اختیار کر لی، سلطان المشائخ کے دربار کا جاہ وجلال، دسترخوان کی وسعت، ارباب حاجات کا ہر طرف سے آنا، اور غریبوں کی عام اعانت وامداد کی وجہ سے ملک میں جو ہر دلعزیزی آپ کو حاصل تھی، یہی چیز بعض علما وقت کے حسد کا باعث ہوئی، اور تو کوئی چیز قابل اعتراض بات سلطان المشائخ کی زندگی میں ملی نہیں، اسی غیر مزامیری سماع کے مسئلہ کو اہم بنا کر مولویوں نے محضر نامہ کی صورت میں غیاث الدین کے پاس پیش کیا۔ ایک صاحب جن کا نام شیخ زادہ جام حسان الدین تھا سلطان المشائخ کی خانقاہ کے رہے ہوئے بلکہ پلے ہوئے تھے، میر خورد نے لکھا ہے:

''پاتا بہ غریبی درخانہ سلطان المشائخ کشادہ بود''۔

یعنی شروع شروع جب دلی آئے تو حضرت ہی کے یہاں فروکش ہوئے، بڑے آدمی شیخ جام کے خاندان سے تھے، اس لیے ''بانواع تربیت وشفقت سلطان المشائخ پرورش یافتہ'' بعد کو شاہی دربار میں ان کو رسوخ خاص حاصل ہو گیا تھا۔

یہی حضرت اس محضر نامہ کے پیش کرنے میں آگے آگے تھے، غیاث الدین کو حیرت ہوئی جب اس نے سنا کہ غیر مزامیری سماع بھی حرام ہے، اس نے فرمان صادر کیا:

''چوں علما دین درحرمت سماع فتویٰ کردہ بجہت ایں کار مزاحم شدہ سلطان المشائخ را حاضر کنند وجملہ علما شہر واکابر را طلب کنند'' (علمائے دین نے سماع کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا اور اس میں مزاحم ہوئے، حکم ہوا کہ سلطان المشائخ اور تمام علما اور اکابر شہر کو بلائیں)۔

فرمان کی تعمیل ہوئی، سلطان المشائخ بھی حاضر ہوئے اور شہر کے علما واکابر بھی بلائے گئے،

اس زمانہ میں نائب السلطنت کے عہدہ پر قاضی جلال الدین لوانجی سرفراز تھے، مجلس میں یہی سلطان المشائخ سے مخاطب ہوئے، بادشاہ بھی موجود تھا، طرفین میں گفتگو ہو رہی تھی، دونوں کی سن رہا تھا درمیان میں فریق مخالف کے علما جب شور برپا کرتے تو تغلق کہتا:

''غلبہ نکنید بشنوید کہ شیخ چہ می فرماید'' (ہنگامہ نہ کریں بلکہ سنیں کہ سلطان جی کیا فرماتے ہیں)۔

اس عرصہ میں شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کے نواسے مولانا علم الدین بھی مجلس مناظرہ میں کہیں سے آ پہنچے، غیاث الدین ان کا کچھ معتقد تھا، ان ہی کو اس نے حکم بنایا اور کہا:

''بغداد، شام وروم گشتہ اید بفرمائید مشائخ آں سماع می شنوند یا نے؟ وایشاں را دریں کار کسے مانع شود یا نے؟'' (آپ بغداد، شام اور روم پھر چکے ہیں فرمایئے کہ اس دیار کے مشائخ سماع سنتے ہیں یا نہیں، اور ان کے اس کام میں کوئی مانع ہوتا ہے یا نہیں؟

مولانا علم الدین نے جواب میں جو واقعہ تھا وہ بیان فرمایا:

''در ہمہ شہر ہا بزرگان ومشائخ سماع می شنوند'' (تمام شہروں میں مشائخ اور بزرگ سماع سنتے ہیں)۔

بلکہ یہ بھی کہا کہ بعض مقامات میں تو ''دف وچغانہ'' کے ساتھ بھی سنتے ہیں۔ ''وکسے ایشاں را مانع نمی شود'' (کوئی انھیں روکتا نہیں ہے)۔

تغلق نے ان کی یہ رپورٹ جب سنی ''ساکت شد وہیچ نہ گفت'' (خاموش ہو گیا، کچھ نہیں کہا)۔

نائب السلطنت قاضی جلال الدین نے بادشاہ پر اصرار کیا کہ ممانعت سماع کا فرمان جاری کر دیجئے، سلطان المشائخ نے کہا بادشاہ ایسا حکم صادر نہ کریں، تغلق نے سلطان المشائخ ہی کی بات مان لی، یعنی کوئی فیصلہ نہ ہوا۔ جو حال اب تک تھا وہی باقی رہا، مولانا فخر الدین زرادی کے عربی رسالہ سے یہ فقرہ میر خورد نے نقل کیا ہے جس میں اس مجلس مناظرہ کی کیفیت درج ہے۔

وكان ذالك من اول الضحى الى اوان الفئى ثم قام اهل المجلس من عند السلطان (ابتداء وقت چاشت سے سایہ ڈھلنے تک مناظرہ کی یہ مجلس قائم رہی پھر لوگ بادشاہ کے سامنے سے اٹھ گئے)۔

سلطان المشائخ کے تاثرات: کیا حدیث سے فقہ برتر ہے؟

میر خورد نے اس کے بعد مولانا ضیاء الدین برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی کے رسالہ ''حسرت نامہ'' سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ:

''چوں حضرت سلطان المشائخ از محضر مذکور در خانہ آمد بوقت نماز پیشین (ظہر) مولانا محی الدین کاشانی وامیر خسرو شاعر را طلب فرماد'' (اندر گھر میں آئے تو ظہر کی نماز کے وقت مولانا محی الدین کاشانی اور امیر خسرو شاعر کو طلب فرمایا)۔

برنی کا بیان ہے کہ جب ہم لوگ حضرت کی خدمت میں جمع ہو گئے اس وقت حسب ذیل تقریر سلطان المشائخ نے شروع کی۔

''گفت کہ دانشمندان (علما) دہلی بعداوت وحسد من پر بودند میدان فراخ یافتند وسکس ہائے پراز عداوت ایشاں بسیار گفتند'' (فرمایا کہ علما دہلی میری عداوت وحسد سے بھرے ہوئے تھے۔ میدان وسیع اور عداوت سے بھری ہوئی بہت سی باتیں کیں)۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس میں جو تقریریں ہوئی تھیں ان سب کا خلاصہ سلطان المشائخ نے ذکر فرمایا، آخر میں ارشاد ہوا۔

''عجبے امروز معائنہ شد کہ در معرض حجت احادیث صحیح حضرت مصطفیٰ ﷺ نمی شنوند وہمیں گویند کہ درشہر عمل بروایت فقہ مقدم ست بر حدیث'' (آج عجیب بات دیکھنے میں آئی کہ بحث کے موقع پر مصطفیٰ ﷺ کی صحیح حدیث بھی نہیں سنتے اور کہتے ہیں کہ ہمارے شہر میں روایت فقہ پر عمل بمقابلہ حدیث مقدم ہے)۔

ہندو شاہ فرشتہ: حدیث بر تر یا فقہ

خدا جانے بیجاپور میں بیٹھے ہندو شاہ کے بیٹے قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ میں کہاں سے یہ بات اڑائی کہ امام غزالی کا قول یجوز لاھلہ ولا یجوز لغیر اھلہ کو حدیث قرار دے کر سلطان جی نے پیش کیا، کیا تماشا ہے دو ہزار سے اوپر حدیثوں کے حافظ پر یہ الزام ہے، اسی مجلس میں مولانا فخر الدین زرادی موجود تھے، گذر چکا کہ وہ دعوے کے دونوں پہلو، جواز وعدم پر دلیل پیش کرنے کے لیے تیار تھے)۔

اور صرف یہی نہیں، برنی نے براہ راست سلطان المشائخ کی زبان سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''ہر بار کہ حدیث صحیح حضرت مصطفیٰ ﷺ مذکور می شد برمی آمدند ومنع می کردند ومی گفتند ایں حدیث متمسک شافعی است واو دشمن علما بلا است مانمی شنویم'' (جب جب حدیث ذکر کی جاتی تھی تو برافروختہ ہوتے اور منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ، یہ امام شافعی کی دلیل ہے اور وہ ہمارے علما کے دشمن ہیں ہم اسے نہیں مانتے)۔

اسی کو ''بدنام کنندۂ نکونامے چند'' کہتے ہیں، کیا واقعۃ یہی حقیقت ہے، یہی امام ابوحنیفہ اور

علمائے احناف کا مسلک ہے، کیا ان خرافات کا اظہار جب ان مولویوں کی زبانوں سے ہو رہا تھا، تو وہ اصل حقیقت سے آگاہ نہ تھے، لیکن ان کے حسد اندھا بنائے ہوئے تھا۔

اسی کے بعد سلطان المشائخ ہی کے الفاظ یہ ہیں۔

ضیاء برنی نے اس کے بعد لکھا ہے سلطان المشائخ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلنے لگے:

''ایں چہ روزگار است دراں شہرے کہ ایں چنیں مکابرہ کنند چہ گونہ آباداں ماند، عجب است کہ خشت خشت نہ شود'' (یہ کیا زمانہ ہے جس شہر میں اس طرح دھاندلی کی جائے گی وہ کیسے آباد رہے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اینٹ سے اینٹ نہ الجھ جائے)۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ سلطان المشائخ کی وفات ''ایں واقعہ (یعنی قصر افتادن بر غیاث الدین تغلق) در سنہ خمس وعشرین سبع مأۃ ۷۲۵ھ روے نمود (ص ۲۲۵)۔ (محل کے غیاث الدین تغلق پر گرنے کا واقعہ ۷۲۵ھ میں پیش آیا۔

اور دلی کی اینٹ سے اینٹ بجانے والا، دلی کے ایک ایک تنفس کو دلی سے جلا وطن کر کے دیوگڑھی (دولت آباد) لے جانے والا اور ان سارے مصائب ہائلہ کا سرچشمہ جس کا نام محمد تغلق ہے لاکھوں کی آبادی رکھنے والے معمور شہر کو بہ یک گردش قلم ویران کرتا ہے اور ایسا ویران کہ بقول ملا عبدالقادر بداؤنی:

''دہلی چناں خراب شد کہ سگ وگربہ ہم دراں نہ ماند وایں بیت حسب حال آں بود'' (دہلی اس طرح برباد ہوئی کہ اس میں کتے اور بلیاں نہ رہے اور یہ شعر اس کے حسب حال ہے)۔

جائے کہ بود آں دلستاں بادوستاں در بوستاں
شد گرگ و روبہ را مکاں شد گرگ وکرگس را وطن

لوگوں نے ''مقام مستودع'' یعنی قبر کے متعلق دریافت کیا، فرمایا:

''من زیر عمارت کہ خفتنی نہ ام من درصحرا خواہم خفت'' (میں کسی شخص کی عمارت کے زیر سایہ سونے والا نہیں ہوں میں تو میدان میں آرام کروں گا)۔

میر خورد نے لکھا ہے کہ حضرت والا کو لوگوں نے ایک کھلے میدان میں ہی حسب خواہش دفن کیا تھا، ''آنجا کہ روضہ متبرک سلطان المشائخ است صحرا بود'' لیکن بعد کو اسی محمد تغلق نے قبر شریف پر ''گنبد عمارت کنانید'' (سیر الاولیاء، ص ۱۵۴)۔

میر خورد کا بیان ہے کہ قاضی جلال الدین نے بادشاہ کے سامنے سلطان المشائخ کو اس کی

بھی دھمکی دی کہ:

''اگر سماع بشنوی من حاکم شرع ام ترا بیازارم'' (اگر آپ نے قوالی سنی تو میں حاکم شرع ہوں آپ کو اذیت دوں گا)۔

سلطان المشائخ قاضی کی تمام باتوں کو سن کر ''حلم می ورزید وتحمل می کرد'' (برداشت کیا اور تحمل سے کام لیا)۔

لیکن اس کی اس دھمکی پر زبان مبارک سے صرف ''معزول باد'' کا فقرہ نکل گیا، کہتے ہیں:

''بعداز دوازدہ روز معزول شد'' (بارہ دنوں بعد معزول ہو گیا)۔

''شما دریں کار ہا موافقت خواہید کرد'' (آپ اس کام میں ہماری موافقت کروگے)۔

تغلق اور مولانا زرادی:

مولانا زرادی نے جواب میں فرمایا ''انشاءاللہ تعالیٰ''۔

دیوانے تغلق کی اس سے تشفی ہوسکتی تھی بولا کہ: ''ایں کلمہ شک است'' یہ شک کا کلمہ ہے۔ سننے کی بات ہے۔ سامنے تغلق ہے، تغلق کے جلاد ہیں، اس کی کھینچی ہوئی تلوار ہے۔ بغیر کسی جھجھک کے جواب میں مولانا نے فرمایا ''در مستقبل ہمی آید'' (مستقبل میں یہی ہو کر رہے گا)۔

مطلب یہ تھا کہ یہی ہو کر رہے گا۔ یعنی خود تمہارا عزم مشکوک اور مشتبہ ہو کر ختم ہو جائے گا۔ تغلق کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا، خون کھولنے لگا، لیکن کسی معمولی کردار کا سامنا نہ تھا، بات بدل دی اور بولا کہ ''شما، مارا نصیحت کنید''۔

مولانا فرماتے ہیں۔ یعنی درندوں جیسا غصہ تم نے اپنے اندر پیدا کر لیا ہے کہ کسی کی ادنیٰ مخالفت برداشت نہیں کر سکتے، اس غصہ کو پی جاؤ۔

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس جواب کے بعد مولانا کے سامنے جو انجام ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے، شاہی دربار کی طرف جس وقت قطب الدین دبیران کو لے چلے تھے، اسی وقت یہ کہتے ہوئے اٹھے تھے:

''من سر خویش بر در سرائے ایں مرد (تغلق) غلطیدہ می بینم با او مسامحت نخواہم کرد او زندہ نخواہد گذاشت'' (میں اس تغلق کے سامنے اپنے سر لتھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں اس کے ساتھ درگذر نہیں کروں گا وہ زندہ نہیں چھوڑے گا)۔

سیکڑوں کا انجام ان کے سامنے تھا، اسی پر قیاس کر رہے تھے، کچھ ہی دن پہلے اسی حق گوئی

کے الزام میں مولانا عماد غوری کا سر اسی محمد تغلق کی تلوار سے اڑ چکا تھا، شیخ محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں محمد تغلق پر جدید دین کی تجویز کا خبط سوار تھا مولانا عماد غوری کو بلا کر اس نے پوچھا:

''فیض خدا منقطع نیست چرا باید کہ فیض نبوت منقطع شود'' (اللہ تعالیٰ کا فیضان بند نہیں ہے کیوں کر ممکن ہے کہ نبوت کا فیض منقطع ہو جائے)۔

یہی فقرہ ہے جو ہندستان کی جدید نبوت اور جدید وحی کے مدعی قادیانی مرزا کو ہاتھ لگا۔ اسی تغلقی فقرہ پر ان کے متبنی کی دیوار قائم ہے، کاغذ اور سیاہی کی کمی قادیان میں تو کبھی محسوس نہیں ہوئی لیکن تحلیل و تجزیہ کے بعد سارے مفہومات کا خلاصہ اسی ایک فقرہ میں مندرج ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے، صدیوں کے بعد پھر اسی تغلق مالیخولیا نے قادیانی میں زور باندھا۔

شیخ محدث نے لکھا ہے کہ: ''مولانا عماد برفور گفت کہ گہ مخور چہ می گوئی'' (کھریا مت کھا، تو کیا بک بک کر رہا ہے)۔

اس نے حکم دیا کہ ''اورا ذبح کنند و زبانش برآرند''، ص ۲۰ (اس کو ذبح کرو اور اس کی زبان کھینچو)۔

اور ایسے واقعات تو ہر دن بلکہ دن کے اکثر گھنٹوں میں پیش آتے رہتے تھے، البتہ زیادہ تر اس ستم کے تختۂ مشق بے چارے وہی لوگ تھے جو اس کے دربار کے ملازم تھے، معمولی قصور پر قتل کی سزا پاتے تھے، مولانا عماد رحمۃ اللہ علیہ ان عاشقانِ پاک طینت میں ہیں جنھوں نے اپنے وقت میں اللہ اور اس کے رسول کے عشق میں ''بخاک و خون غلطیدن'' کی رسم کو زندہ کیا تھا۔ رضی اللہ عنہ۔

بہر حال مولانا زرادی بھی اسی رسم کی تازگی پر کمر بستہ کیے بیٹھے تھے لیکن خدا ہی جانتا ہے کیا صورت پیش آئی کہ تغلق مولانا کی زبان سے ایسی سخت بات سننے کے بعد بھی خاموش ہی رہا بلکہ بجائے اس کے خاصہ طلب کیا اور مولانا کو اپنے ساتھ بٹھا کر ''در یک صحنک بطعام خوردن مشغول شدند'' (ایک تشتری میں کھانا کھانا شروع کیا)۔

مولانا کھانے میں شریک تو ہو گئے لیکن چہرہ کی حالت بتا رہی تھی کہ ان پر سخت بار ہے، تغلق کو بھی ان کے اس بار کا احساس ہو رہا تھا لیکن خلاف معمول وہ اور نرم پڑتا جاتا تھا، حتی کہ مولانا کی دل دہی کے لیے ''گوشت از استخواں جدا می کردہ پیش مولانا فخر الدین می نہاد'' (گوشت کو ہڈی سے جدا کر کے مولانا فخر الدین کے آگے رکھتا تھا)۔

مگر مولانا پر وہی ناراضگی کی علامت برابر باقی تھی۔ ''با کراہ تمام اندک اندک تناول می کرد''

(جبر کر کے تھوڑا تھوڑا کھا رہے تھے)۔

خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور مولانا کو رخصت کرتے ہوئے تغلق نے حکم دیا کہ روپیہ کی ایک تھیلی اور اونی کپڑے کا ایک تھان ہدیہ میں پیش کیا جائے۔اس کی نیت فاسد تھی، ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس ہدیہ کو اگر مولوی نے واپس کیا، بس رد ہدیہ کو خلاف سنت قرار دے کر گردن اڑا دوں گا، اس وقت سلطان المشائخ کے صحبت یافتہ قطب الدین دبیر جان پر کھیل گئے اور قبل اس کے کہ مولانا کی طرف سے ہدیہ بڑھایا جائے، دبیر نے ان کی طرف سے خود لے لیا، دبیر کو یقین تھا کہ مولانا واپس کریں گے اور دیوانہ اسی کو کار براری کا ذریعہ بنائے گا، خدا خدا کر کے مولانا کو تغلق کے دربار سے نجات ملی اور بخیر وخوبی گھر واپس ہوئے۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ اسی قسم کا ایک واقعہ تغلق ہی کے ساتھ سلطان المشائخ کے ایک اور تربیت یافتہ بزرگ حضرت شیخ قطب الدین منور کا بھی ہے۔ یہ شیخ کبیر شکر گنج کے مشہور خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے پوتے ہیں، ہانسی ہی میں ان کا قیام رہتا تھا، محمد تغلق برسبیل دورہ ہانسی پہنچتا ہے، اطراف کے لوگ اس سے ملنے آتے ہیں، لیکن شیخ قطب الدین منور اپنی جگہ سے نہیں ہلتے ہیں، محمد تغلق کو اس کی خبر ملتی ہے، حاضری کا فرمان صادر کرتا ہے اور حسن برہنہ نامی امیر کو حکم دیتا ہے کہ فوراً شیخ کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کیا جائے۔حسن برہنہ ہانسی پہنچتا ہے، شیخ کو بادشاہ کا حکم سناتا ہے شیخ پوچھتے ہیں، جبراً لانے کا حکم ہے یا میری مرضی کو بھی دخل ہے، اس نے کہا کہ جبراً، جس طرح ممکن ہو لاؤ، اس کا حکم ہے۔شیخ بیوی کے پاس جاتے ہیں، خدا کے حوالہ ان کو اور بچوں کو کرتے ہیں۔

''مصلی کتف، عصا در دست گرفتہ پیادہ پا رواں شد'' (جائے نماز کندھے پر اور لاٹھی ہاتھ میں پکڑی اور پیدل روانہ ہو گئے)۔

حسن گھوڑا پیش کرتا ہے، انکار کیا گیا، ہانسی سے باہر نکلتے ہوئے اپنے آباء واجداد کے مقبرے کے سامنے سے گذرتے ہیں، فرماتے ہیں ''من از کنج شما باختیار خود بیروں نہ آمدہ ام مارا می برند'' (میں آپ کے گوشے سے اپنے اختیار سے باہر نہیں نکلا ہوں، مجھے لوگ لے جا رہے ہیں)۔

شاہی بارگاہ ہانسی نامی قریہ میں تھی، جو ہانسی کے قریب ہے۔لیکن بادشاہ بجائے ملاقات کرنے کے حکم دیتا ہے کہ شاہی کیمپ کے ساتھ ان کو دلی لے چلو، اب ساتھ ساتھ منزل بمنزل دلی پہنچتے ہیں، دلی میں ان کے صاحبزادے میاں نورالدین بھی آجاتے ہیں، تغلق شیخ کی حاضری کا حکم دیتا ہے،

شیخ نورالدین صاحبزادے بھی ساتھ ساتھ جاتے ہیں، شاہی محل سرا میں دونوں باپ بیٹے داخل ہوتے ہیں، ہر طرف ننگی تلواریں لیے سنتری ٹہل رہے ہیں، در و دیوار سے دہشت وخوف کی بارش ہو رہی ہے، شیخ قطب الدین مطمئن آگے بڑھے چلے جاتے ہیں، لیکن کمسن نوجوان شیخ نورالدین کی ٹانگوں میں لرزش پیدا ہوتی ہے، بیٹے کو پلٹ کر شیخ اس حال میں پاتے ہیں، فرماتے ہیں ''بابا نورالدین العظمۃ والکبریاء للہ'' (یعنی بابا نورالدین بڑائی اور عظمت صرف اللہ ہی کے لیے ہے)۔

یہ وہ نشہ تھا، توحید کا، جو سلطان المشائخ کی مجلس میں پلایا جاتا تھا۔ نورالدین سنبھل جاتے ہیں، تخت سامنے نظر آتا ہے۔

ہاتھ میں تیر وکمان ہے، بادشاہ کا غصہ سے چہرہ بگڑا ہوا ہے۔ آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں، شیخ السلام علیکم کہتے ہیں، مصافحہ کے لیے بادشاہ ہاتھ بڑھاتا ہے، شیخ ہاتھ ملاتے ہیں، ہاتھ کا ملانا تھا کہ تغلق کا رنگ فق پڑ جاتا ہے۔ خدا جانے کیا کچھ کہنے کے لیے تیار بیٹھا تھا، لیکن اب زبان سے جو الفاظ اس کے نکلتے ہیں وہ یہ ہیں:

''من بہ زیارت شما رسیدیم تربیت نہ فرمودند و بملاقات خویش مشرف نہ گرانیدند'' (میں آپ کے دیار میں پہنچا ہوں آپ نے تربیت نہیں فرمائی اور اپنی ملاقات سے شرف نہیں فرمایا)۔

شیخ اسی توحیدی سکینت ووقار کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔

''ای درویش خود را دریں محل نمی دارد کہ ملاقات بادشاہاں کند، در گوشہ بہ دعا گوئی بادشاہ و کافہ اہل اسلام مشغول می باشد، معذوری باید داشت'' (یہ فقیر اپنے کو اس جگہ نہیں پاتا کہ وہ بادشاہوں سے ملاقات کیا کرے، کونے میں بیٹھ کر بادشاہ اور تمام مسلمانوں کے لیے دعا میں مشغول رہتا ہے۔ آپ کو اسے معذور رکھنا چاہیے)۔

تغلق چپ ہو جاتا ہے اور فیروز باریک جو بعد کو فیروز شاہ کے نام سے مشہور ہوئے ان کو حکم دیتا ہے: ''اینچہ مطلوب شیخ ست ہمچناں کنید'' (شیخ کا جیسا منشاء ہو وہی کرو)۔

شیخ فرماتے ہیں: ''مقصود من فقر و مطلوب من کنج جدو پدرست'' (مقصد فقیری، اور میرا مطلوب باپ دادا کا گوشہ ہے اور بس)۔

محمد تغلق یہ سن کر ان کو رخصت کر دیتا ہے، میر خورد نے تغلق کے ایک نامی امیر اعظم ملک کبیر معظم کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ شیخ کی روانگی کے بعد محمد تغلق نے اہل دربار کو مخاطب کر کے

کہا کہ جس کسی نے مجھ سے آج تک مصافحہ کیا، ''البتہ دست اولرزید مگر ایں بزرگ کہ بقوت دین دست ما محکم گرفتہ بود از سیمائے او مہابت دین احساس کردم'' (یقیناً اس کا ہاتھ کپکپایا لیکن یہ بزرگ جن کو دین کی قوت حاصل ہے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا، اس پر دین کا جلال میں نے خصوصیت سے محسوس کیا)۔

لیکن دین کی یہ مہابت اور ہاتھ میں یہ قوت کہ محمد تغلق جیسا جبار بھی، ان کی نگاہوں میں پر پشہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، یہ کہاں سے پیدا ہوا تھا؟ آگے قصہ سنیے۔ تغلق نے فیروز شاہ اور مولانا ضیاء الدین برنی کو شیخ کے پاس بھیجا کہ ان کو مطلع کرو: ''بادشاہ یک لک تنکہ انعام فرمود'' (بادشاہ نے ایک لاکھ تنکہ انعام میں دیا ہے)۔

خبر شیخ کو پہنچی ہے، بے ساختہ زبان مبارک سے ''نعوذ باللہ ایں درویش یک لک تنکہ قبول کند'' (خدا کی پناہ یہ فقیر ایک لاکھ تنکہ قبول کرے گا، یعنی نہیں)۔

ٹکا سا جواب دے دیا جاتا ہے، دونوں بادشاہ کی خدمت میں شیخ کے انکار کی خبر پہنچاتے ہیں۔

''فرمان شد کہ پنجاہ ہزار بدہید'' (فرمان ہوا کہ پچاس ہزار دے دو)۔

بالآخر بڑے ردوکد کے بعد دو ہزار پر بات طے ہوئی۔ شیخ اس رقم کے لینے پر راضی ہو گئے اور اس لیے راضی ہو گئے کہ فیروز شاہ اور برنی دونوں نے عرض کیا کہ ''ما کم ازیں نتوانیم پیش تخت ذکر کردن کہ شیخ ایں ہم قبول نمی کند'' (میں اس سے کم تخت کے سامنے نہیں ذکر کر سکتا کہ شیخ اتنا بھی قبول نہیں کرتے)۔

شیخ قطب الدین نے دونوں کو جواب دیا:

''سبحان اللہ درویش را دو سیر کھچڑی دانگے سیر روغن کفاف باشد او ہزار ہا چہ کند'' (سبحان اللہ فقیر کو دو سیر کھچڑی اور کچھ سیر گھی کافی ہوگا وہ ہزاروں کی رقم لے کر کیا کرے گا)۔

بلگرام کے دل والے:

اب میں آپ کے سامنے چند مثالیں گیارہویں بلکہ بارہویں صدی ہجری کی مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی مختصر کتاب ''مآثر الکرام'' سے اخذ کر کے پیش کرتا ہوں، جس کا کسی صوبہ، یا ضلع یا تعلقہ کے باشندوں سے نہیں بلکہ زیادہ تر اودھ کے قصبہ ''بلگرام'' ہی کے لوگوں سے تعلق ہے، ایک قصبہ کی پیداواروں کا جب یہ حال تھا تو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ سارا ملک کس رنگ میں رنگین ہوگا۔

ابوالفضل نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ''درآنجا چاہے ست کہ ہر کہ چہل روز آب از وآشامد شناسائی وحسن منظر فزاید''۔ (وہاں ایک کنواں ہے جو شخص بھی کنوئیں کا چالیس دن پانی پیئے گا اس کی شناسائی اور خوش منظری بڑھ جائے گی)۔

شناسائی کا واللہ اعلم کیا مطلب ہے۔ دقت نظری یا معرفت کچھ بھی ہو، لیکن ظاہر ہے کہ یہ تو خوش اعتقادی کے زمانہ کی باتیں ہیں، خوش اعتقادی کا ایسا زمانہ کہ ابوالفضل جیسے بداعتقاد آدمی کو بھی اس کے تذکرہ میں ندامت محسوس نہیں ہوئی۔

ہندستانی تصوف خصوصاً طریقہ چشتیہ کی خاص خصوصیت ''سلوک بالقرآن'' تھی۔

بلگرام میں اس وقت دوائے دل کا کام سید لطف اللہ بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد تھا، مولانا آزاد بھی خود ان ہی کے دست گرفتہ ہیں، عوام سید صاحب کو میر لدھا یا پیر لدھا کے نام سے پکارتے تھے، اور مولانا آزاد اپنی کتاب میں ہر جگہ ان کو سید العارفین کے لقب سے ملقب فرماتے ہیں۔ سید نور اللہ سید العارفین میر لدھا صاحب کے برادر صغیر تھے۔

میری ایک کتاب ''دم واپسیں'' کا بکھرا ہوا مواد غیر مرتب حال میں پڑا ہوا ہے، چند اجزاء اختصاریات کے عنوان سے القاسم دیوبند میں شائع بھی ہوئے تھے۔ پھر سمیٹنے کا موقع نہ ملا خدا کرے کہ توفیق میسر ہو، عجب واقعات ہیں، ان کے بھی جو مرنے کے لیے جیتے تھے اور ان کے بھی جو جینے پر مصر تھے، لیکن بہر حال ان کو مرنا پڑا۔

سید العارفین سے ان کے تصوف کا حاصل مولانا نے جو نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ:

''مرد آن ست کہ ظاہرش با معاملہ خلق متفق باشد و باطنش در یاد مولی مستغرق'' (مرد وہ ہے کہ جس کا ظاہر مخلوق کے معاملہ سے متفق ہو اور باطن مراد حقیقی کی یاد میں ڈوبا ہوا ہو)۔

آپ اگر دیکھیں گے تو عام اسلامی صوفیہ کا آپ کو یہی مسلک نظر آئے گا۔

جادو:

فوائد الفواد میں حسن علا سجزی نے براہ راست حضرت سلطان المشائخ کی زبانی یہ واقعہ نقل کیا ہے، یہ لکھنے کے بعد کہ:

''بندہ ایں خبر ناخوش آنحضرت ہم در لشکر شنیدہ بود کہ کسے سحر کردہ بود ایں معنی عرضداشت کردہ شد کہ چہ گونہ بود'' (بندہ نے لشکر میں یہ ناخوشگوار خبر سنی کہ کسی شخص نے حضرت پر جادو کر دیا ہے، یہ

عرض کر کے پوچھ لیا تھا کہ اس کی کیا صورت تھی)۔

جواب میں سلطان المشائخ نے جو فرمایا میر نے اسے بجنسہٖ نقل کیا ہے یعنی:

''فرمودند کہ آرے مدت دو ماہ زحمت (بیماری) دیدم زحمتے عظیم شد تا مردے را بیارند کہ او در بیروں آوردن علامات سحر مہارتے داشت، القصہ آں مرد بیامد پیش خانہ وحائل آن می گشت دہر بار قدرے گل از زمین برمی داشت وبوے می کرد دریں میاں گلے را بوے کرد وگفت ایں جا بکاوید علامات سحر پیدا شد، آں گاہ اندک مایہ خفتے پیدا شد، دریں میاں آں مرد گفت من آں قدر مہارت می دارم کہ اگر بگویند کسی را کہ سحر کردہ است نام آں ہم بگویم خبر بمن رسانیدند، گفتم زنہار او را منع کنید تا نگوید ہر کہ کرد من از او عفو کردم۔ فوائد الفواد (ص ۱۷۸)۔

(فرمایا: ہاں! دو مہینے بیماری میں مبتلا رہا، بہت تکلیف ہوئی پھر ایک شخص کو لایا گیا جو جادو اتارنے میں مہارت رکھتا تھا چنانچہ وہ آیا گھر کے آگے اور ارد گرد چکر لگایا اور ہر بار زمین سے تھوڑی مٹی اٹھالیتا اور سونگھتا تھا اس نے مٹی کو سونگھ کر کہا اس جگہ کھودو، لوگوں نے اس جگہ کو کھودا جو علامات ظاہر ہوئیں اس وقت تھوڑی سی تکلیف محسوس ہوئی اسی اثنا میں اس نے کہا کہ میں اتنی مہارت رکھتا ہوں کہ اگر آپ اجازت فرمائیں تو اس کا نام بتادوں جس نے جادو کیا ہے، لوگوں نے مجھ کو مطلع کیا میں نے کہا کہ اس کو منع کردو ہرگز نام نہ بتائے جس نے جادو کیا ہے۔ میں نے اس کو معاف کر دیا)۔

سوچنے کی بات ہے کہ سحر اور جادو اور اسی قسم کی نفسانی ورزشوں سے جو ایک عام آدمی کے طریقے سے متاثر ہوتے ہوں اور عمل کرنے والے کی دفع سحر کے لیے ان کو بھی ایسی ہی ضرورت ہو، جیسے ایک عام آدمی کو ہوسکتی ہے کیا ان کے متعلق جو گیانہ مشقوں کا شبہ بھی ہوسکتا ہے، اور کچھ سلطان المشائخ ہی کے متعلق سحر کا یہ قصہ نہیں ہے، اسی کے بعد امیر حسن علاء نے لکھا ہے کہ:

''دریں میاں حسن عرضداشتم کہ شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز را نیز سحر کردہ بودند، فرمود آرے سحر بر آن آمد وطائفہ را کہ مرتکب ایں حرکت بودند دریافتند'' (میں نے عرض کیا کہ حضرت شیخ الاسلام فرید الدین پر بھی جادو کیا گیا تھا، آپ نے فرمایا کہ ان پر جادو کیا گیا اور جس جماعت کی یہ حرکت تھی اسے لوگوں نے معلوم کرلیا)۔

آگے طویل قصہ ہے کہ اجودھن کے والی نے ان ساحروں کو گرفتار کر کے حضرت شیخ کبیر شکر گنج کے پاس بھیجا آپ نے سب کو بخش دیا اور حاکم سے سفارش کی کہ ان کو چھوڑ دیا جائے، اس واقعہ

کے ذکر کرنے سے میری غرض یہ بھی ہے کہ خود سرکار دو عالم ﷺ کے متعلق بھی بعض صحیح روایتوں میں جو آتا ہے کہ آپ پر سحر کیا گیا تھا لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک تو یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اس پر یچولزم، مسمریزم وغیرہ ساحرانہ اعمال کا جو شبہ خواہ مخواہ دلوں میں ایسی ہستیوں کے متعلق ہوتا ہے جن کی ساری کرامت یا سارا معجزہ تعلق باللہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا، اس قسم کے واقعات سے اسی شبہ کی تردید قدرت کی طرف سے ہوتی ہے۔

نجوم السماء شیعہ علما کی تاریخ ہے اس کے مصنف مولوی میرزا محمد علی ہیں، جن کے نام کے آگے دوسطروں کے طویل القاب لکھے ہوئے ہیں، یعنی شیعوں کے کوئی مستند عالم ہیں، انھوں نے مذہب امامیہ کے ایک عالم شیخ حر عاملی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شیخ حر عاملی صد سالہ اثنا عشریہ فی ردصوفیہ آوردہ کہ جمعی شیعہ انکار برصوفیہ داشتہ اند وتکفیر ایشاں نمودہ اند ردرد ابادہ مذہب ایشاں از ائمہ معصومین علیہم السلام نقل کردہ اند''۔ (نجوم السماء، ص۳۲)۔

(شیخ حر عاملی نے رسالہ ''اثنا عشریہ فی ردصوفیہ'' میں لکھا ہے کہ تمام شیعہ، صوفیاء کا انکار کرتے ہیں اور ان کی تکفیر کرتے ہیں اور اپنے مذہب کی روایتیں ائمہ معصومین علیہم السلام سے نقل کرتے ہیں)۔

ان ہی شیعی مولویوں میں صدر شیرازی المشہور بہ صدرا بھی ہیں، چونکہ وہ صوفیوں کے معتقد ہیں اس لیے طبقہ شیعہ میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے، ان کے بیٹے ابراہیم نامی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

''میرزا (ابراہیم) از علما متبحرین وبخلافِ پدر خود صدرالدین شیرازی سالک سلک حق ویقین بود، یہ بھی لکھا ہے کہ ابراہیم کی پیدائش ملاصدرا کے مصداق یخرج الحی من المیت بود۔ص۸۸۔

''ہرگاہ در مجلس شیخ بعضے ازاں فرقہ حاضر شدے بعد از بیروں رفتن او جناب شیخ بہ تطہیر فرش امری فرمودَ''۔ص۳۳ (جب کبھی شیخ کی مجلس میں صوفیوں میں سے کوئی حاضر ہوتا تو اس کے چلے جانے کے بعد شیخ موصوف فرش کو پاک کرنے کا حکم فرماتے تھے)۔

ہندستان کی عظمت، مجدد الف ثانی:

اسلامی ممالک نے مجدد الف ثانی کے مکتوبات کو جس نظر سے دیکھا ہے، اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے فارسی خطوط کا عربی زبان میں ترجمہ فاران (روس) کے ایک مہاجر مکہ عالم ملا مراد نے کیا۔ سلطان عبدالحمید خاں خلیفۃ المسلمین ترکی مرحوم کے عہد میں بغداد کے ایک عالمِ جلیل شہاب محمود آلوسی نے نو جلدوں میں روح المعانی کے نام سے جو قیمتی معلومات سے مملو تفسیر لکھی، بہ کثرت

اس تفسیر میں آپ کو مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ان فارسی خطوط کے اقتباسات عربی شکل میں نظر آئیں گے۔

یوں ہی حضرت شاہ ولی اللہ کی تالیفات بدیعہ، خصوصا حجۃ اللہ البالغہ کے متعلق بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم اسرار الدین میں یہ کتاب اپنی آپ نظیر ہے، متعدد بار مصر میں اس کا شائع ہونا خود اس کتاب کی افادیت کی دلیل ہے، اور شاہ صاحب کے بعد مسلسل ہندستان کا اسلامی علوم کی طرف جو رجحان بڑھتا رہا، اس نے چودھویں صدی تک پہنچتے ہوئے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی علوم کے متعلق ہندستانی علما اسلام کے خدمات کو اتنا وزنی کر دیا ہے۔

قرآن کا ایک بڑا عمیق اور گہرا علم جس پر اس وقت تک بہت کم کام ہوا ہے وہ قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کا مسئلہ ہے۔ سب سے پہلے اس سلسلہ میں جو چیز، یعنی نویں صدی کے ابتداء میں پیش ہوئی وہ ہندستان ہی کے ایک عالم حضرت شیخ علی المہائمی کا کارنامہ ہے یعنی اپنی تفسیر تبصیر الرحمٰن نامی میں علامہ مہائمی نے قرآن کے اس پہلو پر بحث کرنے میں بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے اور ان کی تفسیر کی امتیازی صفت یہی شمار ہوتی ہے۔

مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر ''نظام الفرقان'' میں انھوں نے آیات قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی۔

اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انگریزی زبان میں بھی ''اسلامیات'' کے متعلق اس وقت تک جتنا اچھا مواد مسلمانوں کے قلم سے منتقل ہوا ہے اس میں بھی سب سے بڑا حصہ ہندستان ہی کا ہے، جس کا اندازہ آپ کو مصر کے جدید مصنفین کی کتابوں سے ہو سکتا ہے اس سلسلہ میں زیادہ تر ان کے اقتباسات اور شواہد سید امیر علی اور صلاح الدین خدا بخش مرحوم کی کتابوں سے لیے گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندستانی مسلمان اہل قلم کے سوا گویا انگریزی بلکہ شاید کسی دوسری مغربی زبان میں بھی دوسرے ممالک کے مسلمانوں نے کوئی کام ہی نہیں کیا ہے۔

دنیا کی پہلی انسائیکلو پیڈیا ہندستان میں لکھی گئی:

اس سلسلہ میں بارہویں صدی کے وسط میں ایک کام ہندستان کا وہ ہے جسے ہم چاہیں تو اسلامی علوم کی انسائیکلو پیڈیا یا دائرۃ المعارف قرار دے سکتے ہیں۔ میں حضرت شیخ محمد علی بن علی التھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''کشاف اصطلاحات الفنون'' کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ عربی دائرۃ المعارف

کے مصنف بستانی نے بھی ''التھانوی'' کے عنوان سے مولانا کی اس کتاب کا وزن دار الفاظ میں ذکر کیا ہے (دیکھیے جلد ششم، ص ۳۴۷، دائرۃ المعارف للبستانی)۔

کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کتاب دنیا کی انسائیکلو پیڈیاؤں میں سب سے پہلی انسائیکلو پیڈیا ہے، بشرطیکہ چینی اور جاپانی انسائیکلو پیڈیاؤں کو مستثنیٰ کر دیا جائے کیوں کہ وہ خصوصاً چینی انسائیکلو پیڈیا تو دیوار چین کی طرح دنیا کے عجائبات میں ہے، لیکن ان کے سوا یورپ میں بھی جو انسائیکلو پیڈیائیں لکھی گئی ہیں، جہاں تک میرا خیال ہے التھانوی کی اس عجیب وغریب کتاب کے بعد ہی مرتب ہوئی ہیں۔ انگریزی، فرنچ، وغیرہ مغربی زبانوں میں انسائیکلو پیڈیا کا رواج اٹھارویں صدی کے وسط میں ہوا۔

البتہ فارسی میں ایک کتاب نفائس الفنون فی عرائس الفنون ضرور ایسی کتاب ہے جسے حادیات اور محیطات کے سلسلہ میں جگہ دی جا سکتی ہے، لیکن پھر بھی کشاف اصطلاحات الفنون کے مقابلہ میں یہ کتاب نہیں آسکتی۔ امام رازی نے بھی ایک کتاب حدائق الانوار فی حقائق الاسرار نامی، ترکی بادشاہ کے نام سے لکھی ہے کہتے ہیں کہ اس کتاب میں ساٹھ علوم کے مسائل جمع کر دیے گئے ہیں۔

اسی کے ساتھ غالباً اس کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ ہندستان (جس سے میں کشمیر وغیرہ کو مستثنیٰ نہیں سمجھتا) کے ایک کشمیری عالم شیخ الاسلام مفتی قوام الدین محمد جن کی وفات ۱۲۱۹ھ میں ہوئی ہے صاحب حدائق حنفیہ نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ آپ نے ''کتاب صحائف سلطانی ساٹھ علم میں تصنیف کی'' (ص ۲۶۴) واللہ اعلم بالصواب۔ یہ امام رازی کی کتاب سے ماخوذ ہے یا شیخ الاسلام نے کوئی الگ کتاب لکھی ہے بہر حال ہے تو ہندستان کی یہ بھی ایک چیز۔ اس طرح واجد علی خان کی کتاب مطلع العلوم ومجمع الفنون کا ذکر بھی کروں گا۔

کشاف اصطلاحات الفنون کے بعد دوسری چیز اس سلسلہ میں جو قابل ذکر ہے وہ وہی ہے جس کے متعلق میں نے پہلے بھی وعدہ کیا ہے، فیضی کی غیر منقوط تفسیر سواطع الالہام ہے، فیضی اور ابوالفضل دونوں کے پدر بزرگوار کے دینی پہلو کے متعلق جو میرے خیالات ہیں مختلف حیثیتوں سے بغیر کتمان کے میں اس کا ذکر کرتا چلا آیا ہوں۔

☆☆☆

گیلانی موضوعات (ابجدی)

اردو، ۲۱
اسلام، جوڑنے والا، ۲۲
اکبری عہد، ۱۷
امیر خسرو، ۳۲
آٹھوی صدی ہجری کا نصاب تعلیم، ۳۴
بچوں کا حفظ قرآن، ۱۹
بحر العلوم، ۱۴
برکات احمد ٹونکی، ۱۲
بلگرام کے دل والے، ۶۲
بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں، ۱۰
بیگڑہ، ۲۰
پابوسی، ۴۰
پیری مریدی کا مقصد، ۴۱
تبلیغ، گا بجا کر، ۲۱
ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو...، ۲۷
تغلق اور مولانا زراوی، ۵۸
ثناء اللہ پانی پتی، قاضی، ۱۶
جادو، ۶۳
جھجھر کے نجف علی، ۱۷
جیتل، ۳۲
چھتاری: حفظ قرآن، ۱۹
حسن بجری، ۳۴
حمید الدین ناگوری، ۲۴
خانقاہ محتاجوں کا سہارا، ۵۱
خانقاہ، ۳۱
خلیل شاہزادہ کا حفظ قرآن، ۲۰
خواجہ اجمیری کی قبر، ۲۶
دکن میں تصوف، ۳۳
دنیا کی پہلی سائکلو پیڈیا، ہند میں، ۶۶
روشن الدولہ کی ستر ہزار رقم، ۴۶
زین الدین شیرازی، ۳۴
زین العابدین بہاری، ۱۸
سجدۂ تعظیمی، ۴۲
سلطان المشائخ سے حسد، ۵۴
سلطان المشائخ کا فرمودہ، ۲۴
سلطان المشائخ: حدیث برتر یا فقہ، ۵۶
سلطان جی مرید ہونے والے، ۳۸
سلطان جی، ۳۶
سماع پر مباحثہ، ۵۴
سماع میں تالی بجانے کی ممانعت، ۳۵
شاہ بولن کا دسترخوان، ۴۸
شاہ بھیک، ۴۵
شاہ بھیک: تین لاکھ کا مصرف، ۴۷
شکر و صبر، ۲۸
شیخ عزیز اللہ کی داد و دہش، ۴۹
طلبہ اساتذہ رشتے، ۱۲
عبد الحی فرنگی محلی، ۱۵
علم سے علم الیقین تک، ۲۰
عورتیں، نماز با جماعت، ۳۵
غریبوں سے ہمدردی، ۵۰
غریبوں کا تعلق خانقاہوں سے، ۴۳
غلط عمر: مجبور جھوٹ، ۱۶
غیاث الدین، ۲۶
غیر ملکی زبانیں سیکھئے، ۱۷
فاتحہ، ۳۰
مانڈو، ۲۵
مجدد الف ثانی کے پوتے کا حال، ۴۸
مدرسہ سے خانقاہ، ۲۰
مزامیر کی ممانعت، ۳۶
منصور لاہوری، شیخ، ۱۴
منیری، ۳۵
میر خورد، ۳۶
ہر قوم راست راہے...، ۲۲
ہندستان کی عظمت، مجدد، ۶۵
ہندو شاہ فرشتہ، ۵۶

☆

خلیل الرحمٰن اعظمی

ایک بھولی بسری طویل ترقی پسند نظم

(ش)

O

کیسے شروع کریں ہم اپنی بات! کسے یقین ہو !! کون اس کا اعتبار کرے !!! یہ خلیل الرحمان اعظمی کے ایک سفر کی روداد ہے ترقی پسندی سے شہرِ ذات تک: خلیل صاحب کی ایک بھولی بسری طویل نظم۔

رو میں ہے، رخشِ عمر! اور، نے ہاتھ باگ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں!! The world is too much with us اور، آس پاس، کہیں بھی، کھانے پینے، بچوں کو پالنے پوسنے کے سوا، کہیں بھی زندگی کی رمق نہیں ملتی۔ یہ رمق اچھے لوگوں کی سنگت سے آجاتی تھی۔ مگر اب کہ بڑوں، بزرگوں کی صحبت عنقا ہوتی جارہی ہے، بزرگوں نے ہمیں جو کچھ میراث میں دیا ہے، اس میں سے جو ایسا کچھ ملے جس سے دل روشن ہوں، اور ذہن کھلیں، جانے والوں نے، ہمارے لیے اپنے دل جلائے کہ روشنی ہو جائے، ہم اندھیرے کے ایسے عادی ہو گئے کہ روشنی آئے بھی تو اسے پہچانتے تک نہیں! ایسے میں روشنیوں کی ان لکیروں، بین السطور زیرلب اشاروں، اور ان سب سطروں میں پھیلے دستگیر نقطوں کو سمیٹ سماٹ کے آپ تک لے آئیں : ایسی ساری چیزیں جو آپ کے لئے فوراً تو ناقابلِ یقین ہوں، مگر پھر سیہ بر سفید دیکھ کر یقین آ ہی جائے : ایسی ساری چیزیں کم سے کم وقت میں آپ تک پہنچا دیں، بس یہی معروض ہے!

●

اعظمی کی کتاب ''آئینہ خانے میں'' : 1950 ایک بھولی بسری یاد!

اس سیریز کا ایک نام **نقش ونگارِ طاقِ نسیاں** ہوسکتا تھا۔ مگر زیادہ صحیح **عجائب لٹریچر** جچتا ہے۔ اس سے **منشا** کچھ اور رہا ہے۔ مگر ایک **منشا** یہ بھی نکلتا ہے کہ فضا کا اندھیرا چھٹتا جائے۔

جی چاہتا ہے ہم اپنی اس پیشکش کا عنوان رکھیں، **عجائب لٹریچر: کسے یقین ہو! کون اس کا اعتبار کرے! Simply unblievable**؛ مگر فی الحال جو ہے وہی سہی!

اب یہ کس کو یاد ہوگا، بات بھی تو ۶۵ برس پرانی ہے جب ادب کی ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی بھی اس میں تن من دھن سے شریک ہو گئے۔ علی گڑھ کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری بھی ہو گئے تھے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، ڈاکٹر علیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما، ان

کے پیروں مرشدوں میں تھے : اس عہد کی یہ شاعری ہے : ایک طویل نظم، جو کتابی شکل میں ۱۹۵۰ء میں ''آئینہ خانے میں'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

منیر شکوہ آبادی کا ایک مصرعہ ہے: ''شرمندہ ہیں ہم اپنے کمالوں کے سامنے'' : تو ہوا یہ کہ خلیل صاحب نے بھی اپنے اس 'کمال' سے شرمندہ ہو کے اس کو **عاق** کر دیا، اور جب ۱۹۷۰ء میں پروفیسر عیدن (اس زمانے میں شعبۂ اردو کے طالب علم اور اب مَوریشس کے اکابر میں!) نے علی گڑھ میگزین کا ایک خاص نمبر نکالا جو علی گڑھ کے اس وقت کے اہم شعراء کے اپنے کئے ہوئے انتخاب کلام اور اپنی آپ بیتی کے لئے مختص تھا، تو اس میں جب اپنی کتابوں کے نام دینے لگے تو اس کتاب کا نام غائب کر دیا۔

۱۹۷۰ء کی یہ آپ بیتی چلتے چلتے، ملاحظہ فرمالیں :

''میں اگست ۱۹۲۷ء میں اعظم گڑھ (یو. پی.) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ میرے والد مولانا محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بانیٔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، عربی و فارسی کے جید عالم تھے اور علوم اسلامی کے سلسلے میں ان کا نام ہندستان کے علما میں بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ میری ابتدائی تعلیم مشرقی انداز کی ہوئی۔ انگریزی تعلیم ساتویں درجے سے شبلی کالج اعظم گڑھ میں شروع ہوئی۔ اسکول کے زمانے میں جن اساتذہ سے بطور خاص متاثر ہوا ان میں بشیر احمد صدیقی صاحب بھی ہیں جو اس زمانے میں کالج کے پرنسپل تھے۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کی تحریروں سے متاثر ہو کر میں ۱۹۴۵ء میں علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا۔ ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۴۹ء میں بی.اے. اور ۱۹۵۱ء میں ایم.اے (اردو) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ ایم.اے کے امتحان سے فارغ ہوتے ہی مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا جس کا سلسلہ ۱۹۵۳ء تک جاری رہا۔ زمانۂ طالب علمی میں انجمن اردوئے معلیٰ کا سکریٹری رہا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا بھی۔ علی گڑھ میگزین کا مدیر بھی رہا۔

''شاعری کی ابتدا ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ سب سے پہلی نظم ''نقشِ ناتمام'' تھی جو اسی زمانے میں نیا دور (بنگلور) میں شائع ہوئی۔ ۱۹۴۸ء سے تنقید کی طرف بھی متوجہ ہوا اور آتش کی شاعری پر ایک طویل مقالہ لکھا جو بالاقساط ''نگار'' میں شائع ہوا۔

''۱۹۵۳ء میں شعبۂ اردو میں استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں ترقی پسند تحریک پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھا جس پر ڈاکٹریٹ تفویض کی گئی۔ ۱۹۶۲ء میں میرا تقرر ریڈر کی حیثیت سے ہوا اور تا حال یہی خدمت انجام دے رہا ہوں۔

(۳)

''جو کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) کاغذی پیرہن: پہلا مجموعہ کلام (۲) فکر و فن: تنقیدی مضامین (۳) مقدمہ کلام آتش :تنقید (۴) نوائے ظفر: تنقید (۵) نیا عہد نامہ: دوسرا مجموعہ کلام (۶) زاویۂ نگاہ: تنقیدی مضامین''۔

مندرجہ بالا سطور ماخوذ ہیں علی گڑھ میگزین ۱۹۷۰ء، مرتّبۂ ڈاکٹر عنایت حسین عیدن سے۔

''کتابیں جو اب تک شائع ہو چکی ہیں'' ان کی تفصیل خلیل صاحب کی زبانی، آپ نے ملاحظہ فرمالی۔ مگر ایک لحاظ سے یہ فہرست ادھوری رہ گئی یعنی اس میں **''آئینہ خانے میں''** کہیں درج نہیں کی گئی۔ چھ مندرجہ بالا کتابوں میں ہم اضافہ کرتے ہیں :

(۷) خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضامین، مرتّبہ ڈاکٹر شہریار۔ اور پھر (۸) خلیل صاحب کی مذکورہ شائع شدہ کتاب، طویل نظم : آئینہ خانے میں، ۱۹۵۰ء۔ (۹) کلیات خلیل الرحمٰن اعظمی مرتّبۂ ڈاکٹر شہریار۔

●

اب آیئے **عجائب لٹریچر** کی طرف۔ اور ہم پھر دوہرائیں :

ع کسے یقین ہو کون اس کا اعتبار کرے!

اس کتاب کی روشنی میں ۱۹۵۰ء کے خلیل الرحمٰن اعظمی کو از سر نو روشناس کرانے کا شرف حاصل کیا جائے۔ پہلے اس کا نثری حصہ، پھر منظوم حصہ؛ اور دونوں ملا کے **اُس عہد کا خلیل الرحمٰن اعظمی**، جسے پڑھ کے آپ کو کچھ مزہ تو آئے گا، لیکن اس سے زیادہ حیرت ہوگی، تعجب ہوگا! لہو کی گردش تیز تر ہو جائیگی! ملاحظہ ہو :

''(ترقی پسندوں سے پہلے کی شاعری) میں سوائے مصرعوں کی تراش خراش، فنّی کرتب اور چونکا دینے والے اندازِ بیان کے کچھ نہیں ہے۔ نہ تو اس میں اجتماعی احساس ہے اور نہ اس کا تعلق اس وسیع دنیا اور اس رواں دواں زندگی سے ہے جہاں لاکھوں آدمی سر سے کفن باندھے ایک نئی زندگی پر فتحیاب ہونے کے لیے آگے بڑھے جا رہے ہیں۔ ہماری نظمیں اب بھی غزل کے چکر سے نہیں نکل سکی ہیں۔ اکثر ترقی پسند شعراء بھی نظم نما غزلیں کہتے ہیں، یا مختلف غزلوں کو ملا کر ایک نظم بنا دیتے ہیں۔ نظم میں جس پھیلاؤ، وسعت اور مرکزیت و تسلسل کی ضرورت ہے آج کل صرف اُنھیں شعراء کے یہاں ملتا ہے جن کا شعور نیا ہے اور جو آج جمہور کی آواز سے ہم آہنگ ہیں۔ آج جو شاعر حال اور مستقبل سے پورے طور پر ہم آہنگ ہیں وہ سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، کیفی اعظمی وغیرہ ہیں۔ اس لیے کہ ان کی

شاعری میں شکست خوردگی ،فراراور گھٹن کے بجائے زندگی کی نئی طاقت اور کس بل کا احساس ہوتا ہے۔ اس شاعری کو پروپیگنڈہ کہہ دینا تو آسان ہے لیکن اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے ذہن کو نیا بنانے کی ضرورت ہے۔اس شاعری کو سمجھنے کے لئے ڈرائنگ روم کی فضا سے نکل کر کھلی ہوئی ہوا میں سانس لینا پڑے گا۔مصرعے گڑھنے والی شاعری مریض ذہنوں کے لئے تفریح طبع کا سامان فراہم کر سکتی ہے لیکن جمہور میں پہنچ کر یہ شاعری پھیکی اور بے جان معلوم ہونے لگتی ہے۔

''میری تخلیق میں میری زندگی کے جن تجربات کا کسی نہ کسی طرح عکس پڑا ہے ان میں سے دو ایک باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ میں ایک بہت گھٹے ہوئے مذہبی ماحول میں پیدا ہوا تھا،اس لئے سب سے پہلی میری شعوری بیداری مذہب کے خلاف بغاوت سے شروع ہوتی ہے۔دوسرا اہم واقعہ دہلی کے فسادات کا ہے جب میرے جسم پر آٹھ زخم آئے تھے اور بڑی مشکلوں کے بعد میری جان بچی تھی۔تیسری چیز میری جیل کی زندگی ہے جب میں فروری ۱۹۴۹ء میں طالب علموں کے ایک جلسے میں تلنگانہ پر نظم پڑھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور تین مہینے تک میں نے ان ساتھیوں کے ساتھ زندگی گزاری جو اپنے خون سے نئے دور کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

''آخر میں اُن لوگوں کے نام لینا چاہتا ہوں جن سے مل کر میں نے کچھ حاصل کیا ہے اور اپنے شعور کو جلا دی ہے۔ان میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما،انا بھاؤ ساٹھے، کھیم سنگھ ناگر اور **شاد عارفی** شامل ہیں''۔

●

طویل نظم ''آئینہ خانے میں'' سے مقتبس مندرجہ بالا تحریر، جسے مقدمہ کتاب کہہ لیجئے ،**نظریاتی** مقدمہ تو ہے ہی، ۱۹۵۰ء کی تحریر کی حیثیت سے، ڈاکٹر عیدن والی ۱۹۷۰ء کی آٹو بایوگرافی کی تمہید بھی ہو جاتی ہے،اور اس طرح یہ دونوں تحریریں مل کے آپ بیتی کے طور سے ایک دوسرے کا تتمہ بن جاتی ہیں۔

نظریاتی مقدمہ ملاحظہ میں آچکا۔اب وہ **نظریاتی نظم** (اقتباساً) ملاحظہ ہو جو اُس طوفانی دور کی یادگار ہے : ادب و زندگی کے میدان کے ایک مخلص مسافر کا پہلا پڑاؤ !

(ش)

خلیل الرحمان اعظمی

ایک بھولی بسری طویل نظم کی دریافت

''ہم نہیں مانیں گے
سرمایہ پرستی کی اس آزادی کو
ہم تو دیوانے ہیں!
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ یہ چند سیہ کاروں کا اک دھوکا ہے/
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک اُجالا نہیں، یہ آگ لگی ہے گھر میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ تصویر اُبھاری گئی ایوانوں کی کٹیاؤں کے پس منظر میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ تم پہلی وہ زنجیر بدل لائے ہو
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ چالاک شکاری کی کمیں گاہ ہے اب لندن میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ اب تیرگی آزاد پھرا کرتی ہے اس آنگن میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ یہ نور نہیں جسم پہ ظلمت کے اُبھر آئے ہیں کچھ کوڑھ کے داغ!

''ہم تو دیوانے ہیں، دیوانے ہیں، دیوانے ہیں
دوڑ و اب لے کے ذرا طوق و سلاسل دوڑو
آج اس جیل کی دیوار کو کچھ اور بھی اونچا کر دو
ہم نہیں مانیں گے سرمایہ پرستوں کی اس آزادی کو
ہم نہیں مانیں گے کاغذ پہ چھلکتے ہوئے پیمانوں کو
ہم نہیں مانیں گے پردے پہ چمکتے ہوئے اس سورج کو
جس کو تم لائے ہو تاریکی کے گہواروں سے
اپنی جنتا کا لہو بیچ کے انگلینڈ کے بازاروں سے
جس کو تم لائے ہو، جمہور کی آزادی کا سودا کر کے

جس کو تم لائے ہو، اجداد کی تہذیب کو رسوا کر کے
مادرِ ہند کی گردن پہ چھری پھیر دی تم نے ہی تو اے جلّاد دو
تم نے ہی ملک کو تقسیم کیا
تم نے ہی میرے دھڑکتے ہوئے اس قلب کو دو نیم کیا!

''رہزنو! ہند کی عظمت کو لٹانے والو
تم نے تقسیمِ وطن کے لیے سر جوڑ کے سازش کی تھی
اور انگریز کے قدموں کے تلے روندی ہوئی جنتا کو
کتنی صدیوں کی دبائی ہوئی، کچلی ہوئی اس جنتا کو
سالہا سال کی بھٹی میں سلگتی ہوئی اس جنتا کو
یہ دلاسا دیا، آزاد ہوا اپنا وطن
آج رخصت ہوئی وہ بادِ خزاں، جسم میں چبھتی ہوئی وہ بادِ سموم
آج نوخیز بہاروں سے لہک جائے گا یہ سارا چمن
تم نے اس درد کی ماری ہوئی مخلوق سے یہ جا کے کہا
روک لو اپنے دمکتے ہوئے اس آنسو کو
بھر لو سینے میں مچلتی ہوئی اس خوشبو کو
کہہ دو یہ قلبِ تپاں سے کہ مسرّت کا ترانہ گائے
کہہ دو یہ چشمِ فسردہ سے کہ جنت کا فسانہ دوہرائے!

''چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی انگڑائی لی
چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی ناسور پہ مرہم رکھا
چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی اس جلتی ہوئی آگ پہ پانی چھڑکا
چند لمحوں کے لئے ہم نے بھی نادیدہ خلاؤں کا سہارا ڈھونڈا
لیکن اس طرح کہ جیسے کوئی خوابوں کا محل گر جائے

جیسے آنکھوں سے کبھی اپنی، تخیل کے مناظر اُڑ جائیں
دیکھتے دیکھتے نوخیز بہاروں کا نشہ ٹوٹ گیا
جسم میں چبھنے لگی آ کے وہی بادِ سموم
ایک ہی پل میں وہ فردوس سرابوں میں کہیں ڈوب گئی
تم نے تولا کے ہمیں پھینک دیا اپنی بنائی ہوئی اس دوزخ میں
ایک ہنگامہ ہوا، شور اُٹھا، نعرے گونجے
چیخ چیخ اُٹھے یہ انسان جفاؤں سے بنائی ہوئی اس دوزخ میں!

''لیکن اے سنگ دلو، سنگ دلو، سنگ دلو!
تم کو اس درد کی، اس چیخ کی پروا کیا تھی؟
تم کو اس خون میں ڈوبی ہوئی تاریخ کی پروا کیا تھی؟
تم تو دہلی کے شبستانوں میں بُنتے رہے خواب
خلش درد سے ان آنکھوں کی نیند اُڑتی رہی
اوس پڑتی رہی ارماں پہ اُمید اُڑتی رہی
تم تو چنتے رہے دیواروں پہ، محرابوں میں رنگین چراغوں کی قطار
اشک کی بوند مری پلکوں میں آ آ کے مگر چبھتی رہی
تم تو پیتے رہے محفل میں یہ بہتی ہوئی آگ
تم تو پیمانوں کو ٹکراتے رہے، شعلوں کو بھڑکاتے رہے
تم تو گندم کے حسیں سانولے دانوں کو جلاتے رہے اک بھٹّی میں
بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی مخلوق ترستی رہی اک روٹی کو
کھیت تکتے رہے اور سامنے دم توڑ رہا تھا وہ ہلوں کا مالک
لہلہاتی ہوئی فصلوں کے لیے جس کا پسینہ ٹپکا
اس کا گھر بھی رہا محروم اناجوں کی مہکتی ہوئی اک بالی سے
کارخانوں میں تو بُنتے رہے، لگتے رہے یہ اطلس و کمخواب کے ڈھیر

ریل پر لد کے یونہی جاتے رہے چاندی کے ٹکڑے لیکن
کارخانوں کا یہ مزدور ٹھٹھرتا رہا، سرما کی ہواؤں سے یونہی لڑتا رہا
تم تو گاتے رہے بربط پہ اہنسا کا ترانہ لیکن
سطحِ جمنا پہ بلکتے ہوئے انسانوں کا خوں بہتا رہا
تم تو سکھلاتے رہے دھرم کی باتیں، یوں ہی دیتے رہے تہذیب کا اخلاق کا درس
نام پر مذہب و تہذیب کے سر کٹتے رہے
عصمتیں لٹتی رہیں، آدم و حوّا کو برہنہ کر کے
شاہراہوں پر بڑی شان سے مذہب کے خداؤں نے تماشہ دیکھا
نوکِ خنجر پہ اُچھالے گئے بچوں کے تڑپتے لاشے
بستیاں جلتی رہیں خون کے سیلاب آئے
تم نے وہ آگ لگائی ہے کہ تپتی ہوئی دوزخ بھی ٹھٹھک کر رہ جائے
تم نے وہ فتنہ اُٹھایا ہے کہ ابلیس بھی شرما جائے!

"آج یخ بستہ تمنائوں کو پھر تڑپا دو
آج اس آگ سے ویرانوں کو پھر مہکا دو
قہقہے زور سے اس طرح لگاؤ کہ زر و سیم کے یہ سارے خدا کانپ اُٹھیں
ظلم اور جور کی یہ آتشیں تلوار بھی پانی ہو جائے
اے مری ارضِ مقدس کے پرستارو، اُٹھو لیکے نئی ایک کمند
آسماں آج زمیں پر بھی اُتر سکتا ہے
نئے انداز سے یہ عالمِ امکاں بھی سنور سکتا ہے
نورِ ایماں کے نگہبانو، مرے بت شکنو!
بڑھ کے تاریک صنم خانوں کو مسمار کرو
سنگ و آہن کے خداؤں کو نگوں سار کرو
چھین لو ہاتھ سے ظلمت کے یہ اُٹھتی ہوئی باگ

چھین لو سازِ شکستہ سے یہ ابلیس کا راگ
آج گرتے ہوئے آدم کو سنبھالو بڑھ کر
آہنی گرز اُٹھا لو بڑھ کر
اس طرح وار کرو اس طرح تیز یہ رہوار کرو
موت کا دیوتا تھرّا جائے
ہاتھ سے اس کے جہنم کے یہ کوڑے گر جائیں
اے مرے ہم سفرو! ایک نئے حشر کے پیغامبرو
پھونک دو بڑھ کے کوئی صور کہ آدم کی زمیں جاگ اُٹھے
آج دیرینہ خداؤں سے بھی لینا ہے حساب
آج شیطان کے چہرے سے اُلٹنی ہے نقاب
آج کہہ دو یہ شبستاں کے پریزادوں سے
کہہ دو یہ قصرِ طلسمات کے شہزادوں سے
کہہ دو سرمایہ کے بپھرے ہوئے جلّادوں سے:
بُجھنے والے ہیں شبستاں میں ستاروں کے کنول''۔

☆

پس گفتار

اب ۱۹۷۰ء آ گیا۔ زمانہ بدلتا گیا اور خلیل صاحب کی زندگی اور ذہن میں بھی خاصے بدلاؤ آتے گئے۔ اور اپنا آخری پڑاؤ عیدن میگزین میں محفوظ کر دیا۔ تو ملاحظہ ہو ڈاکٹر عنایت حسین عیدن کے توسط سے شاعر کا اپنا انتخاب (نظمیں بھی، غزلیں بھی)، وفات سے سات آٹھ سال قبل؛ پہلے نظمیں پھر غزلیں :

نظمیں

<u>دوسری ملاقات</u> :

کہہ نہیں سکتا کہاں سے آئے، تم کون ہو

ایسا لگتا ہے کہ یہ صورت ہے پہچانی ہوئی
خاک میں روندا ہوا چہرہ مگر اک دل کشی
آنکھ میں ہلکا تبسم، دل میں کوئی ٹیس سی
پاؤں سے لپٹی ہوئی بیتے ہوئے لمحوں کی گرد
پیرہن کے چاک میں گہرے غموں کی تازگی
پرسشِ غم پر بھی کہہ سکنا نہ اپنے جی کا حال
کچھ کہا تو بس یہی کہ تم پہ کچھ بیتی نہیں
راہ میں چلتے ہوئے ٹھوکر لگی اور گر پڑے
یونہی کانٹے چُبھ گئے ہیں، پھٹ گئی ہے آستیں
یاد آتا ہے کہ تم مجھ سے ملے تھے پہلی بار
اک کہانی میں نہ جانے کس کی تھی لکھی ہوئی
اور میں نے اس طرح کے آدمی کو دیکھ کر
دل میں سوچا تھا کہ اس سے آج کرلوں دوستی!

سوداگر :

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں، کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا
میری آرام جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو

آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لیے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا؟
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون ہوں۔

ذاتیات :

جو مجھ پہ بیتی ہے اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
جو دکھ اٹھائے ہیں، جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں، ان کو کہنے کا مجھ کو یارا نہیں ہے، میں
دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں، داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگذشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے، لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں ٹوک کر مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے!

لمحے کی موت :

کچھ دور تلک
کچھ دور تلک
دو لمحہ اُس کے ساتھ چلا
جب اس نے دل میں یہ سوچا
یہ گرتی دیواریں، یہ دھواں

یہ کالی چھتیں، یہ اندھے دیے
سنولائے ہوئے سارے چہرے
اب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے
جب نگر نگر کی سیاحی
ان ٹیڑھی سڑکوں کی آوارہ گردی، ہنستے جسم، کھنکتے پیالوں کی موسیقی، اس کے کام نہ آئی
اُس نے کہا: اب لوٹ چلیں
اک شام وہ اپنے گھر پہنچا
اور اُس سے ملنے کو آئے
سب ساتھی اس کے بچپن کے
سب کہنے لگے:
اُن جگمگ کرتے شہروں کا
کچھ حال بتاؤ، اپنے سفر کی کچھ روداد کہو، پر وہ خاموش رہا:
وہ دیکھ رہا تھا اُس میلے سے طاق کو
جس پر ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی۔

میں گوتم نہیں ہوں :

میں گوتم نہیں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی کوئی گیان ہوگا

مگر
جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سُلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے۔

بدلتے موسم :

وہی پیارے مدھر الفاظ، میٹھی رس بھری باتیں
وہی روشن سا پہلا دن، وہی مہکی ہوئی راتیں
وہی میرا یہ کہنا تم بہت ہی خوبصورت ہو
تمہارے لب پہ یہ فقرہ کہ تم ہی میری قسمت ہو
وہی میرا پُرانا گیت تم بِن جی نہیں سکتا
میں ان ہونٹوں کی پی کر اب کوئی مے پی نہیں سکتا
یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر اس سے جی گھبرا بھی جاتا ہے
اگر موسم نہ بدلے آدمی اُکتا جاتا ہے
کبھی یونہی سہی میں اور کو اپنا بنا لیتا

تمہارے دل کو ٹھکراتا، تمھاری بددعا لیتا
کبھی میں بھی یہ سنتا تم بڑے ہی بے مروت ہو
کبھی میں بھی یہ کہتا تم تو سرتاپا حماقت ہو
اب آؤ یہ بھی کر دیکھیں تو جینے کا مزا آئے
کوئی کھڑکی کھلے اُس گھر کی اور تازہ ہوا آئے۔

غزلیں

یہ الگ بات کہ ہر سمت سے پتھر آیا
سربلندی کا بھی الزام مرے سر آیا
زندگی چھوڑنے آئی مجھے دروازے تک
رات کے پچھلے پہر میں جو کبھی گھر آیا
بس دعا ہے کہ الٰہی یہ کوئی خواب نہ ہو
کوئی سایہ مرے سائے کے برابر آیا
بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا
کیا کہیں اب تو یہ عادت نہیں جاتی ہم سے
جھوٹ بھی بولے تو سچ بن کے زباں پر آیا
میں نہیں حق میں زمانے کو بُرا کہنے کے
اب کے میں کھا کے زمانے کی جو ٹھوکر آیا
سُرخی مے بھی ٹھہرتی نہیں ہر چہرے پر
بوالہوس بھی اسی مے خانے سے ہو کر آیا۔

●

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

سونا ہوں کُرید کر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں
لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں
یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی
دراصل میں غم سے آشنا ہوں
صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں
دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں میں دعا ہوں
کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں
تقدیر جنوں پہ چُپ رہا ہوں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں
ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں۔

●

سوتے سوتے چونک پڑے ہم، خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو، ایسا اک رستہ دیکھا
دُور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جُلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرہ دیکھا
سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا
سوکھی دھرتی سُن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو

پیاسی آنکھیں بول اُٹھتی ہیں ہم نے اک دریا دیکھا
آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتا دیکھا
چاندی کے سب جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے اُن کا بھی سایہ دیکھا
جب سے مل کر لوٹے ہیں اب ان کی بات نہیں کرتے
جن کا نام بہت سنتے تھے، ہم نے ان کو جا دیکھا
رات وہی پھر بات ہوئی نا، ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے سے شور سا اک اٹھتا دیکھا۔

●

کہاں کھو گئی روح کی روشنی
بتا میری راتوں کو آوارگی!
میں جب لمحے لمحے کا رس پی چکا
تو کچھ اور جاگی مری تشنگی
اگر گھر سے نکلیں تو پھر تیز دھوپ
مگر گھر میں ڈستی ہوئی تیرگی
غموں پر تبسم کی ڈالی نقاب
تو ہونے لگی اور بے پردگی
مگر جاگنا اپنی قسمت میں تھا
بلاتی رہی نیند کی جل پری
جو تعمیر کی کُنج تنہائی میں
وہ دیوار اپنے ہی سر پر گری
نہ جانے جلے کون سی آگ میں
ہے کیوں سر پہ یہ راکھ بکھری ہوئی

ہوئی بارشِ سنگ اس شہر میں
ہمیں بھی ملا حقِ ہمسا یگی
گزاری ہے کتنوں نے اس طرح عمر
بالاقساط کرتے رہے خودکشی
ہیں کچھ لوگ جن کو کوئی غم نہیں
عجب طرفہ نعمت ہے یہ بے حسی
کوئی وقت بتلا کہ تجھ سے ملوں
مری دوڑتی بھاگتی زندگی
جنھیں ساتھ چلنا ہو چلتے رہیں
گھڑی وقت کی کس کی خاطر رُکی
میں جیتا تو پائی کسی سے نہ داد
میں ہارا تو گھر پر بڑی بھیڑ تھی
ہوا ہم پہ اب ان کا سایہ حرام
تھی جن بادلوں سے کبھی دوستی
مجھے یہ اندھیرے نگل جائیں گے
کہاں ہے تو اے میرے سورج مکھی!
نکالے گئے اس کے معنی ہزار
عجب چیز تھی اک مری خامشی۔

●

اور پھر یوں ہوا کہ :

۱۹۵۰ کی **آئڈیالوجی**، ۱۹۷۰ کے آتے آتے خاصی مدھم ہو چکی تھی۔ **نئے آدمی** کی تلاش میں خلیل صاحب نئی وادیوں میں سفر کناں تھے مگر کبھی کبھی پیچھے مڑ کر دیکھتے جاتے تھے شاید ایسا ہو کہ **نیا آدمی** ادھر ہی سے آئے جہاں ۱۹۵۰ء میں وہ کھڑے انتظار کر رہے تھے : کہ'' وہ نیا آدمی آنے والا تھا، اور اس کا ہم کو یقیں تھا، کہ وہ آئے گا! اور اسی سمت سے : بس اسی سمت سے آئے گا۔ پر ہوا یہ کہ : دیر

تک جب نہ ہم کو ملا، آنے والے کا کوئی پتہ! ہم نے پھر زور سے اس کو آواز دی :اے نئے آدمی! اے نئے آدمی۔ پر نہ کوئی پتہ اور نہ کوئی نشاں اور نہ کوئی صدا : نہ اِس اُور سے اَور نہ اُس اُور سے! خلیل صاحب کی جستجو جاری رہی: ۱۹۷۵ء میں وہ کہاں کھڑے تھے، اس نظم میں کچھ کچھ اس کا پتا چلتا ہے: ۱۹۷۵ کے آتے آتے قطعیت کے ساتھ نئے آدمی کی تلاش تو جاری تھی، پرانی آئڈیالوجی کا Rejection بھی بالکل واضح تھا، نئی کی جستجو جاری تھی کہ پیغام سفر آ گیا! بس؛ اب اس فانی دنیا کو چھوڑ کے دوسری اگلی دنیا میں اپنی جستجو جاری رکھو: جستجو جاری ہے، خلیل صاحب کی بھی، اور ان کی تخلیقات جن جن دلوں میں گھر کر چکی ہیں ان کی بھی؛ وہ بھی خلیل صاحب ہی کی جستجو کہلائے گی۔

تو اب چلتے چلتے خلیل صاحب کو ۷۴-۱۹۷۵ء میں ملاحظہ فرمائیں، علی گڑھ میگزین ۱۹۷۳-۱۹۷۴ (جو ۱۹۷۵ میں شائع ہوا) میں شائع شدہ ان کی نظم ''نئے آدمی کی تلاش میں'':

نئے آدمی کی تلاش میں :

اور پھر یوں ہوا
جو پرانی کتابیں، پرانے صحیفے
بزرگوں سے ورثے میں ہم کو ملے تھے
انھیں پڑھ کے ہم سب یہ محسوس کرنے لگے
ان کے الفاظ سے
کوئی مطلب نکلتا نہیں ہے
جو تعبیر و تفسیر اگلوں نے کی تھی
معانی و مفہوم جو اُن پہ چسپاں کئے تھے
اب ان کی حقیقت کسی واہمے سے زیادہ نہیں ہے
اور پھر یوں ہوا
چند لوگوں نے یہ آ کے ہم کو بتایا
کہ اب ان پرانی کتابوں کو
تہہ کر کے رکھ دو

ہمارے وسیلے سے
تم پر نئی کچھ کتابیں اُتاری گئی ہیں
انھیں تم پڑھو گے
تو تم پر
صداقت نئے طور سے منکشف ہو گی
بوسیدہ و منجمد ذہن میں کھڑکیاں کھل سکیں گی
تمھیں علم و عرفان
اور آگہی کے خزینے ملیں گے
اور پھر یوں ہوا
ان کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر
انہیں اپنے سینے سے ہم نے لگایا
ہر اک لفظ کا ورد کرتے رہے
ایک اک سطر کو گنگناتے رہے
ایک اک حرف کا رس پیا
اور ہمیں مل گیا
جیسے معنی و مفہوم کا اک نیا سلسلہ
اور پھر یوں ہوا
ان کتابوں سے
اک دن یہ ہم کو بشارت ملی
آنے والا ہے دنیا میں اب اک نیا آدمی
لیکے اپنے جلو میں نئی زندگی
ہم اندھیری گپھاؤں سے
اوہام کی تنگ گلیوں سے نکلیں گے
ہم کو ملے گی نئی روشنی

اور پھر یوں ہوا

لانے والے کتابوں کے
اور وہ بھی جو اُن پہ ایمان لائے تھے
سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر
کسی سمت کو چل پڑے
ایسے اک راستے پر
جدھر سے نیا آدمی
آنے والا تھا
یا ہم کو اس کا یقین تھا
کہ وہ آئے گا
اور اِسی سمت سے
بس اسی سمت سے آئے گا

اور پھر یوں ہوا

دیر تک ہم نئے آدمی کے رہے منتظر
دیر تک شوقِ دیدار کی اپنی آنکھوں میں مستی رہی
دیر تک اس کی آمد کا ہم گیت گاتے رہے
دیر تک اس کی تصویر
ذہنوں میں اپنے بناتے رہے
دیر تک اس خرابے میں اک جشن ہوتا رہا

اور پھر یوں ہوا

دیر تک
اور بھی دیر تک
جب نہ ہم کو ملا
آنے والے کا کوئی پتہ

اُس کے قدموں کی کوئی نہ آہٹ ملی
ہم نے پھر زور سے اُس کو آواز دی
اے نئے آدمی!
اے نئے آدمی!
اور یہ آواز اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کے
بے نام صحراؤں سے لوٹ کے
پھر ہماری طرف آ گئی
اور پھر یوں ہوا
چند لوگوں نے سوچا
کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
دوسرے چند لوگوں نے سوچا
اور پھر ہر طرف قافلے قافلے
اور پھر ہر طرف راستے راستے
اور پھر یوں ہوا
دیر تک اُس نئے آدمی کی رہی جستجو
اس کو آواز دیتے رہے چار سو
کو بہ کو، قریہ قریہ اُسے ہم بُلاتے رہے
منزلوں، منزلوں
خاک اُڑاتے رہے
اور پھر یوں ہوا
سب کے چہرے اسی خاک میں اٹ گئے
سب کی آنکھوں میں اک تیرگی چھا گئی
سب کو ڈسنے لگی راہ کی بے حسی

اور پھر سب وہ اک دوسرے کے لئے
اجنبی ہو گئے
اور پھر سب کے سب
دُھند میں کھو گئے
اور پھر یوں ہوا
ہم نے پھر گھر پہ آ کر
کتابوں کے اوراق کھولے
انھیں پھر سے پڑھنے کی خاطر اٹھایا
ہر اک سطر پر غور کرتے رہے دیر تک
اور ہر لفظ کو
دوسرے لفظ سے جوڑ کر
سلسلہ حرف و نغمہ کا، صوت و صدا کا ملاتے رہے
اور پھر یاس و امید کے درمیاں
ڈھونڈتے ہی رہے اُس نئے آدمی کا نشاں
اور ہمیں بس ملیں
اپنی آواز کی زرد، سوکھی ہوئی پتّیاں
اور پھر یوں ہوا
ہم سے سورج کئی روز روٹھا رہا
آسمانوں سے اٹھتی رہیں
تہہ بہ تہہ بدلیاں
کالی کالی نظر آئیں سب وادیاں
کالے گھر، کالی دیواریں، کالی چھتیں
کالی سڑکوں پہ چلتی ہوئی کالی پرچھائیاں
یہ زمیں

کالے ساگر میں ٹوٹی ہوئی ناؤ کی طرح سے ڈگمگانے لگی
موت کی نیند آنے لگی

اور پھر یوں ہوا

ہم نے اپنے گھروں میں
جلائے خود اپنے دیئے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب، ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
بجھے جسم کی راکھ سے
سر اُٹھاتے ہوئے ایک ننّھے سے شعلے کو
اور اپنے چہرے میں
اک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لئے آپ اپنی کتابیں لکھیں۔

●

یہ تھا خلیل الرحمٰن اعظمی کا ذہنی سفر: ذرا غور سے ہمارے ساتھ ساتھ خلیل صاحب کو سوچتے چلیں : ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کی طوفانی نسلوں سے مٹھ بھیڑ ہوگی جہاں شاعر سر سے کھیل رہا ہوگا: وہ دور جب مفتی اعظم سردار جعفری کا بول بالا تھا اور ان کی کتاب ترقی پسند ادب کا۔ پھر ترقی پسند تحریک پر خلیل الرحمٰن اعظمی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے تھیسس لکھا؛ اور تھیسس انہیں دور تک بہا لے گیا : وہ جو کہتے ہیں: کہیں کا نہ چھوڑا۔ اور پھر ۱۹۷۰ء آپ نے ملاحظہ کر ہی لیا اور پھر ۱۹۷۵ بھی - ۱۹۷۸ء میں وہ حقیقت برتر میں جا ملے : (یکم رجون ۱۹۷۸ء) مالک انہیں اپنی رحمتوں سے نوازتا رہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر منظر اعجاز

نواب سید امیر علی خان بہادر: احوال و آثار

فخر الملک وزیر السلطان امیر والا دودمان جنت مکان نواب امیر علی خان بہادر وزیر سابق شاہ اودھ کو وزیر السلطان کا خطاب تو عہد متعلقہ کی انگریزی حکومت کی طرف سے ملا تھا جب وہ معزول بادشاہ نواب واجد علی شاہ کے وزیر مقرر کئے گئے تھے۔ یہ عہدۂ وزارت نواب واجد علی شاہ کی معزولی اور مٹیا برج، کلکتہ کے زمانۂ قیام سے متعلق ہے۔ مزید مطالعے سے انکشاف ہوتا ہے کہ نواب بہادر کو معزول شاہ اودھ کی وزارت راس نہ آسکی۔ اس سلسلے میں تفصیل آگے آئے گی۔

سید علی محمد شاد عظیم آبادی نے نواب صاحب کو فخر الملک قرار دیا ہے۔ ان کی سوانحی تصنیف ''حیات فریاد'' سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کے احوال و آثار سے متعلق ہے۔ فریاد کے ہم عصروں اور ہم مشربوں میں شاد نے سید امیر علی خان بہادر کا بھی ذکر کیا ہے اور انہیں فخر الملک اور وزیر السلطان کے الفاظ و القاب سے یاد کیا ہے۔

سید بدر الدین احمد، فرزند ارجمند خان بہادر سید ضمیر الدین احمد بیرسٹر ایٹ لا نے مصنف ''فسانۂ خورشیدی'' کا ذکر اپنی گراں قدر تصنیف ''حقیقت بھی کہانی بھی'' میں کیا ہے۔ اس کتاب کا بہار اردو اکادمی کا مطبوعہ ایڈیشن ۲۰۰۳ء میرے پیش نظر ہے اور اس کا مطبوعۂ اول ایڈیشن ۱۹۸۸ء بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ سید افضل الدین احمد مصنف فسانۂ خورشیدی کے باب میں بطور تعارف مصنف خان بہادر سید امیر علی کا بے کم و کاست مفصل ذکر کیا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ نامکمل ہے۔ عدم تکمیل کے باوجود جو تفصیل پیش کی گئی ہے، وہ قدر و قیمت اور اہمیت میں فزوں تر ہے۔ اس سلسلے میں سید بدر الدین احمد رقم طراز ہیں:

''۱۸۵۷ء سے بہت قبل کی بات ہے۔ یہ قصبہ باڑھ، پٹنہ کے

رہنے والے تھے۔ سید امیر علی نے کلکتہ کے صدر دیوانی عدالت میں وکالت شروع کی۔ اپنی خداداد ذہانت اور صلاحیت سے روز بروز پیشے میں اونچے اٹھتے گئے اور ایک دن وہ آیا، کہ صدر دیوانی عدالت کے بڑے کامیاب وکیلوں اور صوبہ بنگال اور بہار کے معززین میں ان کا شمار ہونے لگا۔ سید امیر علی کو یہ گونہ اعزاز حاصل تھا، کہ وہ پبلک میں بھی ہر دلعزیز اور اس کے بہی خواہ سمجھے جاتے تھے اور حکومت کو بھی ان پر اعتماد اور ان کی صلاحیتوں پر بھروسہ تھا جس کا اعتراف بعد میں حکومت نے ان کو نواب اور سی۔ آئی کا خطاب دے کر کیا۔ جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کامیاب ہو کر ناکام ہو چکی تھی تو ملک کے دوسرے حصوں کے ساتھ ساتھ پٹنہ کی حالت بھی اس وقت تشویشناک تھی۔ پٹنہ کا انگریز کمشنر ٹیلر (Taylor) یہاں کے لوگوں سے انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ ہزاروں ہندستانیوں کے خون سے اس کی درندانہ تشنگی ابھی تک نہیں بجھی تھی، سینکڑوں بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھ چکے تھے اور سینکڑوں کی گردنوں میں پھانسی کے پھندے ڈالنے کا روزانہ حکم دیا جا رہا تھا۔ اس میں شرفاء، روساء، علما اور متوسطین ہی کی تعداد زیادہ تھی۔ ٹیلر (Taylor) اپنے انتقام کی دھن میں کسی کی سنتا ہی نہیں تھا۔ آخر تنگ آ کر پٹنہ کے کچھ سربرآوردہ لوگوں نے جو حکومت کے خیر خواہ سمجھتے جاتے تھے کلکتہ میں لارڈ کیننگ کو جو اس وقت گورنر جنرل تھے، ٹیلر کی دھاندلی کی طرف متوجہ کرایا اور اس کے ظالمانہ اور بڑھے ہوئے انتقامی جذبے کے ثبوت بھی پیش کیے۔ اس وقت حکومت وقت بھی درگزر پر تیار ہو چکی تھی۔ گورنر جنرل نے مصلحت کے پیش نظر ٹیلر کو فوراً ہٹانا ضروری سمجھا اور اس کو معطل کر کے فوری چارج لینے اور سینکڑوں بے گناہوں کے خلاف جو احکامات صادر ہو چکے تھے ان پر نظر ثانی کرنے کے لئے جس شخص کو مقرر کیا گیا، وہ یہی نواب سید امیر علی تھے''۔ (حقیقت بھی کہانی بھی۔ ص: ۹۲-۴۹۱)

یہ بات غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ نواب سید امیر علی، پٹنہ کے انگریز کمشنر ٹیلر کو برطرف

کر کے اس کی جگہ پر کمشنر مقرر کئے گئے اور سر برآوردان پٹنہ کو جوان سے توقع تھی ، اس پر پورے اترے۔ یہاں ان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی توجہ طلب ہے کہ حکومت ہند نے انہیں وزیر السلطان کا خطاب دے کر شاہ اودھ نواب واجد علی شاہ کا مشیر مقرر کیا۔ یہ ان کی قابلیت ہی تھی جو انہیں مرتبۂ عالیہ اور عہدۂ جلیلہ تک لے گئی۔ جب کہ انہوں نے بیرسٹری کی تعلیم بھی حاصل نہیں کی تھی۔ لیکن جب کلکتے میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تو تقدیر نے یاوری کی اور دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔

سید امیر علی ساکن قصبہ باڑھ، ضلع پٹنہ کے اجداد محلّہ سوہ ڈیہہ، بہار شریف کے باشندے تھے۔ بہار شریف بھی ضلع پٹنہ ہی کا ایک قصبہ تھا۔ ان کی رشتہ داریاں تلہاڑا میں بھی تھیں اور میر داد، بہار شریف کے خانوادۂ سادات میں بھی۔ اس خانوادے کے متعلقین آج بھی کئی مشرقی ومغربی ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور بیشتر اسی شہر پٹنہ میں مقیم ہیں۔ انھیں مقیمان پٹنہ میں میرے ایک معمر بزرگ سید منصور احمد خان صاحب بھی ہیں جو متوطن پنہر، ضلع نالندہ، متصل بہ اسلام پور کے ہیں۔ خان بہادر فدا علی خان کے پوتے اور محمود حسن خان صاحب کے فرزند دلبند ہیں۔ فدا علی خان کے اور دو برادران حقیقی وزیر علی خان اور اقبال علی خان وفا تھے۔ یہ تینوں بھائی شاعر بھی تھے اور یہ تینوں خان بہادر امیر علی خان کے صاحبزادگان تھے۔ اقبال علی خان کی ایک بیٹی نثار علی (رجسٹرار، میر داد، بہار شریف) سے بیاہی گئی تھیں۔ نواب سید امیر علی ساکن باڑھ، نثار علی رجسٹرار کے پھوپھا اور فدا علی میر داد کے داماد تھے۔ آگے چل کر نثار علی کی شادی سید امیر علی کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ اس طرح سید امیر علی، نثار علی کے پھوپھا اور خسر محترم بھی ہوئے۔

بہر حال، جیسا کہ میں نے عرض کیا، سید منصور احمد خان صاحب میرے بزرگ یعنی میری اہلیہ کے ماموں صاحب ہیں۔ عمر ان کی بیاسی سے متجاوز ہو چکی ہے لیکن قدرے صحتمند اور باہوش وحواس ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ''سید امیر علی میرے نانا سید نثار علی ولد فدا علی میر داد، بہار شریف، ضلع نالندہ کے پھوپھا تھے۔ سید امیر علی قصبہ باڑھ، ضلع پٹنہ کے تین بیٹے تھے۔ نواب زادہ خان بہادر سید اشرف الدین احمد آئی۔ ای جو برسہا برس امام باڑہ محسنیہ ہوگلی کے متولی رہے۔ جب اس عہدے سے سبکدوش ہو کر باڑھ آئے تو وائسرائے کی امپیریل کونسل کے ممبر نامزد کئے گئے۔ چند برسوں کے بعد باڑھ ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ دوسرے خان بہادر سید افضل الدین احمد جو ناول ''فسانۂ خورشیدی'' کے مصنف تھے۔ یہ

بہت دنوں تک انسپکٹر آف رجسٹریشن رہے۔ تیسرے احسن الدین احمد، ڈی۔ ایس اور صوبہ بہار واڑیسہ کے اکسائز انسپکٹر اور انسپکٹر جنرل رجسٹریشن رہے۔ اخیر میں یہ لفٹیننٹ گورنر بہار کی ایکزیکیوٹو کونسل کے ممبر بنائے گئے لیکن اس عہدے کا چارج لینے ہی والے تھے کہ اچانک قلب کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے کلکتہ ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سید منصور احمد خان صاحب کے بیان کے مطابق ان تینوں بھائیوں کی شادی سید نثار، میر داد، بہار شریف کی تین بہنوں یعنی فدا علی صاحب کی بیٹیوں سے ہوئیں جب کہ خود نثار علی صاحب کی شادی نواب سید امیر علی باڑھ کی بیٹی سے ہوئی جو رشتے میں نثار علی کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کے بطن سے ایک بیٹا اصدق علی اور ایک بیٹی ہوئی۔ یہ دونوں بچ نہیں سکے اور پھر کوئی اولاد نہ ہوئی چنانچہ سید نثار علی کی دوسری شادی سید اقبال علی خان، قصبہ پنہر، ضلع نالندہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے نثار علی کی جو اولاد ہوئیں، انہیں میں سے ایک بیٹی سید محمود حسن خان سے بیاہی گئیں جو منصور احمد خان اور حسنہ خاتون (زوجہ سید محمد صالح، بہار شریف) کے والد ہوئے اور نثار علی کی بیٹی ان کی والدہ ہوئیں۔ اور نثار علی (رجسٹرار، میر داد) ان کے نانا ہوئے۔

منصور احمد خان صاحب کے بیان کے مطابق نثار علی، میر داد، بہار شریف کے والد کا نام فدا علی تھا۔ یہ اصل متوطن تلہاڑا کے تھے۔ ان کی شادی میر داد میں ہوئی اور یہ اپنی سسرال، میر داد میں بس گئے۔ ان کی بہن سے سید امیر علی کی شادی ہوئی تھی جبکہ سید امیر علی کے آباو اجداد اصل متوطن بہار شریف کے محلّہ سوہ ڈیہہ کے تھے۔ ان کی رشتے داری تلہاڑا میں بھی تھی۔ امیر علی، فدا علی کے بہنوئی تھے۔ اس رشتے سے وہ فدا علی کے صاحبزادے نثار علی کے پھوپھا تھے اور سید نثار علی، منصور احمد خان اور حسنہ خاتون وغیرہ کے نانا تھے۔

''امیر نامہ'' میں مرقوم نواب امیر علی خان کے اپنے بیان سے بھی مترشح ہے کہ ان کے اجداد نے بغداد سے ترک وطن کر کے ہندستان کا رخ کیا۔ دلّی میں اقامت گزیں ہوئے۔ اور یہاں منصب جلیلہ پر فائز ہوئے:

''از اجدادم نخستین حضرت غفران دستگاہ قاضی سید نوح موسوی از دارالسلام بغداد بہ ہندستان بلاد آمدند۔۔۔الخ''۔ (ص:۱۵۱)

سیدنوح کا تعلق بغداد کے شہر کرمان سے تھا۔ وہ قاضی یعنی جج تھے۔ انھوں نے حاکم شہر کے خودسر و خود پسند بیٹے کو کسی فعل مجرمانہ میں ملوث پا کر گرفتار کرایا اور سزا دے دی تھی۔ حاکم ناراض ہو گیا تھا۔ اسی لئے بغداد کو ترک کر کے ہندستان آنا پڑا۔ اس سلسلے میں امیر علی کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

''ترک آں منصب و جاہ یکبارہ خاتون مسلماۃ زینب وفرزند جگر بند سید ابوبکر درین مرز بوم ہندستان بدارالسلطنت دہلی۔۔۔۔الخ (ص:۱۵۲) آئے اور تقوی و پرہیز گاری نیز بزرگی کے پیش نظر بہ لقب شاہ مخاطب کئے گئے۔ چک زینب اور چک ابا بکر کے نام سے جاگیریں عطا ہوئیں۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا بھی راس نہ آسکی۔ چنانچہ اس سیادت پناہ خاندان کے افراد نے دلی کو بھی ترک کیا اور بہار شریف آ بسے۔ کیونکہ یہاں کی فضا دل پذیر اور موسم معتدل تھا۔ بہار آنے والے سید شاہ ابوبکر کے بیٹے ملا شاہ نور محمد تھے۔

''ایشان در بہار پر بہار بمحلہ سوہ مکانی وسیع بہر خود جداگانہ درست کردند۔۔۔۔الخ''
(ص:۱۵۵)

ملا شاہ نور محمد کے بیٹے کا نام سید شیخ احمد تھا۔ جن کے دو بیٹے شاہ شیخ غلام محی الدین اور دوسرے شیخ عطا محی الدین تھے۔ سید امیر علی کا تعلق شاہ شیخ محی الدین کے سلسلۂ نسب سے ہے۔ شیخ غلام محی الدین کے بیٹے محمد رفیع، قاضی سید محمد ماہ، نبیرۂ قاضی معین الدین ساکن قصبہ باڑھ، علاقہ پٹنہ کی دختر فہمیدہ سے بیاہے گئے۔ یہیں سے اس خاندان کی رشتہ داری باڑھ تک پھیلی۔ باڑھ کے اس خاندان میں بھی عہد شاہجہانی سے جاگیرداری چلی آرہی تھی۔ ہر طرح کی خوش حالی اور فارغ البالی تھی۔

بہر حال شیخ محمد رفیع کے دو بیٹے ہوئے، ایک شیخ وارث علی، امیر علی کے دادا۔ ان کے بیٹے اسد الدین احمد معروف بہ شیخ احمد علی، امیر علی کے والد بزرگوار تھے۔ اس سلسلے کی اصل فارسی عبارت درج ذیل ہے:

محمد رفیع را دو پسر بودند۔ یکی شیخ وارث علی جدم کہ خلف شان اسد الدین احمد معروف بہ شیخ احمد علی پدر بزرگوار این خاکسار۔۔۔۔الخ (۱۵۶)

نواب سید امیر علی نے اپنی تاریخ پیدائش بھی درج کی ہے:

''ولادتم بوطن آبائی قصبۂ باڑھ در محلّہ قاضی معین الدین چک علاقہ پٹنہ کہ عظیم آبادش ہم

نامند بتاریخ ہشتم شہر صفر المظفر سال یکہزار و دوصد و بست و پنج ہجری قدسی موافق نیمہ ماہ مارچ ۱۸۱۰ یکہزار و ہشتصد و دہ عیسوی روز پنجشنبہ بود''۔(۱۶۵)

سید امیر علی کے بیان سے واضح ہے کہ ان کے پردادا ''سوہ'' (سوہ ڈیہہ، یا سوہ سرائے) بہار شریف کے باشندہ تھے جن کی شادی قاضی سید محمد ماہ، معین الدین چک، قصبہ باڑھ کی دختر فہمیدہ سے ہوئی۔ ان کی اولاد میں شیخ وارث علی امیر علی کے دادا اور وارث علی کی اولاد میں اسدالدین احمد معروف بہ شیخ احمد علی، امیر علی کے والد بزرگوار ہوئے۔ امیر علی باڑھ میں مارچ کے وسط میں بروز جمعرات ۱۸۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ غالباً چار سال کی عمر سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ آگے چل کر بغرض تحصیل تعلیم پٹنہ کا سفر کیا۔ پھلواری شریف میں بھی تعلیم حاصل کی۔ کلکتہ کی روانگی سے پہلے انھوں نے پٹنہ میں مختاری یا وکالت کی تعلیم حاصل کر لی تھی۔ کلکتہ کی دیوانی عدالت میں وکالت شروع کی تھی۔ وکالت خوب چمکی۔ اس پیشے سے بے شمار دولت حاصل ہوتی گئی اور وہ مختلف معزز عہدوں پر فائز ہوتے گئے۔

منصور احمد خان صاحب ابھی ہندستان بالخصوص پٹنہ، بہار میں اس خانوادے کے متعلقین میں سب سے معمر اور صحتمند و صحیح الدماغ ہیں۔ اس لئے ان کی بیان کردہ روایت کو نا قابل اعتنا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے بیان کے مطابق نواب سید امیر علی کا آبائی تعلق سوہ ڈیہہ، بہار شریف سے تھا۔ ان کا گھرانہ نجیب و شریف تھا۔ مالی و معاشی حالت بھی اچھی تھی لیکن اہل خانہ اور قرابت داروں کے مشورے سے کسب معاش کے لئے کلکتے کا سفر کیا۔ وہ نہایت خوش اسلوب اور خوش خط تھے۔ اس زمانے میں انگریز کلکٹر کا ایک ملازم بہار شریف ہی کا تھا۔ وہ ہر ہفتہ انھیں سے خط لکھوا کر اپنے وطن بھیجا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ خط لکھوا لینے کے باوجود کسی عجلت کی وجہ سے خط کو سپرد ڈاک نہیں کر سکا۔ جلدی میں واپس ہوا اور خط کو کلکٹر صاحب کی میز پر رکھ کر اپنے کام میں لگ گیا۔ جب کلکٹر کی نظر اچانک خط پر پڑی تو اسے بہ نظر اشتیاق دیکھا۔ اس زمانے کے اکثر و بیشتر حاکم جو اس مقام و مرتبے کے ہوتے تھے، اردو اور فارسی کی بھی اچھی خاصی استعداد رکھتے تھے۔ کلکٹر خط کی تحریر سے متاثر و محظوظ ہوا۔ پھر اپنے ملازم سے خط نویس کے بارے میں استفسار کیا اور اسے بلانے اور ملانے کو کہا۔ ملازم نے حکم کی تعمیل کی لیکن ملازم نے جب امیر علی صاحب سے یہ کہا کہ کلکٹر صاحب بلاتے ہیں تو امیر علی بھونچکے رہ گئے،

گھبرائے بھی لیکن ملازم نے تسلی دی تو لامحالہ کلکٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔کلکٹر نے خط کے حوالے سے کچھ استفسار کیا، بہت تعریف کی ،اس کے بعد گزارش کی کہ آپ وقت نکال کر میرے بچوں کو پڑھایا کریں۔اچھی خاصی تنخواہ کی پیشکش کی گئی تھی جسے امیر علی نے قبول کرلیا اور اس کے بچوں کو اردو فارسی پڑھانے لگے۔

سید امیر علی کے تعلقات کلکٹر سے گہرے ہوتے گئے۔کلکٹر امیر علی کی ذہانت اور قابلیت سے متاثر ہوتا گیا۔وہ مخلصانہ اور سرپرستانہ مشورے بھی دینے لگا۔اسی کی تحریک وتعاون سے سید امیر علی جو مختاری کی باضابطہ تعلیم حاصل کئے ہوئے تھے، وکالت کرنے لگے۔پریکٹس خوب چمکی اور ان کا شمار کامیاب وکیلوں میں ہونے لگا۔اسی دوران کلکٹر کے مشورے سے منصفی کا امتحان پاس کیا اور منصف مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہوئے لیکن کچھ دونوں کے بعد اس عہدے سے مستعفی ہوکر پھر وکالت کرنے لگے۔دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔کلکتہ میں کئی مکانات خریدے یہاں تک کہ پارک سرکس کے علاقے میں کوئی محلّہ یا گلی امیر علی اسٹریٹ کے نام سے منسوب ہوگئی جو آج بھی قائم ہے۔

سید منصور احمد خان کے اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ سید امیر علی نے اپنی محنت،لگن اور خلوص سے نہ صرف یہ کہ بے انتہا دولت حاصل کی بلکہ نام ونمود اور شہرت ومقبولیت اور اعلی مقام ومرتبہ بھی حاصل کیا۔باڑھ میں بھی عالیشان کوٹھی تعمیر کرائی جو نواب کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی۔کوئی ربع صدی قبل تک نواب کوٹھی موجود تھی جسے ان کے وارثان نے فروخت کردیا۔اب اس کا نام ونشان مٹ چکا ہے۔لیکن ماضی کا یہ قصہ ہنوز لواحقین کے حافظے کا حصہ ہے۔

نواب امیر علی کے انتہائی عروج کا زمانہ وہی تھا جب وہ پٹنہ کے کمشنر ٹیلر (Taylor) کو ہٹا کر کمشنر بنائے گئے تھے۔بقول سید بدرالدین احمد:

> ''پٹنہ کے لوگوں کو ان سے انصاف کی جو امید تھی، وہ سولہ آنے پوری ہوئی۔
> رات ہی رات نواب سید امیر علی نے ٹیلر سے کمشنری کے عہدے کا چارج لیا۔
> اسی رات سینکڑوں کے محضر قتل پر نظر ثانی کی اور صبح ہوتے ہی جو لوگ پھانسی کے
> تختے پر چڑھائے جانے والے تھے، سبھوں کے لئے رہائی کا حکم دے دیا۔انہیں
> پھانسی سے بچنے والوں میں نواب سید لطف علی خان بھی تھے جن کی داد ودہش اور

قومی امداد کی داستانیں یہاں کے بہت سے تعلیمی اداروں پر ثبت ہیں: (حقیقت بھی کہانی بھی۔ص:۴۹۲)

ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۵۷ کے بعد کا زمانہ تھا۔ ہندستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت پورے طور پر مسلط ہو چکی تھی، کار پردازان حکومت اور ارکان دولت مخالفین حکومت کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔ ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ سرسید احمد خان نے ''سرکشئ بجنور'' لکھ کر معافی تلافی کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کا معذرت خواہانہ انداز و اسلوب کارگر نہ ہو سکا۔ ان کی کوشش بار آور نہ ہو سکی جب کہ ان کی وفاداری کے چرچے ہندستان سے انگلستان تک زور پکڑ چکے تھے۔ انگلستان کی برٹش پارلیامنٹ اور اس کے سیاسی عزائم و رجحانات پر بھی سرسید کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ انہوں نے بہ عجلت تمام ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی شکایت مرقوم تھی اور اسے طبع کرا کے چند کاپیاں اپنے پاس رکھیں، باقی انگلستان کی برٹش گورنمنٹ کو بھیج دیں، جہاں لبرل اور کنزرویٹو پارٹیوں میں انا کی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ پارلیامنٹری ڈیبیٹ میں کنزرویٹو گروپ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حمایت میں تھا اور چاہتا تھا کہ ہندستان کی حکومت و حاکمیت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہی ہاتھوں میں رہے لیکن سرسید کی تصنیف ''اسباب بغاوت ہند'' کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کر کے لبرل پارٹی مصر تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ہندستان جیسے ملک پر حکمرانی کی صلاحیت نہیں، اس لئے ہندستان پر براہ راست برٹش گورنمنٹ کا کنٹرول قائم ہونا چاہئے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مصلحتاً در گزر سے کام لینے کی پالیسی اختیار کی گئی۔ اسی پالیسی کے تحت پٹنہ کے کمشنر ٹیلر کو معطل کر کے نواب امیر علی کمشنر بنائے گئے اور حاکم و محکوم دونوں کی امیدوں پر پورے اترے۔ ان کی شہرت و مقبولیت، عزت و عظمت اور ہر دلعزیزی میں چار چاند لگ گئے۔

سید امیر علی کا زوال بھی اس واقعہ کے چند سال بعد شروع ہو گیا۔ بقول سید بدرالدین احمد:

> ''سابق شاہ اودھ حضرت واجد علی شاہ جو اس وقت مٹیا برج کلکتہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے، ان کے مالی انتظامات الجھنے لگے تو حکومت ہند نے نواب سید امیر علی کو وزیر السلطان کا لقب دے کر واجد علی شاہ کا مشیر مقرر کیا۔ پہلے تو نواب سید امیر علی اپنی کامیاب وکالت چھوڑنے پر تیار نہ تھے مگر بعد میں

اس شرط پر انہوں نے یہ عہدہ قبول کر لیا کہ وہ وکالت سے کلیتاً دست بردار نہ ہوں گے۔ اس عہدے کو قبول کر لینا نواب سید امیر علی کو بڑا مہنگا پڑا۔ یہ صحیح ہے کہ واجد علی شاہ کے اخراجات میں فراغت آئی۔ سابق شاہ اودھ کو اطمینان بھی مل گیا، مگر نواب سید امیر علی کو بادشاہ کے اخراجات پورا کرنے میں بار بار اپنی وکالت سے حاصل کردہ جائدادوں کی کفالت بھی مہاجنوں کی دینی پڑی۔ اس وقت تک بادشاہ کے اپنے ساتھ لائے ہوئے جواہرات اور لائی ہوئی رقمیں بھی ختم ہو چکی تھیں، جن کے ذریعہ سے واجد علی شاہ اپنے حوصلے پورے کرتے تھے۔ مٹیا برج کا محلّہ جو بڑھ کر چھوٹا سا لکھنؤ بن گیا تھا، وہاں کے شاہی محلات اور ہزاروں نوکر پیشے جو لکھنؤ سے کھینچ کر یہاں آ گئے تھے، ان سب کی کفالت شروع ہی سے حکومت ہند کی اس مقرر کردہ پنشن سے ناممکن تھی جو واجد علی شاہ کو ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب نواب امیر علی کا انتقال ہوا تو ان کی ساری جائداد مہاجنوں کے یہاں گروی تھی۔ واجد علی شاہ کو سب خبر تھی کہ نواب امیر علی اپنی جائداد کو رہن رکھ کر ان کے اخراجات پورے کر رہے تھے۔ ان کو اس کا بھی یقین تھا کہ حکومت ہند ان قرضوں کو ادا کر دے گی۔ جب نواب امیر علی کا انتقال ہوا تو اسی یقین کے ساتھ واجد علی شاہ نے نواب سید امیر علی کی جائدادوں کی واگذاشت کے لئے ان کے قرضوں کی وصولی کی طرف حکومت ہند کو توجہ دلائی۔ حکومت ہند نے وعدہ بھی کر لیا کہ جلد ہی یہ قرضے حکومت ادا کر دے گی، مگر نواب امیر علی کے ورثاء کی بدقسمتی سے چند ہی دنوں کے بعد واجد علی شاہ کا بھی انتقال ہو گیا اور انگریزی حکومت کا وعدہ بھی دفتر پارینہ ہو کر ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔ آخر یہی ہوا کہ نواب سید امیر علی کی ساری جائداد قرض میں تلف ہو گئی۔''

(حقیقت بھی کہانی بھی۔ ص: ۹۳-۴۹۲)

نواب سید امیر علی کی زندگی کا یہ یقیناً افسوس ناک پہلو ہے جسے سید بدرالدین احمد نے ان کے ورثا کی بدقسمتی قرار دیا ہے لیکن اصل ورثا، خصوصاً ان کے تینوں بیٹے، اشرف الدین احمد، افضل الدین احمد

اوراحسن الدین احمد نہایت ہی لائق و فائق تھےاوراونچے اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اس لئے اس خانوادے کی نوابی شان میں کوئی فرق نہیں آیا۔نوابوں، جاگیرداروں، زمینداروں اور رئیسوں کے گھرانوں میں مشرقی ومغربی تہذیب کی پیوندکاری و ہمکاری سے وہ شعور پروان چڑھ رہا تھااور برگ و بارلا رہا تھا جس کی تخم ریزی سرسید احمد خان نے کی تھی۔البتہ اسی معاشرتی معیار کا حامل وہ طبقہ جسے انگریزی تہذیب واخلاق اورانگریزی علوم سے وحشت و پرخاش تھی، وہ زمانے کی ٹھوکروں سے کچلتا جارہا تھا۔نواب سید امیر علی کے تینوں بیٹے اپنے والد بزرگوار کے زمانہ عروج ہی میں بالغ، باشعوراور زیورعلم وتعلیم سے آراستہ ہو چکے تھے۔

نواب سید امیر علی خان بہادر نے اپنی وکالت یا قابلیت سے جو مال ودولت حاصل کی تھی، وہ تو تلف ہوگئی۔لیکن وہ فارسی کے شاعر ونثار بھی تھے۔امیر نامہ، وزیر نامہ اور بیرنگ نامہ ان کی نثری تصانیف ہیں جن میں حسب موقع وضرورت فارسی اشعار بھی ہیں جوان کے شاعرانہ مرتبےاوراعتبار و اعتنا کو قائم کرتے ہیں۔ان کی تصانیف ''سرمایۂ گمشدہ'' کے طور پر محفوظ ہیں۔فارسی زبان وادب کے معلمین، محققین اور ناقدین ومصنفین بھی آج تقریباً نایاب ہیں جن کی رسائی ان تصانیف تک ہو۔یہ ایک نہایت ہی افسوس ناک پہلو ہے۔ایسے فراموش شدگان میں اور بہت سارے فارسی گویان سبک ہندی ہوں گے۔ایسے خوش نصیبوں کی تعداد بہت کم ہوگی جن کی متعاقب نسل نے انھیں اپنی تحریروتقریر میں یادرکھا ہو۔ایسے خوش نصیبوں میں سردست میرے پیش نظرایک نام سید شاہ الفت حسین فریادعظیم آبادی کا برسبیل تذکرہ آگیا ہے۔یہ شادعظیم آبادی کے استاد تھے۔شاد نے ان کی سوانح عمری ''حیات فریاد'' لکھ کراردو کے حلقے میں انھیں زندگی دوام عطا کرنے کی کاوش مستحسن کی ہے۔

فریاد ۱۸۳۸ء میں مرشدآباد پہنچے تھے۔دراصل ایک انگریز حاکم ان سے فارسی دانی کی کامل استعداد حاصل کرنا چاہتا تھا۔لیکن اس وقت ایسا نہ ہوسکا۔فریادمرشدزادوں کے اتالیق مقرر کئے گئے۔ چارسال بعدعہدۂ نیابت وسفارت پر مامور ہوکر کلکتے چلے گئےاور برسہابرس کلکتے میں قیام فرمارہے۔ اس دوران سید امیر علی سے حددرجہ قربت وموانست پیدا ہوگئی تھی۔''حیات فریاد'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فریاد ۱۸۴۲ء میں کلکتے تشریف لائے اور ۱۸۷۴ء میں آخری بار اپنے وطن عظیم آباد تشریف لائے اور یہیں ۱۸۸۰ء میں ان کا انتقال ہوا۔

شاد عظیم آبادی ۱۸۷۱ء میں پہلی بار کلکتے تشریف لے گئے تھے۔انھوں نے وہاں اپنے استاد حضرت فریاد کا جو دستور العمل دیکھا، اسے بھی سلسلہ وار بیان کیا ہے۔اسی سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''چھ بجے حضرت سوار ہوکر ہوا خوری کو جاتے، اور واپسی میں ضرور فخر الملک نواب امیر علی خان مرحوم کے ہاں تشریف لے جاتے، وہاں جیسا ایک پیچوان نواب صاحب کے لئے آتا، ویسا ہی حضرت کے لیے بھی اور دو پیالیاں چائے کی وہاں نوش فرماتے، شام کی صحبت نواب صاحب کے یہاں عام ہوتی تھی، بہت سے اہل غرض سفارشیں لینے والے اور عظیم آباد کے روسا و شرفا جو کسی غرض یا تفریح وسیر کے لیے کلکتہ جاتے وہ سب نواب صاحب کے ہاں شام سے شب نو بجے تک جمع رہتے، سب کے لیے ایک پیالی چائے اور دو بسکٹ آتے۔شب کے آٹھ بجے حضرت فرماتے گاڑی میں فانوس روشن کرو، جس کے معنی یہ ہوتے گاڑی لاؤ۔'' (حیات فریاد۔ص:۱۱۶)

نواب سید امیر علی خان بہادر سے سید شاہ الفت حسین فریاد عظیم آبادی کے جو تعلقات و مراسم تھے، ان میں ایک رشتہ استادی وشاگردی کا بھی تھا۔شاد کے مطابق:

''فخر الملک وزیر السلطان نواب سید امیر علی خان بہادر، انھوں نے حضرت (فریاد) سے اصلاح لی، اور ان کی کل تصانیف حضرت کی دیکھی ہوئی ہیں۔امیر نامہ، وزیر نامہ، بیرنگ نامہ وغیرہ یہ سب فارسی نظم ونثر میں ہیں، زبان خود کہے دیتی ہے کہ حضرت کی کامل اصلاح ہے، امیر نامہ میں جس قدر قطعات وتقریظات مشاہیر وقت کی ہیں سب کے پیشتر ہمارے حضرت کی تقریظ نظم ونثر دونوں میں ہے، وہ اس عنوان والفاظ کے ساتھ ہے:

از نتائج فکر بلند وطبع آسمان پیوند سحبان ملک سخندانی، حسان کشور معنی فخر الادبا، ملک الشعرا عالی جناب فیض مآب حضرت استاذی سید شاہ الفت حسین صاحب فریاد مدظلہم العالی'' (حیات فریاد۔ص:۱۷۸)

شاد کے اس بیان کی تصدیق امیر نامہ کے متعلقہ مشتملات سے ہوجاتی ہے۔پہلی تقریظ فریاد ہی کی ہے۔علاوہ ازیں حکیم محمد احسن اللہ خان، سید شاہ بندہ حسین، مرزا علی بہادر، مرزا خاور سیستانی، سید حسین بلگرامی، عبداللہ عبیدی، مولوی فدا حسین متخلص بہ قانع، محمد جان خان بہادر متخلص بہ شاہد، سید منور حسین متخلص بہ منتظر، منشی محمد ظہیر الدین، مولوی سید محمد حسن، منشی نول کشور، محمد نور الحسن اور محمد واعظ الحق۔تقریظیں منظوم ومنثور دونوں اسالیب میں ہیں جو ص:۳۸۳ سے ص:۴۹۰ تک پھیلی ہوئی

ہیں۔ان میں چند صفحات قطعۂ تاریخ کے بھی شامل ہیں۔سید شاہ الفت حسین فریاد کی منثور تقریظ کے علاوہ جو منظوم تقریظ ہے، وہ شاعری کی مختلف صنفوں میں ہے۔رباعی، قطعہ، غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ کی صنفیں اس میں شامل ہیں۔قصیدے تین عدد اور مثنوی مختلف بحر واوزان میں آٹھ عدد ہیں۔ان کی جولانی طبع یہاں حیرت انگیز نظر آتی ہے۔مثنوی بحر خفیف مقطوع بروزن ''باغ ارم شاہے'' پانچ اشعار پر مشتمل ایک مختصر سی نظم ہے۔بطور نمونہ یہاں پیش کی جاتی ہے:

خان والا مکاں امیر علی — جان جسم جہاں امیر علی
بوزارت خجستہ دستوری — طرفہ گنجی و طرفہ گنجوری
این خردنامہ تا رقم زدہ است — بسربسی نامہ با قلم زدہ است
طرفہ دیباچہ کتاب کمال — کہ از و تافت آفتاب کمال
نام این نامۂ خرد بنیاد — لبّ دانش امیر نامہ نہاد

نواب سید امیر علی کی کتاب ''وزیرنامہ'' ۱۲۹۳ ہجری میں مطبع نظامی کانپور سے طبع ہوئی۔اس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی نثر اور فارسی شاعری میں بھی وہ طبع جولاں رکھتے تھے۔ حمد، نعت، مناجات اور منقبت اہل بیت والاطہار کے علاوہ نواب واجد علی شاہ اور ان کے آبا واجداد کی شان والا تبار میں مدح گساری اور غزل سرائی میں فکر وفن کے دفتر کھول دئے ہیں۔کتاب کا اصل موضوع بھی نواب واجد علی شاہ کے خاندان سے متعلق ہے۔

سید امیر علی کی ایک کتاب بیرنگ نامہ (BAIRANG NAMA) ہے۔اس کی اشاعت ۱۸۷۶ء میں مطبع ''اردو گائیڈ'' کلکتہ سے ہوئی۔اس کا اصل موضوع انگریزی حکومت کے فرمانرواؤں اور حاکموں کے حالات وواقعات سے متعلق ہے۔اس میں فارسی کے علاوہ انگریزی متون بھی شامل ہیں۔اندازہ ہوتا ہے کہ سید امیر علی انگریز میں بھی ایسی ہی مہارت رکھتے تھے جیسی کہ فارسی میں تھی۔

بہرحال اس کتاب کی طباعت واشاعت سے پہلے ۱۷ ستمبر ۱۸۷۵ء کو سید امیر علی نواب اور خان کے خطابات اور خلعت فاخرہ سے نوازے جا چکے تھے۔میں سمجھتا ہوں کہ وہ ''حکومت برطانیہ در ہند'' کے مستقل ملازم نہیں تھے لیکن حکومت نے جب ضرورت محسوس کی ان کی خدمات حاصل کی گئیں

اورصلہ وانعام سے نوازا گیا۔

نواب سید امیر علی خان بہادر نے اپنی شدید ترین مصروفیات کے باوجود اپنے بیٹوں کی پرورش و پرداخت اور تعلیم وتربیت پر خصوصی توجہ دی اور انھیں لائق و فائق بنایا۔ان کے تیسرے بیٹے نواب زادہ سید احسن الدین احمد کی ادبی خدمات کے بارے میں سردست مجھے کوئی علم نہیں۔البتہ خلف اکبر سید اشرف الدین احمد اور خلف دوم سید افضل الدین احمد کے بارے میں کچھ تو ان کی تصانیف سے اور کچھ شاد عظیم آبادی کی سوانحی تصنیف حیات فریاد، سید بدرالدین احمد کی کتاب ''حقیقت بھی کہانی بھی'' اور پروفیسر مظفر اقبال کی کتاب ''بہار میں اردو نثر کا ارتقا'' یا بعض دوسری اکادکا کتاب سے جانا۔

سید افضل الدین احمد کا ناول بہار میں اردو نثر کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔لیکن میرے خیال میں اسے کلکتہ کے اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل قرار دیا جانا چاہئے۔اس کا جواز بقول سید بدرالدین احمد یہ ہے کہ:

''سید افضل الدین احمد سن شعور کو پہنچے تو ان کے والد نواب سید امیر علی، واجد علی شاہ کے یہاں وزیرالسلطان کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔سید افضل الدین احمد کا آنا جانا محلات شاہی میں بھی ہونے لگا۔لکھنؤ کے شاہزادگان جو کلکتہ میں آکر بس گئے تھے، پھر ٹیپو سلطان کے خاندان کے افراد کا ان سبھوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، مٹیا برج کا ماحول اس وقت لکھنؤ کی تہذیب اور کلچر پر پہلو مارتا تھا، اسی ماحول کی آغوش میں سید افضل الدین احمد کی جوانی کے دن گزرے تھے۔یہ طبعاً رنگین مزاج بھی تھے، ان کے والد کے گھر دولت کی افراط بھی تھی، اس لئے یہ نواب زادوں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔اگرچہ سید نواب امیر کے انتقال کے بعد ان کی تقریباً سب جائدادیں نیلام ہوگئی تھیں، پھر بھی جائدادوں کے ٹکڑے پارچے بہت کچھ باقی ادھر ادھر منتشر تھے۔ان ہی کو برسوں سمیٹ کر سید افضل الدین احمد کلکتہ میں فراغت کی زندگی بسر کرتے تھے اور کلکتہ کی عیش کی زندگی کی بہاریں لوٹتے تھے''

(حقیقت بھی کہانی بھی، ص: ۹۵۔۴۹۴)

نواب سید امیر علی خاں بہادر کے بڑے بیٹے سید اشرف الدین احمد کو بھی شاد عظیم آبادی نے تلامذۂ فریاد میں شامل کیا ہے۔شاد رقمطراز ہیں:

''خان بہادر مولوی اشرف الدین احمد خان مخاطب بہ اشرف الدولہ خلف اکبر فخر الملک وزیر

السلطان نواب امیر علی خان بہادر، مولوی کرامت علی صاحب نے جو ہوگلی کے امام باڑہ کے مشہور متولی تھے۔۔۔۔۔۔۔اپنی جگہ مولوی اشرف الدین احمد خان صاحب کو متولی مقرر کروایا اور اشرف الدین احمد خان صاحب نے یہ خدمت بحسن وخوبی تقریباً پینتالیس سال انجام دی۔۔۔۔۔انہوں نے شاعری وغیرہ میں جو کچھ حاصل کیا ہمارے حضرت ہی سے حاصل کیا۔ان کی بہت سی تصانیف ہیں، ہمارے حضرت مثل اپنے فرزند کے چاہتے تھے''۔(حیات فریاد،ص:۸۹۔۱۸۸)

نواب زادہ سید اشرف الدین احمد خان بہادر بھی فارسی گو شاعر و نثار تھے لیکن اردو میں بھی ان دونوں اسالیب اظہار و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ان کی بھی چند تصانیف فارسی ''دردانہ خیال''، طبقات محسنیہ، یادگار، نورتن اور تحفۂ سخن'' وغیرہ میری نظر سے گزری ہیں ''تحفۂ سخن''مختصر سا مجموعۂ کلام ہے جس میں فارسی کے علاوہ اردو میں بھی چند غزلیات و منظومات ہیں۔ان کی طویل تقریظ منظوم و منثور فسانۂ خورشیدی میں بھی شامل ہے۔فسانۂ خورشیدی ان کے منجھلے بھائی سید افضل الدین احمد کا ناول ہے۔سید افضل الدین احمد بھی شاعر تھے۔۳۸/اشعار پر مشتمل فسانۂ خورشیدی کا منظوم دیباچہ اس کا بین ثبوت ہے۔یہ برادران گرامی سید امیر علی خان بہادر کے بیٹے ہی نہیں، علمی و ادبی وارثان بھی تھے۔ لیکن سید امیر علی خان بہادر نے خود جو عزت و عظمت حاصل کی وہی ان کے لئے کافی تھی اور کافی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر طلحہ نعمت ندوی

بہار کا سب سے پہلا اردو کتب خانہ

(کتب خانہ الفلاح استھانواں)

نواح عظیم آباد کی زرخیر اور علم دوست بستیوں میں استھانواں اور دیسنہ کا نام اہل علم کے درمیان کسی تعارف کا محتاج نہیں، اپنی ثقافتی و علمی خصوصیات اور عظیم المرتبت شخصیات کی بنا پر یہ دونوں بستیاں بہت مشہور رہی ہیں، ان کی شہرت اگر ایک طرف ان کے نامور سپوتوں اور قابل فخر فرزندوں کی رہین منت ہے تو دوسری طرف یہاں کی علمی وثقافتی سرگرمیوں، اقدار و روایات اور منظّم کتب خانوں کا اس میں کچھ کم حصہ نہیں، دیسنہ میں انجمن الاصلاح اور استھانواں میں انجمن الفلاح اور ان کے نادر کتب خانوں سے اہل علم کو متعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جہاں دیسنہ کے اہل علم اور ارباب کمال کے تذکرہ (جن سے اس کی شہرت کو چار چاند لگے) اور اس کی علمی تاریخ کے ساتھ اس کے کتب خانہ کے تعارف میں مختلف اہل علم کے قلم سے متعدد مضامین نکلے، وہیں استھانواں کے نادر کتب خانہ اور اہل علم کے تعارف میں اس کے کسی فرزند کی کوئی تحریر نہیں ملتی، جبکہ یہ حقیقت ہے کہ عظیم آباد کی صحافت کی صف اول میں شامل دو عظیم المرتبت صاحبِ قلم مولانا سید رحیم الدین استھانوی اور مولانا سید عبدالغنی وارثی کا تعلق استھانواں ہی سے تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہر دور میں اس بستی کا کوئی نہ کوئی فرد صحافت سے وابستہ رہا ہے، مولانا سید عبدالغنی وارثی کی ایک نامکمل تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے اہل وطن کے حالات لکھنے کا ارادہ کیا تھا جو ان کی وفات سے تشنۂ تکمیل رہ گیا، اس کے علاوہ یہاں کے رجال کے حالات پر بھی کوئی مضمون شائع نہیں ہوا، ممکن ہے کسی نے کوشش کی ہو لیکن ہمارے سامنے کچھ بھی نہیں، ہاں وطن کے شاعر جناب مولانا سید علی حسن صاحب رونق استھانوی کی مثنوی ''یاد وطن'' میں یہاں کے چند بزرگوں

کا اجمالی خاکہ آ گیا ہے، لیکن کتب خانہ کے تعارف میں اب تک کسی مضمون کا علم نہیں ۔۱۹۵۴ء میں دیسنہ میں ''انجمن الاصلاح'' اور کتب خانہ کی جوبلی منائی گئی تو مشہور ادیب جناب پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے اس موقعہ پر ''ایک اور مشرقی کتب خانہ'' کے عنوان سے ایک کتابچہ تیار کیا جس میں وہاں کے مشاہیر کے مختصر تذکرہ کے ساتھ کتب خانہ کا مفصل تذکرہ وتاریخ پیش کی[1] ۔لیکن استھانواں کے کتب خانہ کے تعارف میں ایک مضمون بھی ہمارے علم کے مطابق نہیں نکلا، اور یہ کتب خانہ اپنی خصوصیات کے باوجود اس قدر گمنام ہے کہ ہمیں پٹنہ کے ۱۹۵۹ء کی مشہور **اردو نمائش** میں جہاں بہار کے اردو کے قدیم نوادرات جمع کئے گئے، کتب خانہ الاصلاح دسنہ کے ساتھ ہمیں **جانا** (جو استھانواں اور دیسنہ سے قریب ہی ایک اہم بستی ہے) کے غیر معروف کتب خانہ کے اردو نوادرات کا ذکر نظر آتا ہے، وہاں استھانواں کے کتب خانہ کا کوئی ذکر اس کی فہرست میں نہیں ملتا، جب کہ اس وقت یہاں اردو کے نوادرات کا بھی اچھا ذخیرہ تھا، جس کے کچھ نمونے اخیر میں راقم کی نظر سے بھی گذرے ہیں ۔کاش کہ استھانواں اور اس کے کتب خانہ الفلاح کو بھی کوئی ایسا صاحب قلم مل گیا ہوتا، عبدالقوی صاحب کے چند نوجوان معاصر استھانواں میں بھی تھے، جن میں معروف ادیب پروفیسر ظفر اگانوی کا نام سب سے نمایاں ہے، ان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم استھانواں ہی میں ہوئی اور ان کا ذوق مطالعہ اور علم خود ان کے اعتراف کے مطابق اسی کتب خانہ کا رہین منت ہے لیکن انہیں بھی اس کام کا موقع نہیں مل سکا۔

کتب خانہ استھانواں دیسنہ کے کتب خانہ سے زیادہ قدیم ہے، کتب خانہ الفلاح استھانواں کا سنہ تاسیس ۱۸۸۵ء ہے جبکہ کتب خانہ الاصلاح دیسنہ کا قیام ۱۸۹۸ء اور ۱۹۰۱ء کے درمیان ہوا۔ اور اس سے زیادہ قابل ذکر یہ ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی بات اگر مان لی جائے تو ہم اس کتب خانہ کو اگر پورے ہندستان نہیں تو احتیاطاً کم از کم پورے بہار کا سب سے پہلا باضابطہ اردو کتب خانہ ضرور قرار دے سکتے ہیں، اور اسی بنیاد پر عنوان مضمون میں اس کو بہار کا سب سے پہلا کتب خانہ قرار دیا گیا ہے، قارئین میں سے اگر کسی کے علم میں اس سے قدیم بہار کے کسی باضابطہ اردو کتب خانہ کا علم ہو وہ اس مضمون پر استدراک فرما کر ممنون فرمائیں گے تاکہ اہل علم مستفید ہوسکیں اور بہار کی علمی تاریخ کا ایک باب روشن ہو۔

سید صاحب نے اپنے وسیع علم ومطالعہ کے باوجود اپنے وطن کے کتب خانہ الاصلاح کے

متعلق فرمایا ہے کہ اس سے پہلے انہیں ہندستان میں کسی باضابطہ اردو کتب خانہ کا علم نہیں جو خاص اردو کتابوں کے لئے ہو، جب کہ کتب خانہ الفلاح کے ناصیۂ عمارت پر آج بھی ''الفلاح اردو لائبریری ۱۸۸۵ء'' ثبت ہے، شاید سید صاحب کو اس کا علم نہیں ہوسکا۔ سید صاحب اپنی مشہور ادبی کتاب ''نقوش سلیمانی'' کے ایک مضمون میں ہندستان میں اردو کے خصوصی کتب خانہ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''یہ امر افسوس کے قابل ہے کہ اردو کی کتابوں کا کوئی خاص مرکزی کتب خانہ نہیں، عموما مشرقی کتب خانہ کے ضمیمہ کی حیثیت سے ان کا وجود ہے، میرے علم میں خالص اردو کا سب سے پرانا کتب خانہ میرے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ میں کتب خانہ الاصلاح کے نام سے قائم ہے، یہ کتب خانہ ۱۸۹۹ء میں چند ناولوں سے شروع ہوا اور ۳۶ برس کی پیہم کوششوں سے اس میں خالص اردو کی تین ہزار نوسو بارہ کتابیں جمع ہیں''(۲)

جب کہ جناب علی حسن رونق استھانوی نے اپنی مثنوی میں ۱۹۳۰ء میں لکھا تھا کہ استھانواں کے کتاب خانے میں پانچ چھ ہزار کتابیں ہیں، ہر علوم وفنون کی کئی زبانوں میں ہیں۔(۳)

کتب خانہ کے تذکرہ سے پہلے استھانواں کے متعلق اہل علم کی مختلف تحریریں نذر قارئین کی جارہی ہیں جن سے وہاں کی بعض امتیازی خصوصیات اور اس کے علمی مقام ومرتبہ کا کسی قدر اندازہ ہوسکے گا، یہاں کے رجال وشخصیات کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔

استھانواں کے نامور فرزند مولانا سید محمد احسن استھانویؒ (م ۱۳۰۴ھ) اپنی تصنیف ''احسن البیان فی خواص القرآن'' میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''استھانواں، یہ شرفاء وسادات کی قدیم بستی بہار شریف ضلع پٹنہ (حال ضلع نالندہ بہار شریف) کے پورب صرف تین کوس (۱۲ کلومیٹر) پر واقع ہے، اور معزز وذی علم باشندوں کے باعث اطراف بہار میں ممتاز ومعروف رہی ہے، صاحب تذکرہ غوثیہ نے عارف باللہ حضرت شاہ غوث علی صاحب علیہ الرحمۃ کو یہیں کا ساکن لکھا ہے، جن کا مزار پرانوار پانی پت میں ہے، بستی کے اتر جانب کسی اور بزرگ کا بھی مزار ہے، طبقۂ علما میں بھی چند بزرگوار ممتاز گذرے ہیں، مولوی ابوالحسن صاحب عرف مولوی دلاور علی صاحب مرحوم شاگرد رشید مولانا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ یہیں کے باشندے تھے، مفتی شرف الدین یکے از علماے رامپور جب بہار تشریف لائے تو ان کی ملاقات

سے بہت محظوظ ہوئے، اوران کی جامعیت واستعداد کی بہت کچھ مدح کی،.....مولوی حکیم غلام جیلانی صاحب مرحوم شاگرد مولانا مفتی سعداللہ مرحوم ومولوی تراب علی صاحب مرحوم یہیں کے باشندے تھے، مولوی مجتبیٰ صاحب مرحوم شاگرد مفتی سعداللہ صاحب لکھنوی، مولوی سید وحیدالحق صاحب.....اور مولوی عبدالوہاب صاحب مرحوم جواردو، فارسی، عربی کے شعروسخن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے یہیں کے باشندے تھے''۔ (۴)

استھانواں کے ممتاز عالم وبزرگ مولانا سید وحیدالحق استھانوی کے نامور شاگرد مولانا مبارک کریم سپرنٹنڈنٹ مدارس اسلامیہ عربیہ بہار نے ۱۹۳۸ء میں ''استھانواں کی علمی عظمت وفضیلت'' کے عنوان سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

''یہ جگہ بہت ہی ممتاز ہے، اور مردم خیز ہے، علوم جدیدہ وقدیمہ کے حاملین ہر ایک زمانہ میں یہاں پائے گئے ہیں، اگر ایک طرف یہاں مولوی سراج الحق صاحب مرحوم ایسے ڈپٹی کلکٹر اور مسٹر محمود الحق صاحب مرحوم ایسے کلکتہ ہائی کورٹ کے کامیاب بیرسٹر اور خان بہادر سید محمد حسین صاحب مرحوم ایسے منسٹر ایجوکیشن اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار ہوتے گئے ہیں تو دوسری طرف جناب مولانا مولوی سید وحیدالحق صاحب مرحوم راس المحققین وبانی مدرسہ اسلامیہ بہار شریف، وجناب مولانا محمد احسن صاحب مرحوم تاج المدرسین وجناب مولوی سید عبدالغنی صاحب مرحوم وارثی ممتاز المصنفین والمترجمین وجناب مولوی سید رحیم الدین صاحب مرحوم ایڈیٹر الپنچ پٹنہ، ومولانا محمد احسن صاحب صاحب تصانیف کثیرہ وایڈیٹر تحفۂ محمدیہ کانپور وغیرہ وغیرہ علما وفضلاء پیدا ہوتے گئے ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ اب تک مذکورہ بالا بزرگوں اور اسی بستی کے لوگوں کے اولاد واحفاد میں اس کا سلسلہ جاری ہے۔

''محترمی جناب مولوی حافظ شرف الدین صاحب، محی الدین صاحب پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد اوران کے عزیز بھائی مولوی سید تقی الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر، مولوی اسرار الحق وکیل، مولوی عبدالرؤف صاحب سابق ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس، مولوی اسحاق صاحب وکیل، مولوی سید ہاشم صاحب اعلیٰ افسر دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، مولوی محمد یوسف صاحب متولی وقف اسٹیٹ بہار شریف، ایسے ایسے علم دوست، علمی دلچسپی رکھنے والے وغیرہ وغیرہ اسی خاک کے جواہر تاباں ہیں''(۵)

مولانا ابوالحسنات ندوی لکھتے ہیں: ''استھانواں مولانا حافظ وحیدالحق صاحب کا وطن ہے،

تلامذہ کی جماعت کثیر کے علاوہ آپ کے علمی فیوض کی زندہ یادگار مدرسہ اسلامیہ بہار (بہار شریف) ہے جو آج تک (یعنی ۱۹۲۰ء کے قریب تک، اب ختم ہو چکا ہے) اس دیار واطراف کے لئے سرچشمۂ علوم کا کام دیتا ہے، دوسرے عالم مولوی محمد احسن صاحب مرحوم بھی یہیں کے باشندے تھے، یہ زیادہ تر بہار (بہار شریف) کی خانقاہ محل میں مصروف درس وتدریس رہے''۔(۶)

مولانا محمد احسن نے مولانا سید نذیر حسین دہلوی سے استفادہ کیا تھا، مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی سوانح حیات ''الحیاۃ بعد الموت'' میں ان کے تلامذہ کی فہرست میں ان کا نام درج ہے۔(۷)

سید بدرالدین عظیم آبادی لکھتے ہیں: ''موضع دیسنہ سے متصل شریف مسلمانوں کی ایک دوسری بستی بھی ہے، جو اپنے مشاہیر کے سبب سے دیسنہ سے کم مشہور نہیں، اس کو استھانواں کہتے ہیں''۔(۸)

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ جن کے مولد اور ننہال ہونے کا شرف اسی بستی کو حاصل ہے اس کے بعض امتیازات وخصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس بات میں (یعنی قدیم وجدید کی ہم آہنگی میں) کم از کم ہمارے علاقہ مگہ (مگدھ) میں علمی اقدام اس کی طرف جس گاؤں کے باشندوں نے کیا، اس کے ناصیۂ فہرست میں سب سے پہلے جس بستی کا نام درج ہوسکتا ہے وہ استھانواں ہے۔''

آگے مزید اس کے تعارف میں رقم طراز ہیں:

''یہ استھانواں ضلع پٹنہ عظیم آباد کے تعلقہ (سب ڈویزن) بہار (شریف) سے تین کوس پورب ایک متوسط درجہ کا گاؤں ہے، آبادی کے لحاظ سے اس کو اپنے نواح کے دیہاتوں میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس علاقہ کا تھانہ، ہسپتال، بڑا ڈاکخانہ استھانواں ہی میں قائم ہے..... اگرچہ کوئی مستقل بازار نہیں، لیکن مختلف ٹولوں اور گلیوں میں بنیوں، حلوائیوں کی کچھ دکانیں پائی جاتی ہیں، اور معمولی ضرورت کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں، یہ اس شاہراہ پر واقع ہے جو اسٹیشن بہار (شریف) کو شیخپورہ اسٹیشن سے ملاتی ہے، ڈسٹرکٹ بورڈ کی اسی سڑک پر شیوخ کرام کی بستی 'جانا' اور سادات کا پاک قریہ محی الدین پور گیلانی (جس کا عام نام گیلانی ہے) واقع ہے''۔(۹)

یہ ۱۹۴۰ء کی رپورٹ ہے، اب الحمدللہ اس کا بڑا بازار بھی ہے، اور آبادی بھی کثیر ہے، اور

اب یہ قریہ کے بجائے قصبہ کہلانے کا مستحق ہے۔

استھانواں کے ایک اور نامور سپوت مولانا سید محمد ندوی ''استھانواں کی اہمیت'' کے عنوان سے اپنی ایک تحریر میں (جواب تک قلمی ہے) لکھتے ہیں: ''یہ بستی مختلف حیثیتوں سے بڑی تاریخی اہمیت و مرکزیت کی مالک ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ ہمیشہ سے یہ علم وفن، معارف وروحانیت کا سرچشمہ رہی ہے، بڑے بڑے اکابر علم وفضل اس کی گود میں پلے اور آفتاب علم وحکمت بن کر چمکے اور دنیائے علم وادب کو مستنیر کرتے رہے۔ حضرت مولنا سید وحید الحق بانی مدرسہ اسلامیہ بہار شریف، مولانا عبدالغنی وارثی مرحوم مصنف نعمت عظمیٰ وغیرہ، مولانا سید رحیم الدین مرحوم ایڈیٹر الپنچ، مولانا محمد احسن صاحب مشہور استاد معقولات، مولانا حکیم سید محمد احسن صاحب مشہور مصنف خواص القرآن وغیرہ، ملک محمود الحق بیرسٹر، مولوی سید محمد حسین صاحب وکیل سابق وزیر تعلیمات، اسی بستی کے رہنے والے تھے جن کے علمی وتعلیمی کارنامے معلوم ومشہور ہیں۔

حضرت مولانا شاہ برہان الدین شہیدؒ خلیفہ حضرت بختیار کاکیؒ[10] کا مزار پر انوار یہیں ہے، حضرت مولانا سید شاہ حمید الدین علیہ الرحمۃ[11] کے روحانی فیوض کا سرچشمہ یہیں ابل رہا ہے۔ قطب الاقطاب حضرت سید شاہ غوث علیؒ کا وطن مبارک یہی خطۂ پاک ہے، جن کا مزار اقدس پانی پت میں ہے''۔[12]

مثنوی یاد وطن (جو انجمن الفلاح سے شائع ہوئی ہے) کے اخیر میں ذمہ داروں کے قلم سے انجمن الفلاح اور اس کے کتب خانہ کا مختصر مگر جامع تعارف ہے یہاں اس کا نقل کرنا بھی خالی از افادہ نہیں۔ انجمن الفلاح کے عنوان سے لکھتے ہیں ''یہ انجمن عرصہ دراز سے موضع استھانواں، ضلع پٹنہ کے معزز وبااثر حضرات کی زیر سرپرستی قائم ہے اور اب تک اپنے فرائض منصبی کو بہ تمام وکمال انجام دے رہی ہے، چنانچہ اسی انجمن کی مساعی جمیلہ کا یہ نتیجہ ہے کہ آج دنیا استھانواں کی لائبریری کی ایک عظیم الشان عمارت دیکھ کر دنگ ہو رہی ہے، اسی کا یہ ادنی کرشمہ ہے کہ آج استھانواں کی لائبریری ہر قسم کی عربی، فارسی، انگریزی، اردو کی معتد بہ ہزاروں مطبوعہ وغیر مطبوعہ کتابوں کی ایک شہنشاہ کہی جاسکتی ہے''۔

انجمن الفلاح اور اس کے اس نادر کتب خانہ کا قیام کب عمل میں آیا، وہاں کن شخصیات کی تشریف آوری ہوئی؟ اس کے جواب کے لئے ہمارے پاس کوئی قدیم ریکارڈ موجود نہیں جس کی روشنی

میں ان سوالات کے تفصیلی جوابات دئے جاسکیں، ایک طویل عرصہ تک کتب خانہ بند رہنے کی وجہ سے اکثر قدیم ریکارڈ گردش ایام کی نذر ہو گئے۔

بعض کتب سے متعدد قد آور شخصیات اور بین الاقوامی شہرت یافتہ رجال علم کی تشریف آوری کا سراغ ملتا ہے، نیز اس کے اہم نوادرات کی طرف بھی جا بجا اشارے ملتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے کتب خانہ دیسنہ کے تعارفی کتابچہ میں وہاں تشریف لانے والے تمام اہل علم کے تأثرات درج کر کے انہیں محفوظ کر دیا ہے، جن سے کئی ممتاز اہل علم کی آمد کا سراغ ملتا ہے، اگر ان میں سے سب کے بارے میں نہیں تو کچھ کے بارے میں ضرور یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیسنہ کے ساتھ استھانواں کے کتب خانہ کو بھی انہوں نے اپنی تشریف آوری سے زینت بخشی ہوگی، نیز مدرسہ محمدیہ میں بھی بہت سی شخصیات کی آمد کا ذکر آیا ہے انہوں نے بھی اس کتب خانہ کو اپنی آمد سے رونق بخشی ہوگی۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق اور سر راس مسعود کی آمد تو اہل علم کے درمیان مشہور ہے، نیز بعض کتابوں پر ''ہدیہ از سر راس مسعود'' اور بعض پر ان کے دستخط بھی ان کی آمد کی توثیق کرتے ہیں، بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بھی بعض تحریریں نیز مدرسہ محمدیہ میں ان کے تاثرات بھی ان کی یہاں آمد کی تصریح کرتے ہیں، یہ دونوں استھانواں کے دو ممتاز اہل علم بیرسٹر سید محی الدین استھانوی پرنسپل عثمانیہ کالج اورنگ آباد (دکن) اور ان کے برادر خورد سید تقی الدین استھانوی (جو ریاست حیدرآباد کے ممتاز عہدہ دار اور کتب خانہ استھانواں کے روح رواں تھے) کے تعلقات کی بنا پر تشریف لائے تھے۔

ہندستان کے ایک اور ممتاز عالم، تحریک ندوۃ العلما کے ممتاز رکن اور اس کی تاسیس میں دور اول کے شریک، صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، جن کے مولانا سید عبدالغنی وارثی سے دیرینہ مراسم کی بنا پر ان کی وفات کے بعد ان کے دونوں صاحبزادوں سید محی الدین و سید تقی الدین سے قریبی تعلقات تھے، نیز حضرت موصوف حضرت علامہ سید سلیمان ندوی اور حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے بزرگوں اور علمی سرپرستوں میں تھے، دیسنہ کے تأثرات کی فہرست میں ان کا نام بھی نظر آتا ہے، اہل علم ان کے علمی مزاج و مذاق سے واقف ہیں، کتب خانہ استھانواں میں ان کی آمد کا علم خود ان کے بعض تحریری اشاروں سے ہوتا ہے، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''واقعی دل پسند گیلانی، بہار شریف

کی حاضری کی دل میں تمنا ہے''۔(۱۳)

یہ ۱۲ر ستمبر ۱۹۳۸ء کا خط ہے، ۱۸ر اکتوبر کے مکتوب میں پھر تحریر فرماتے ہیں: ''الحمدللہ میں بخیریت واپس آ گیا، دیسنہ اور استھانواں کے کتب خانوں کو کچھ رسائل بھیجنا چاہتا ہوں، ان کا پتہ تحریر ہو تو ممنون ہوں گا۔''

۲۹ر اکتوبر کے خط میں تحریر فرماتے ہیں: ''الحمدللہ سفر پٹنہ انبساط و شگفتگی کا ہی رہا، خستگی یا تکان بھی محسوس نہیں ہوئی..... میرے قلب نے ان بستیوں کی سیر سے جو روحانیت حاصل کی اس کا بیان دشوار ہے''۔ مولانا سید محمد ندوی کی تصریح کے مطابق یہ سب حضرات ایک ہی دن مدرسہ تشریف لائے تھے، مولانا لکھتے ہیں ''۴ر اکتوبر ۱۹۳۸ء کا دن مدرسہ کی تاریخ میں انتہائی خوش قسمتی کا دن تھا جس دن ہندستان کے .....ماہرین تعلیم و تربیت نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، صدر مدرسہ محمدیہ حاجی مولوی سید محی الدین صاحب و سید نجم الہدی صاحب پروفیسر اردو پٹنہ کالج، جو [انجمن ترقی اردو کی] کانفرنس کی شرکت کے لئے پٹنہ تشریف لائے تھے، مدرسہ محمدیہ کو اپنے قدوم مبارک سے شرف بخشا، مدرسہ کی طرف سے تمام معزز مہمانوں، مولانا شیروانی، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق صاحب وغیرہم کو ہار پہنایا گیا، مولانا شیروانی اور ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمت میں طلبہ نے ایڈریس پیش کئے، مولانا شیروانی نے نہایت موثر انداز میں جواب دیا، طلبہ و اساتذہ کو عمدہ نصیحت فرمائی اور عربی تعلیم کے قیام و بقا کو اسلامی زندگی کے لئے ضروری قرار دیا، تنگی وقت کی وجہ سے مولانا شیروانی زیادہ قیام نہ کر سکے، شام کو طلبہ و اساتذہ کے سامنے ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے زبان اردو کی خدمت کے متعلق پر جوش تقریر فرمائی، اور ۵ر اکتوبر کو صدر مدرسہ حاجی مولوی سید محی الدین صاحب، ڈاکٹر عبدالحق صاحب، سکریٹری مدرسہ بورڈ مولوی سید نجم الہدی ندوی نے مدرسہ کا معائنہ فرمایا اور اپنی غیر معمولی مسرت کا اظہار فرمایا''۔(۱۴)

راجستھان کے مشہور بزرگ حضرت شاہ ہدایت علی مجددی جے پوری کی آمد اور ان کے ہاتھ مدرسہ کے سنگ بنیاد کا بھی ذکر ہے، جو بانی مدرسہ الحاج سید تقی الدین استھانوی کے پیر و مرشد تھے، نیز بھوپال کے تاج الحکماء کرنل عبدالرحمٰن صاحب کی آمد کا بھی ذکر ہے، یقیناً ان دونوں بزرگوں کی آمد سے کتب خانہ بھی شرف یاب ہوا ہوگا۔

یہاں ہم نے صرف دور دراز کے اہل علم کی آمد کا ذکر کیا ہے، بہت سے علاقہ کے بزرگوں اور علمی شہرت یافتہ شخصیات کا ذکر خاص طور پر نہیں کیا گیا کہ ان کی آمد دوسروں کے لئے ضرور سرمایۂ فخر ہے، لیکن ہمارے لئے وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی بہار کے دور گورنری میں استھانواں اور دسنہ کی آمد ایک یادگار موقع تھا، اسی موقع سے دونوں کتب خانوں کے تمام منتخب کتب ونوادر کو انہوں نے پٹنہ میں کتب خانہ خدا بخش میں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا، استھانواں کے اہل علم کے بقول انہوں نے یہاں تقریر بھی کی اور کتابوں کا انتخاب بھی کر لیا گیا، لیکن یہاں کے نوجوان طلباء اور علما اس پر راضی نہ ہوئے۔ اہل دیسنہ نے ان کی پیشکش قبول کر کے بہت دانشمندی کا ثبوت دیا، اور وہاں کا پورا کتب خانہ پٹنہ منتقل ہو گیا اس طرح گرچہ بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن وطن کی روح نکل گئی لیکن ایک بین الاقوامی کتب خانہ میں منتقل ہو کر یہ کتابیں نہ صرف وہاں محفوظ ہو گئیں بلکہ اس کے ساتھ اس سے استفادہ کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا اور اب اہل علم کی تحریروں میں دیسنہ سیکشن کے نام سے اس کا تذکرہ عام طور پر نظر آتا ہے، لیکن اہل استھانواں نے یہ مطالبہ رد کر دیا جس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آسکا اور کتابوں کا بڑا حصہ باہمی آویزشوں کی نذر ہو کر ضائع ہو گیا۔

کتب خانہ کے قیام کی تاریخ جیسا کہ اس کے ناصیۂ عمارت پر ثبت ہے ۱۸۸۵ء (۱۳۰۲-۰۵ھ) ہے، لیکن اس کا قیام کس باہمت شخص کی کوششوں کا رہین منت ہے، آیا تنہا ایک فرد کے سر اس کی تاسیس کا سہرا ہے۔ یا وطن کے اہل علم کی مجموعی کوششوں کا نتیجہ ہے، اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں ملتی، یہ دور علمی حیثیت اور اہل علم کی کثرت کے اعتبار سے اس بستی کا عہد زریں کہلانے کا مستحق ہے، جس میں ایک طرف بہار شریف میں مولانا سید وحید الحق استھانویؒ، مولانا سید محمد احسن استھانویؒ اور مولانا سید ابوالبرکات استھانویؒ جیسی شخصیات مشغول افادہ تھیں تو دوسری طرف عظیم آباد کا افق صحافت اسی بستی کے دوستاروں کی روشنی سے منور تھا، مولانا سید رحیم الدین کا الپنچ اسی سال کی یادگار ہے، مولانا سید عبدالغنی وارثی نے اردو انڈین کرانیکل کی ادارت اسی دور میں سنبھالی تھی، یہ شخصیتیں گو اپنے وطن میں نہیں تھیں، لیکن اس سے دور اور غافل بھی نہیں تھیں، اس لئے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ کتب خانہ ان کی مجموعی کوششوں کا نتیجہ ہو اور پھر اہل وطن اس کے بعد اپنی اپنی

کتابیں اس میں منتقل کرتے رہے ہوں، یا ان کی وفات کے بعد ان اخلاف کے ذریعہ منتقل ہوئی ہوں، جیسا کہ حضرت مولانا سید وحید الحق استھانوی کی بعض قلمی کتابوں اور مولانا سید ابوالبرکات و مولانا سید محمد احسن کی تحریر کردہ کتابوں کی موجودگی سے اندازہ ہوتا ہے، گرچہ الفلاح میگزین میں رونق استھانوی کے ایک مضمون نیز ان کی مثنوی ''یاد وطن'' کے حسب تصریح انجمن الفلاح کے بانی جناب فضل الرحمٰن صاحب ہیں، لیکن پھر بھی اس کی توسیع و تنظیم میں اہل وطن کی مجموعی کوششوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جناب رونق کتب خانہ کے متعلق، جس کی موجودہ پرشکوہ عمارت، شاید ان کی مثنوی کی تخلیق کے وقت (۱۹۳۰ء میں) بن کر تیار ہوئی تھی، لکھتے ہیں:

لائبریری بھی ہوگئی تیار — الفلاح اس کو کہتے ہیں ہوشیار
ہے یہ اعزاز وجاہ استھانواں — اس میں لاکھوں ہیں خوبیاں پنہاں(۵)

فضل الرحمٰن صاحب اور ان کے والد کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تھے لطافت کریم اک ایسے — نہ وکالت میں تھا کوئی بڑھ کے
ان کے فرزند فضل رحماں تھے — خوبیوں کے وہ گویا سلطاں تھے
ام اے تھے لکچرر علی گڑھ کے — طلباء فیض پاتے تھے ان سے
چرچا ان کا ہے شہرت ان کی ہے — یادگار ان کی الفلاح بھی ہے(۱۶)

کتب خانہ سب سے پہلے کس عمارت میں قائم ہوا اس کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی، جناب فضل الرحمٰن صاحب کے نواسے الحاج شعیب احمد گیلانی صاحب کی تصریح کے مطابق جناب حافظ شرف الدین صاحب رئیس استھانواں کی حویلی میں تھا، حافظ صاحب کی علم دوستی(۱۷) اور ان کی وسیع و کشادہ حویلی کو (جو ابھی چند سال پہلے تک گاؤں کے وسط میں موجود تھی اور آج بھی کتب خانہ کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی) پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ پھر موجودہ عمارت کی تعمیر سے قبل اس سے قریب ہی ایک قدیم عمارت میں جو جناب اسرار الحق صاحب وکیل کلکتہ ہائی کورٹ کا مسکن تھا، منتقل ہوا، یہ عمارت اب داس جی اسکول کے نام سے معروف ہے، مدرسہ محمدیہ بھی کچھ دنوں کے لئے یہاں منتقل ہوا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں وطن کے مخیّر و محسن سید تقی الدین استھانوی فرزند مولانا سید عبدالغنی وارثی کی کوشش و توجہ سے ریاست حیدرآباد کے مالی

تعاون سے موجودہ عمارت بن کر تیار ہوئی تو کتب خانہ کو وہاں منتقل کیا گیا، اس کتب خانہ کے فروغ میں وطن کے اہل علم نے آگے بڑھ کر حصہ لیا، خصوصًا یہاں کے بیشتر اہل علم بیسویں صدی کے آغاز سے تقسیم ہند تک ریاست حیدرآباد کے معزز علمی عہدوں پر فائز رہے، اس لئے وہاں کے علمی اداروں کی بیشتر مطبوعات کتب خانہ کی زینت تھیں، دارالترجمہ عثمانیہ حیدرآباد کی تقریبًا تمام مطبوعات یہاں فراہم کی گئی تھیں، وہاں کے دوسرے مشہور علمی وتحقیقی ادارہ ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' کے تیسرے ناظم علامہ سید ہاشم ندوی اسی بستی کے نامور سپوت تھے اس لئے وہاں کی بھی اکثر علمی مطبوعات یہاں موجود تھیں، نیز مولانا ابوالوفاء افغانی کے ادارہ لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد کے مطبوعات کی بھی بڑی تعداد تھی، دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تصانیف اور معارف کے قدیم شماروں کا بھی قابل قدر ذخیرہ تھا، لیکن افسوس کہ:

کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی

اس کتب خانہ کے نوادر ومخطوطات کا بڑا حصہ اہل وطن کی بدمذاقی پر قربان ہو چکا ہے، از سر ترتیب وتنظیم اور بعض قدیم وجدید مطبوعات ومخطوطات کے حصول کے بعد کتابوں کی مجموعی تعداد ۳۲ ہزار کے مابین ہوگی، جن میں قدیم مصنفین کی تصانیف کی متعدد قدیم طباعتیں اور بہت سی قدیم الاشاعت کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو کے چند مخطوطات وقلمی کتب ہیں۔

مخطوطات کے تذکرہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے فارسی ملفوظات وتصانیف کے متعدد قلمی نسخے ہیں، جو بہت ہی عمدہ حالت میں اور قابل استفادہ ہیں، ان میں بیشتر استھانواں ہی کے ایک بزرگ مولانا سید ابوالبرکات استھانویؒ کے تحریر کردہ ہیں جو خانقاہ معظم بہار شریف کے صاحب سجادہ حضرت شاہ امین فردوسی کے دست گرفتہ اور ان سے وابستہ تھے، شاہ صاحب نے انہیں خلافت بھی عطا فرمائی تھی، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ خانقاہ ہی میں مستقل قیام تھا، خوش نویس ہونے کے ساتھ اچھے شاعر اور عالم بھی تھے، ۱۲ر ذی الحجہ ۱۳۱۸ھ ہجری (۱۹۰۱ء) میں وفات پائی اور احاطۂ مخدوم میں دفن ہوئے، ان کی اکثر کتابوں پر ''عطیہ سید علی مرتضٰی صدیقی ۱۹۳۵ء'' تحریر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں ۱۹۳۵ء میں کتب خانہ الفلاح کو ہدیہ کی گئیں، اس سے قبل یہ ذاتی ملکیت تھیں، یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ عطیہ دہندہ سید علی مرتضی سے

مولانا ابوالبرکات کا کیا تعلق تھا، آیا وہ ان کے خاندان کے کوئی فرد تھے یا کوئی اور، بہرحال حضرت مخدوم کے وہ رسائل حسب ذیل ہیں:

(۱) رسالہ اجوبہ

ترقیمۂ کاتب: ''تمام شد ایں رسالہ اجوبہ من تحریر الشیخ الکامل حضرت مخدوم الملک مخدوم شرف الدین احمد یحیٰ منیری قدس اللہ ارواحہما بتاریخ بست ویکم[۲۱] شعبان المعظم در شہر بہار محلّہ خانقاہ واقع ۱۳۰۸ ہجری، خاکسار زمن بندہ محمد احسن غفرلہ بخط خام تحریر نمود''۔

کاتب نسخہ مولانا محمد احسن استھانوی کا تذکرہ اقتباسات کے ذیل میں گذر چکا ہے، اپنے ہم وطن ومعاصر مولانا سید وحید الحق استھانویؒ کے قائم کردہ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں تدریسی خدمت انجام دیتے تھے، تاریخ وفات کا علم نہیں، بعض تحریروں سے ۱۹۲۲ء (۱۳۰۴ء) تک ان کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔

(۲) کنز المعانی، بہت خوشخط نسخہ ہے، تحریر بھی خوب ہے۔

(۳) مخ المعانی، مجموعہ ملفوظات حضرت مخدوم، ترقیمہ کی عبارت ہے: ''تمت ہذہ النسخۃ المسماۃ بمخ المعانی من ملفوظات مخدوم جہاں شرف الدین احمد منیری قدس اللہ سرہ العزیز واقع دہم (۱۰) شہر ربیع الاول ۱۳۰۶ ہجری، فقط''۔

(۴) فوائد رکنی از حضرت مخدوم الملک، ناقص الاخر اور کرم خوردہ۔

(۵) مکتوبات، ناقص الاخر۔

(۶) ملفوظ دیگر از حضرت مخدوم، ناقص الاول والاخر۔ بہت ہی عمدہ اور خوشخط نسخہ ہے۔

(۷) مناقب الاصفیاء: حضرت مخدوم الملک کے حالات پر ان کے پھوپھی زاد برادر حضرت شیخ شعیب بن جلال شیخ پوروی کی مشہور تصنیف، خوشخط، مکتوبہ از مولانا سید ابوالبرکات استھانوی،

ترقیمہ کی عبارت (سرخ روشنائی سے) یہ ہے: ''الحمد للہ کہ نسخہ متبرکہ ہذا یعنی مناقب الاصفیاء مؤلفہ حضرت مخدوم شعیب علیہ الرحمہ کہ در مناقب ومحامد بزرگان فردوسی ست، رضوان اللہ علیہم اجمعین، در عہد دولت بندگی حضرت شاہ امین صاحب قبلہ مدظلہ العالی در سنہ

۱۳۱۱ہجری (تقریباً ۱۸۹۴ء) از دست بندہ ناچیز عبد حقیر خاطی وعاصی سید ابوالبرکات ابن سید وارث علی غفر اللہ لہ ولابیہ، بآستانہ حضرت پیر بزرگوار بمقام خانقاہ درحیز کتابت آمد.....''۔

(۸) مکتوبات حضرت مظفر شمس بلخی، مکتوبہ ۱۳۰۹ھ (تقریباً ۱۸۹۲ء)

حضرت مخدوم الملک کے خلیفہ وجانشین حضرت مظفر شمس بلخی کے مکتوبات کا مجموعہ، کاتب: سید ابوالبرکات استھانوی، مکمل، بہت ہی عمدہ اور خوشخط نسخہ ہے، ترقیمہ کی عبارت یہ ہے: ''الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین، کہ مکتوبات قدسی آیات قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین حضرت مخدوم شاہ مظفر شمس بلخی قدس اللہ سرہ العزیز بماہ صفر (۱۳۰۹ہجری) بمقام خانقاہ حضرت بہار (بہار شریف) باتمام رسید''۔

(۹) مونس القلوب: از شیخ احمد لنگر دریا بلخی

بہت ہی عمدہ اور خوشخط نسخہ ہے، ترقیمہ کی عبارت یہ ہے: ''الحمد للہ کہ ایں ملفوظ خوش اسلوب مسمی بمونس القلوب از ملفوظات حضرت مخدوم قدوۃ العارفین برہان العاشقین مفخر بنی آدم من خلفاء حضرت ابراہیم ادہم حضرت شیخ احمد لنگر دریا ابن شیخ حسن ابن شیخ حسین المعروف بنوشہ توحید بن حضرت مولانا مظفر بلخی قدس اللہ سرہ العزیز دراوان فیض اقتران سجادگی حضرتنا ومولانا ومرشدنا سالک مسالک، واقف رموز حقیقت ومعرفت جناب فیض مآب بندگی عالی جناب حضرت امین احمد صاحب قبلہ دام ظلہ العالی درسنہ (؟) ہجری بضبط تحریر آمد''

سنہ کتابت پڑھا نہیں جا سکا، قیاس غالب ہے کہ دیگر سابق کتابوں کی طرح اس کا سنہ کتابت بھی ۱۳۰۹ہجری ہی ہوگا،

(۱۰) شرح حضرات خمس: حضرت حسین بلخی نوشہ توحید بلخی۔

ترقیمہ: ''الحمد للہ کہ نسخہ متبرکہ مؤلفہ حضرت شیخ حسن بن حسین بلخی مسمہ بکاشف الاسلام شرح حضرات خمس..... باتمام رسید''

اس کتاب کے اخیر میں بھاشا زبان کے بہت سے اشعار بھی ہیں۔

(۱۱) مولانا سید ابوالبرکات استھانوی کی مکتوبہ کتابوں کے ساتھ ان کا ایک اہم مجموعۂ خطوط بھی

قابل ذکر ہے، جوانہوں نے خانقاہ معظم بہار شریف کے دوران قیام لکھے ہیں، نیز دیگر لوگوں کے خطوط بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شامل مجموعہ ہیں، اس کے مسودہ نویس شیام نرائن بہاری ہیں، ترقیمہ میں (جو سرخ روشنائی سے ہے) لکھتے ہیں، ''۱۳۰۶ فصلی (مطابق ۱۳۱۶ ہجری و ۱۸۹۹ء) بقلم شیام نرائن بہاری''۔

حوالے:

(۱) عبدالقوی دسنوی صاحب کی دیگر تحریروں میں بھی جابجا اس کتب خانہ کا ذکر آیا ہے جن میں اس کتب خانہ سے ان کے جذباتی تعلق کی آہٹ صاف سنائی دیتی ہے اور وہ اس کے ممنون نظر آتے ہیں۔ (۲) مضمون ہماری زبان بیسویں صدی میں، معارف، دسمبر ۱۹۳۷ء نیز نقوش سلیمانی (۳) مثنوی یادوطن، ص۴ (۴) احسن البیان فی خواص القرآن، مقدمہ۔ (۵) کتاب المعائنہ مدرسہ محمدیہ استھانواں۔ (۶) ہندستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، از مولانا ابوالحسنات ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڈھ ۲۰۰۸ ص: ۳۸۔ (۷) دیکھئے ص: ۳۴۴ مطبوعہ مطبع اکبری آگرہ ۱۳۲۶ھ ۱۹۰۸ء۔ (۸) حقیقت بھی کہانی بھی از بدرالدین عظیم آبادی ص ۴۸۹ مطبوعہ اردو اکادمی پٹنہ۔ (۹) مضامین گیلانی مرتبہ مظفر گیلانی ص: ۸۷ مطبوعہ اردو اکیڈمی پٹنہ۔ (۱۰) یہ بات قابل غور ہے، قدیم مآخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی (۱۱) ان کے حالات کا بھی علم نہیں (۱۲) تاریخ مدرسہ محمدیہ استھانواں (قلمی) از مولانا سید محمد ندوی، مملوکہ عکس راقم۔ (۱۳) مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ (۱۴) قلمی تاریخ مدرسہ محمدیہ، ورق، ۱۰، ۱۱ (۱۵) مثنوی یاد وطن، ص۴ (۱۶) ایضا، ص ۱۱ (۱۷) حافظ شرف الدین صاحب نے مولانا بشارت کریم دسنوی شاگرد مولانا سید نذیر حسین مونگیری ثم دہلوی سے علم حدیث کی تعلیم حاصل کی تھی، انہوں نے خود استھانواں میں رہ کر حافظ صاحب کو کتب حدیث کا دورہ کرایا تھا، ۱۹۵۱ء کے قریب پٹنہ میں ان کا انتقال ہوا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

نثر کے بُنیادی خصائص: چند مباحث

ساری دنیا میں لفظی اظہار کے دو پیرایے ہیں: شاعری اور نثر۔ نثر اظہار کا وہ پیرایہ ہے جس میں خیال وخبر کی راست ترسیل ہوتی ہے۔ یہ لفظی اظہار کا وہ بنیادی سانچا ہے جس میں افکار وخیالات اور معلومات واطلاعات سادہ اور فطری آہنگ کے ساتھ ادا ہوتے ہیں۔ کاروبار حیات میں نثر ہی کا استعمال ہوتا ہے۔ شعر یا شاعری اظہار کا پُر تکلف، پیچیدہ، پابند اور خصوصی پیرایہ ہے۔ شعر کسی گہرے تاثر، شدید جذبے، لطیف احساس یا کسی انوکھے تجربے کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ جب کہ نثر ہمارے روز مرّہ کی ضرورتوں اور معاشرتی وتمدنی سرگرمیوں میں ہماری شرکت وشمولیت کا آلہ ہے۔

نثر کے رنگ اور اسالیب بے شمار ہیں۔ لکھنے والے کی شخصیت، عہد اور ماحول کے تقاضے اور موضوع کی مناسبت سے نثر اپنا اسلوب یا رنگ اختیار کرتی ہے۔ یہ کبھی سادہ وسہل ہوتی ہے تو کبھی دقیق، کبھی سنجیدہ ومتین ہوتی ہے تو کبھی شوخ ورنگین۔ اس کی اس خصوصیت پر ایک ناقد نے مندرجہ ذیل لفظوں میں روشنی ڈالی ہے:

> ''نثر کا ایک رنگ نہیں وہ ایک کثیر المقاصد اظہار ہے..... اس کی کامیابی تو اس کے موضوع کے مقتضیات سے پوری طرح عہدہ برآ ہونے پر منحصر ہے۔ چنانچہ نثر میں ایک ایسی اسلوبی لچک ہے جس کی بنا پر وہ گوناگوں مقاصد کے لیے موزوں اسلوبی خصوصیات اختیار کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ نثر مزاجی طور پر اس سفید رنگ کی طرح ہے جس میں سارے رنگ شامل ہیں اور جس پر سارے رنگ چڑھ جاتے ہیں۔''(۱)

نثر کی تعریفیں اردو اور انگریزی کی بے شمار کتابوں میں ملتی ہیں مگر ان سب کو یہاں نقل کرنا نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔ صرف ادبی اصطلاحات کی ڈکشنری مرتبہ جے۔ اے۔ کڈن میں نثر کی جو تعریف

مندرج ہے، ملاحظہ ہو:

ترجمہ: ''پروز کا لفظ لاطینی لفظ 'Prosa' یا 'Proversa oratio، سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے سیدھی سادی گفتگو۔ اس طرح نثر زبان کی ایک راست اور غیر آراستہ فارم ہے جو عام استعمال میں بولی یا لکھی جاتی ہے۔ یہ شاعری (Poetry) یا نظم (verse) سے اس طور پر مختلف ہے کہ یہ آہنگ، بحر یا قافیے میں مقید نہیں ہوتی۔ پھر بھی شاعرانہ نثر اور نثری نظم جیسی چیزیں پائی جاتی ہیں۔''

نثر وہ طرزِ گفتگو ہے جو بول چال اور روزمرہ کی ضرورتوں میں بے تکلف استعمال ہوتی ہے۔ لیکن جب یہ خاص موضوعات خصوصاً ادبی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی ہے تو اس میں قدرے تکلف اور جمالیاتی عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ادبی نثر، بعض اوقات شعر کی کچھ خصوصیات کی حامل معلوم ہوتی ہے۔

نثر اور شعر میں خارجی اور سطحی فرق تو وہی ہے کہ شعر کلامِ موزوں ہے اور نثر کلام غیر موزوں۔ شعر یا شاعری میں وزن کی پابندی ہوتی ہے، اس کے برعکس نثر میں وزن کی پابندی نہیں ہوتی۔ نثر اور شعر میں بنیادی اور اولین فرق اسی وزن اور آہنگ کا ہے۔ شعر کا آہنگ عروضی ہوتا ہے جس میں تکرار پائی جاتی ہے۔ یہ آہنگ مرتب، مدوّر اور مکرر ہوتا ہے۔ جب کہ نثر کا آہنگ وزن و بحر سے عاری ہوتا ہے۔ اس آہنگ میں تکرار کے بجائے تنوع پایا جاتا ہے۔ شعری آہنگ کو ابھارنے اور نمایاں کرنے میں کئی چیزیں ممد و معاون ہوتی ہیں مثلاً بحر، ہم آواز الفاظ، تکرار، تجنیس صوتی، قافیہ، ردیف وغیرہ۔ شعر میں آہنگ اور ترنّم کی بڑی اہمیت ہے بلکہ یہ شعر کی پہچان میں داخل ہے۔ شمیم احمد نے اس سلسلے میں بجا طور پر لکھا ہے:

''شعر محض کلام موزوں نہ سہی، لیکن اگر ہم عالمی ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ دنیا کی ہر زبان میں شعر کے لیے موزونیت ایک بنیادی ضرورت رہی ہے..... کولرج نے یہاں تک کہا ہے کہ شعر چیز ہی ایسی ہے جو موزونیت کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ شاعری میں جو معنویت اور جمالیاتی قوت ہے، اس میں اس کے آہنگ کو بھی دخل

ہے۔''(۳)

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ نثر میں جو آہنگ پایا جاتا ہے وہ شعری آہنگ سے یکسر مختلف ہے۔ نثر مرجّز اور مقفّیٰ میں جو آہنگ پایا جاتا ہے اس پر شعری آہنگ کا دھوکا ہوتا ہے، لیکن یہ آہنگ شعری آہنگ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ نثر مُرجّز اور نثر مقفّیٰ میں دو لفظ یا دو سے زیادہ ترکیبیں آپس میں ہم وزن ہوتی ہیں لیکن ان سے مرتب آہنگ جس کی تکرار بھی ہو سکے، پیدا نہیں ہوتا۔ نثر مقفّیٰ میں تُک بندی کا آہنگ ہوتا ہے، وزن بحر کا آہنگ نہیں ہوتا۔

نثر اور شعر میں دوسرا اہم فرق اجمال اور تفصیل کا ہے۔ شعر فطری طور پر تفصیل سے احتراز کرتا ہے یعنی پھیلاؤ، تشریح و توضیح اور باتوں کو کھول کھول کر بیان کرنا شعر کا کام نہیں۔ نثر خیال کو آئینہ بناتا ہے، اس لیے وضاحت، قطعیت اور تفصیل نثر کا خاصہ ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر کے اجمال کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شعر کا اجمال دراصل ان الفاظ کا اخراج ہے جن کے بغیر نثر کا تصور ناممکن ہے۔''(۴)

شعر میں متکلم اور مخاطب کا وجود ہم فرض کر لیتے ہیں یہ اس کا Convention ہے۔ نثر میں مخاطب اور متکلم اور وہ درمیانی الفاظ ناگزیر ہوتے ہیں جن کی عدم موجودگی میں نثر ٹوٹی ہوئی اور بے ربط نظر آتی ہے۔

شعر کے اجمال سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ نثر میں اختصار اور ایجاز نہیں ہوتا۔ اختصار و ایجاز ایک علیحدہ خوبی یا خصوصیت ہے۔ یہ خوبی شعر اور نثر دونوں میں پائی جا سکتی ہے بلکہ پائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں فاروقی لکھتے ہیں:

> ''تفصیل کا اخراج شعر کا بنیادی عمل ہے، میں اسے اجمال کا نام دیتا ہوں۔ اجمال سے میری مراد وہ اختصار یا ایجاز نہیں ہے جس کے بارے میں شیکسپیئر نے اور دوسروں نے کہا ہے کہ حسن کلام کی جان ہے۔ ایسا ایجاز تو نثر میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ ہونا چاہئے۔''(۵)

نثر کو جو چیز نثر بناتی ہے وہ اجمال اور موزونیت کی عدم موجودگی ہے۔ تخلیقی نثر میں شعر کے بعض لوازم اور خواص در آتے ہیں مثلاً تشبیہ، استعارہ، وغیرہ۔ لیکن اجمال کی عدم موجودگی، نثر میں پائے

جانے والے ان استعاروں اور تشبیہوں کو پوری طرح پھیلنے نہیں دیتی۔ ایسی نثر شعری آب و رنگ رکھنے کے باوجود نثر ہی رہتی ہے شعر نہیں بنتی۔

شعر اور نثر کا تیسرا فرق یہ ہے کہ شاعری میں خیال اور جذبے کی ترجمانی کے لئے استعارہ، پیکر، علامت اور تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے جب کہ نثر میں خیال وخبر کی ترجمانی وترسیل کے لئے عموماً سادہ اور غیر آراستہ اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔ شاعری میں شعریت صرف اجمال سے پیدا نہیں ہوتی۔ جب تک شعر میں جدلیاتی الفاظ، استعارہ، علامت وغیرہ نہ لائے جائیں، اس میں شعریت پیدا نہیں ہوتی۔ جدلیاتی الفاظ جب شعر میں آتے ہیں وہ ہمارے تخیل، حافظے اور واہمے کو مہمیز کرتے ہیں۔ نثر میں اگر کبھی استعارے یا تشبیہیں وغیرہ آجاتی ہیں تو وہ ابہام اور اجمال کے ساتھ نہیں آتیں۔ اس لیے نثر نثر ہی رہتی ہے شاعری نہیں بنتی۔

شاعری کا تعلق بنیادی طور پر احساسات وجذبات سے ہے جب کہ نثر کا تعلق فکر وخیال سے ہے۔ زندگی کے متعلق نظریے، مفروضے اور تمدنی مسائل ومباحث کی ترجمانی کے لیے نثر ہی کا سانچا مناسب تر ہے۔ شاعری اور نثر کے جداگانہ کردار کے سبب ان کے مزاج میں بھی نمایاں فرق ہے۔ شاعری ہمارے اعصاب اور حواس پر چھا جانے کی کوشش کرتی ہے، نثر ہمارے اعصاب وحواس پر چھا جانے کے بجائے عقلی سطح پر ترغیب دینے اور مطمئن کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نثر سوچنے کے انداز میں وضاحت پیدا کرتی ہے۔ اس میں شاعری کا اجمال نہیں ہوتا مگر اختصار، ایجاز اور جامعیت پائی جاتی ہے۔ مشہور انگریز ناقد ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) نے نثر اور شاعری کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شاعری تخلیقی اظہار ہے اور نثر تعمیری اظہار ہے[۶]۔ ہربرٹ ریڈ کی بات درست ہے۔ مگر یہ بھی درست ہے کہ نثر اور شاعری دونوں میں تعمیر اور تخلیق کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ ہاں شاعری میں تخلیق کا عنصر غالب رہتا ہے اور نثر میں تعمیر کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے بہت اہم بات کہی ہے:

> ''ہر فنی کارنامہ خواہ وہ نثر کا ہو یا شاعری کا در اصل Artifact ہے۔ یوں تو ہر طرح کی تخلیق شعوری اور غیر شعوری عناصر کے امتزاج باہمی سے وجود میں آتی ہے۔ یعنی اس میں ایلیٹ کے بقول تجربے کی شیرازہ بندی کا وہ خاموش اور ناقابل فہم عمل بھی پایا جاتا ہے جسے ہم غیر شعوری عنصر سے متعلق

کر سکتے ہیں، اور فنی اہتمام وانصرام بھی، جو شعوری اور پیہم توجہ اور کوشش چاہتا ہے۔ جس نقطے پر یہ دونوں عناصر ملتے ہیں، وہیں فنی کارنامہ ظاہر ہوجاتا ہے۔ عمومی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری تخلیقی جوہر اور توانائی کا مظہر ہوتی ہے؛ اور نثر تعمیری صلاحیت اور قدرت کا۔ یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شاعری اور نثر میں دونوں عناصر کم وبیش موجود ہوتے ہیں۔ فرق صرف اُن کے تناسب میں ہوتا ہے جس کی بنا پر ہم کسی ایک عنصر کو ایک مخصوص اسلوب بیان سے متعلق کر دیتے ہیں۔''(۷)

نثر فکر وخیال کی زبان ہے اس کے باوجود اس میں جذبات پائے جا سکتے ہیں۔ لیکن جذبات سطح کے نیچے ہوتے ہیں اور ان پر عقل کا سخت پہرا رہتا ہے۔ اس وجہ سے جذبات غالب نہیں آنے پاتے۔ نثر میں منطق کی حکمرانی، مہذب ومتین لہجے کی کارفرمائی اور استعارہ وتشبیہ کی تقلیل سے جذبات کی روک تھام ہوتی ہے۔ نثر میں الفاظ کے استعمال پر ہمیشہ تعقّل کی گرفت اور تخیّل کی دھوپ چھاؤں پر واقعیت کی نگرانی رہتی ہے، جس کے سبب نثر میں ایک ایسا اعتدال پیدا ہوتا ہے جو اسے شاعری سے ممیّز کرتا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اس پہلو پر بہت معقول گفتگو کی ہے:

''نثر کا عمل محاکمہ اور انضباط چاہتا ہے۔ شاعری میں جذبات کی حد بندی بحور اور اوزان سے کی جاتی ہے۔ نثر میں تقلیل الفاظ، منطق کی حکمرانی اور استعارے کا فقدان، یہ سب عناصر روک تھام کا کام کرتے ہیں۔ بے قید جذبات اور بے قید خیالات دونوں اچھے ادب میں جگہ پانے کے مستحق نہیں ہوتے۔ ان کی قطع و برید بھی لازمی ہے۔ لیکن شاعری میں اس قطع و برید کے باوجود اشاریت کا عنصر غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ نثر میں معروضیت، لاتعلقی اور منطقی انداز لازمی شرائط ہیں۔''(۸)

الفاظ کے استعمال کے معاملے میں نظم ونثر کے درمیان نمایاں فرق ہوتا ہے۔ نثر میں الفاظ کی حیثیت مستقل اور متعیّن نقوش کی ہوتی ہے کیونکہ اس کی اساس دلائل، شواہد اور منطقی بحث پر ہوتی ہے۔ اس لیے نثر میں الفاظ سکڑتے پھیلتے نہیں اور نہ رنگوں کے خوابناک اور دھندلے دائرے بناتے ہیں بلکہ فکر وخیال کے چہرے کو متعین نقوش اور روشن خدوخال عطا کرتے ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد

انصاری نے بجا لکھا ہے:

''نظم و نثر کی زبان میں یہ فرق ہے کہ شاعری میں الفاظ متلازم آوازیں رکھتے ہیں اور ان کے مابین لطیف اور نازک امتیازات سے جادو جگانے کا کام لیا جاتا ہے۔ نثر میں الفاظ اشیا کے مکانی (Spatial) پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ان کا مفہوم متعین اور واضح ہوتا ہے۔ شاعری میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ اپنے Tentacles رکھتے ہیں جو ہمارے ذہن کو دوسرے الفاظ، تلازمات اور ان کی رواں دواں پرچھائیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔..... نثر میں الفاظ ارتکاز اور انجماد کی طرف میلان رکھتے ہیں اور مختلف سمتوں میں کھلتے اور پھیلتے نہیں۔ ان کا مفہوم مقید و متعین ہوتا ہے۔ اس لیے پیکر نگاری نثر کے لیے ضروری نہیں اور نثر کا تعلق حافظے اور واہمے کی گہرائی سے نہیں ہوتا۔''(۹)

شاعری اور نثر کے مذکورہ بالا فرق و امتیاز کی وضاحت سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ شاعری اپنی تمام شعریت، اجمال اور ابہام کے باوجود نثر سے اپنا رشتہ قائم رکھتی ہے، زبان کے بنیادی ڈھانچے کے معاملے میں، صرفی و نحوی اصول کی پابندی میں۔ اس لیے انگریزی کے مشہور نقاد ٹی ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ اچھی شاعری کی اول اور کم سے کم ضرورت یہ ہے کہ وہ اچھی نثر کی خوبیاں یا محاسن رکھتی ہو۔(۱۰)

اور نثر بھی شاعری کے قریب آجاتی ہے جب جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے استعاروں، تشبیہوں، علامتوں اور تزئین کے دیگر لوازم سے کام لیتی ہے۔ شعر اور نثر کی اسی قربت کے پیش نظر انگریزی نقاد ایس۔ ٹی۔ کولرج نے کہا ہے کہ شاعری نثر کی نقیض نہیں بلکہ سائنس کی نقیض ہے؛ شاعری سائنس کی ضد ہے اور نثر بحر کی ضد ہے۔(۱۱)

نثر کے اسلوب کو تین باتیں متاثر اور متعین کرتی ہیں۔ اول موضوع، دوم مصنف کی شخصیت، سوم عہد اور ماحول۔ مارجوری بولٹن نے اپنی کتاب The Anatomy of Prose میں تفاعل (function) کے اعتبار سے نثر کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں:

(الف) بیانیہ (Narrative)

(ب)استدلالی (Argumentative)

(ج)ڈرامائی (Dramatic)

(د)معلوماتی (Informative)

(ہ)تاثراتی (Contemplative)[۱۲]

بلاغت کی کتابوں میں نثر کی اقسام بیان کی گئی ہیں۔صورت کے لحاظ سے نثر کی چار قسمیں ہیں۔نثر کی ان قسموں کو لفظی اقسام بھی کہتے ہیں:

(i)نثرِ مُرجّز (ii)نثرِ مُسجّع (iii)نثرِ مقفّیٰ (iv)نثرِ عاری

معنی کے اعتبار سے بھی نثر کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں:

(i)دقیق رنگین (ii)دقیق سادہ (iii)سلیس رنگین (iv)سلیس سادہ

اسلوبی نقطۂ نظر سے نثر کی صرف دو قسمیں ہیں:

(الف)سادہ نثر (ب)مُرصّع نثر

(الف) سادہ نثر: نثر عاری کو ہم سادہ نثر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہی نثر کا فطری اور بنیادی اسلوب یا سانچا ہے۔اس اسلوب نثر میں تکلف، تصنّع اور آرائش نہیں ہوتی۔اس میں سلاست، روانی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔

یہ شعوری طور پر ہر طرح کی سجاوٹ اور بناوٹ سے پاک ہوتی ہے۔قافیہ بندی اور ترصیع کا یہاں گزر نہیں ہوتا۔اتفاقی طور پر قافیے عبارت میں آجائیں تو آجائیں مگر شعوری طور پر مقفّیٰ لکھنے کی کوشش نہیں ملتی۔

(ب)مرصّع نثر (Ornamate Prose) میرے نزدیک یہ نثر کی وہ قسم ہے جس میں ہر طرح کی ترصیع ہوتی ہے۔نثرِ مُرجّز، نثرِ مسجّع، نثرِ مقفّیٰ تینوں کو اس میں شامل سمجھنا چاہئے۔ان کے علاوہ ایسی نثر میں صنائع و بدائع کا شعوری استعمال ہوتا ہے۔خاص نوع کے آہنگ یا صوتی زیر و بم پیدا کرنے کی سعی کو بھی نثر کی ترصیع سمجھنا چاہئے۔ایک فقرے یا جملے کے بالمقابل دوسرا فقرہ یا جملہ اس طرح لکھا جائے کہ توازن و تطابق پیدا ہو، اسے بھی مرصع کاری کا حصہ ماننا چاہئے۔ ہمارے یہاں شاعرانہ نثر کی اصطلاح پائی جاتی ہے۔شاعرانہ نثر بھی مرصع نثر ہی ہے، اس لیے کہ اس میں بھی سجاوٹ اور ترصیع کے وہی سب انداز اپنائے جاتے ہیں جو انداز مرصّع نگاری کے سلسلے میں اختیار کیے جاتے ہیں۔

مرصع نثر کی خاص خصوصیت تکلّف اور عبارت آرائی ہے۔ مصنف ایسی نثر کئی وجہ سے لکھتا ہے: کبھی جذبات میں گرمی پیدا کرنے کیلئے، کبھی قاری کو متحیر ومبہوت کرنے کی غرض سے، اور کبھی اپنی علمیت اور قابلیت کی نمائش کے لئے۔ ایسی نثر فکر کے افلاس اور خیال کی تنگ دامانی کو چھُپانے کے لئے بھی لکھی جاتی ہے۔ مرصع کاری جب حد اعتدال سے تجاوز کر جاتی ہے تو سراسر آورد اور تصنع کا احساس ہوتا ہے۔ مگر جب یہ سادگی اور سلاست سے مل کر اپنے آورد کو چھپانے میں کامیاب ہوجاتی ہے تو ایک پُرکشش اسلوب پیدا ہوتا ہے جو جمالیاتی انبساط عطا کرتا ہے۔

سادگی اور مرصع کاری کے سلسلے میں بعض غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں اُن کو دور کر لینا ضروری ہے۔ بعض کم یا نیم تعلیم یافتہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو سجاوٹ اور مرصع کاری سے عاری ہو، خوبصورت اور اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سجاوٹ یا مرصع کاری کچھ ایسی چیزیں ہیں جو کسی فن پارے میں الگ یا اوپر سے ٹانک دی جاتی ہیں۔ یہ بڑی بھول ہے۔ ہر رنگین اور چمک دار شے خوبصورت اور اعلیٰ درجے کی نہیں ہوتی۔ سادگی جسے ہم بادی النظر میں سادگی سمجھتے ہیں، پُرکار بھی ہوسکتی ہے۔

دوسری غلط فہمی (fallacy) بعض خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ کہ مُرصّع اسلوب بناوٹ اور تصنّع کی پیداوار ہے اس لیے فن پارے کی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ ایسی نثر محض لسانی کرتب بازی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی جواز نہیں۔ یہ تاریخ ادب کے ناقص مطالعے کی وجہ سے پیدا ہونے والا تعصب ہے۔ مُرصع نگاری جب obsession ہوجائے، جب یہ محض نمود علمیت بن جائے اور جب یہ موضوع سے ہم آہنگ نہ ہو تو یقیناً ناپسندیدہ اور فضول ہے۔ مگر جب مرصع کاری لکھنے والے کی شخصیت میں رچ بس کر موضوع سے ہم آہنگ ہوجائے اور ایک منضبط صورت میں جلوہ گر ہو تو اس کی جمالیاتی خوبیوں اور اسلوبی محاسن کا مطالعہ و تجزیہ کیا جانا چاہئے۔ مُرصع نثر کبھی خاص طرح کا تاثر پیدا کرنے اور کبھی جذباتی حرارت کی سطح کو اوپر اُٹھانے کے لیے لکھی جاتی ہے جیسا کہ جے۔ اے۔ کڈن نے کہا ہے۔ (۱۳)

سادگی نثر کی بنیادی خصوصیت ہے، مگر اپنی بہترین ادبی تحریروں سے بے اعتنائی و بے خبری لکھنے والے کی نثر کو سپاٹ، خشک اور بے رنگ بھی بنا دیتی ہے۔ یہ نکتہ اچھے لکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے۔

حواشی

(۱)ماہنامہ آجکل نئی دہلی، اپریل ۱۹۸۲ء، ص ۱۷، مضمون نگار حامد حسین۔

(۲)A dictionary of literary terms, page 525

(۳)درس بلاغت، ص ۱۷۶

(۴)شعر غیر شعر اور نثر، ص ۴۱

(۵)ایضاً، ص ۴۱

(۶)English Prose Style, page 10

(۷)ادب اور تنقید، ص ۱۰۸

(۸)ایضاً، ص ۱۱۲

(۹)ایضاً، ص ۱۱۰

(۱۰)بحوالہ اردو شاعری پر ایک نظر، جلد دوم، ص ۶۳

(۱۱)The Penguine Dictionary of Quotations, page 16

(۱۲)The Anatomy of Prose, page 5,6

(۱۳)A Dictionary of Literary terms, page 509

کتابیات

(۱)ادب اور تنقید، ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری، سنگم پبلشر، زالہ آباد ۱۹۶۸ء

(۲)اردو شاعری پر ایک نظر، حصہ دوم، کلیم الدین احمد، موتی لال بنارسی داس، پٹنہ ۴، ۱۹۶۴ء

(۳)درسِ بلاغت، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی

(۴)شعر غیر شعر اور نثر، شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون، کتاب گھر، الہ آباد، ۱۹۸۵ء

(۵)ماہنامہ آجکل، نئی دہلی اپریل ۱۹۸۲ء

6. A Dictionary of Literary Terms by J.A. Cuddon

7. English prose Style by Herbert Read.

8. The Anatomy of Prose by Marjorie Bolton, New Delhi 1979

9. The Penguine Dictionary of Quotations, by J.M.&M.J. Coher ELBS London 1967

☆☆☆

پیشکش: ڈاکٹر فردالحسن

سردار جعفری کے اہم خطوط

بنام ڈاکٹر محمد حسن

(مسودات خدا بخش لائبریری میں محفوظ)

انڈین لٹریچر، ۱۹۰/بی، کھیت واڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴

۱۲/ مارچ ۵۳ء

برادرم تسلیم! یقین ہے کہ آپ نے اردو ہندی کے سوال پر اپنے خیالات قلمبند کرائے ہوں گے، انڈین لٹریچر چھپنے جا رہا ہے، اپنا مضمون جلد بھیج دیجئے۔ میں نے یہ بھی گذارش کی تھی کہ اردو ہندی کے ادبی روپ میں جو فرق ہے اس پر بھی ایک نوٹ میرے لئے لکھ دیجئے، وہ بھی تیار ہوگا۔

آپ کے جواب کا انتظار ہے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، ۲۳۳/کھیت واڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴

۲/اپریل ۵۳ء

برادرم، تسلیم! ایک خط دو ہفتے پہلے لکھ چکا ہوں لیکن جواب سے اب تک محروم ہوں، اردو ہندی کے مسئلے پر آپ نے جو کچھ لکھنے کا وعدہ کیا تھا وہ اب پورا کر دیجئے تو بڑی عنایت ہو، اردو اور ہندی کے ادبی اسٹائل میں کیا فرق ہے، اس کے بارے میں بھی میں نے آپ سے ایک نوٹ لکھنے کی درخواست کی تھی اور آپ نے غالباً اس کا کچھ حصہ لکھ بھی لیا تھا، اس کی شدید ضرورت ہے، آپ کے بغیر میرا بہت سا کام رکا ہوا ہے۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے، آپ کے جواب کا انتظار ہے۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ،۲۳۳/کھیت واڑی، مین روڈ بمبئی
۱۳/ جون ۵۳ء

برادرم محمد حسن صاحب تسلیم! آپ کا خط ملا، شکریہ۔ حیرت ہے کہ زبان کے مسئلے پر آپ کا بھیجا ہوا مقالہ مجھے نہیں ملا، بدقسمتی سے اردو والوں کی طرف سے اب تک مجھے کوئی چیز نہیں مل سکی ہے، اور ہندی والوں نے ایک درجن سے زیادہ مقالے بھیج دیئے ہیں۔ اگر آپ کا مقالہ مجھے مل جاتا تو کچھ تو آنسو پچھ جاتے، اگر آپ مجھے اپنے مقالے کی نقل فوراً بھیج سکیں تو بہت اچھا ہے۔ میں ۲۰/ جنوری تک بمبئی سے باہر نکلنے والا ہوں، اور جانے سے پہلے انڈین لٹریچر کا نیا پرچہ پریس میں دے دینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی چیز مجھے نہ ملی تو صرف ہندی والوں پر ہی اکتفا کرنی پڑے گی۔ مہربانی کر کے ہندی اور اردو اسٹائل کے فرق پر جو رپورٹ آپ نے تیار کی ہے وہ بھی بھیج دیجئے۔ مجھے اس کی شدید ترین ضرورت ہے۔

انڈین لٹریچر کا تازہ شمارہ پرسوں بھجواؤں گا۔ میں دو مہینے کے لئے کشمیر جا رہا ہوں اور علاقائی زبان کی کانفرنس میں شاید شریک ہوسکوں۔ حیات نے دعوت نامہ تو بھیجا ہے لیکن میں اس سے پہلے اپنا کشمیر کا پروگرام بنا چکا تھا، چونکہ بیوی بچے بھی ساتھ جا رہے ہیں، اور ان کی چھٹی کا سوال ہے اس لئے اس پروگرام کو ملتوی کرنا ممکن نہیں ہے۔ مگر میں آپ کی کانفرنس کے لئے ایک نوٹ بھیج رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، کھیت واڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴
۱۰/ دسمبر ۵۵ء

برادرم محمد حسن صاحب تسلیم! میں لکھنو سے واپس آ گیا ہوں، فی الحال میرے لئے بمبئی سے دوبارہ باہر نکلنا آسان نہیں ہے، اس لئے اس ماہ میں علی گڑھ میں ملاقات کا وعدہ شاید پورا نہ ہوسکے۔ مجھے مجاز کے بکس میں ان کی کچھ غیر مطبوعہ غزلیں ملی ہیں، اور بعض غزلیں بہت اچھی ہیں۔ وہ زیادہ تر رانچی کی تخلیق ہیں، میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہوں، غالباً آپ نے مجھ سے لکھنو میں یہ کہا تھا کہ مجاز کی کچھ رانچی کی کہی ہوئی چیزیں آپ کے پاس بھی ہیں۔ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید اس میں بھی کچھ کام کی چیزیں مل جائیں۔ ایسی صورت میں پچیس تیس غزلوں کا ایک مجموعہ مرتب ہوسکتا ہے، اگر مجموعہ نہ بن سکا تو میں اپنے طویل مضمون میں جو آج کل لکھ رہا ہوں، ان غزلوں کو شامل کرلوں گا۔ میرے پاس جو چیزیں ہیں وہ بڑی دلچسپ ہیں ایک شعر تحفۃً بھیج رہا ہوں۔

ابھی دور ہے وہ غزال تمنا

بہت دام پھینکے، بہت تیر مارے (دلّی دور ہے)

آپ کے پاس جو چیزیں ہیں وہ میں دیکھ کر واپس کر دوں گا، یا احتیاطاً آپ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ اس کی نقل مجھے بھیج دیجئے۔ میں نے سنا ہے کہ مجاز کی زندگی اور شاعری پر آپ ایک کتاب بھی لکھ رہے ہیں، یہاں ہم لوگ مجاز کی زندگی پر ایک فلم بنانے کا ارادہ کر رہے ہیں، جس کی آمدنی سے ہم ایک مجاز فنڈ قائم کر دیں جو یا تو ہمارے محبوب شاعر کی یادگار کے لئے کام آسکے گا، یا ضرورت مند ادیبوں کی وقتی امداد کے لئے، بہرحال جیسا بھی دوستوں کا مشورہ ہوگا ویسا کیا جائے گا۔

آپ نے لکھنؤ میں اپنی کتابیں بھی عنایت کرنے کا وعدہ کیا تھا، میں بڑے شوق سے وفائے وعدہ کا انتظار کر رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، کھیت واڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴

۲۷/ دسمبر ۵۵ء

برادرم تسلیم! آپ کا خط ملا، شکریہ، آج ہی لکھنؤ سے حمیدہ کا خط بھی آیا ہے اور انہوں نے بھی لکھا ہے کہ بشیر صاحب لٹن لائبریری میں مجاز کی تحریریں محفوظ کرنا چاہتے ہیں، بہت اچھا خیال ہے، میرے پاس جو کچھ ہے حاضر کر دوں گا، مناسب یہ ہوگا کہ لائبریری میں مجاز کے نام کا ایک کونا بنا دیا جائے جس میں مجاز کی تحریریں، آہنگ کے مختلف ایڈیشن اور کچھ تصویریں جمع کر دی جائیں، علی گڑھ یونیورسٹی پر مجاز کا حق سب سے زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ حکومت ہند سے بات کر کے مجاز کی نظموں کے کچھ ریکارڈ بھی حاصل کر لئے جائیں، ان کا محفوظ رہنا بہت ضروری ہے، آنے والی نسلیں مجاز کی آواز سن سکیں گی، میں نے سویت یونین میں مایا کوفسکی کے ریکارڈ سنے ہیں ابھی مجاز کے بعض رکارڈ اچھی حالت میں ہیں۔ اگر یونیورسٹی بھی تحریک کرے تو یہاں جو فلم بنانا چاہتے ہیں اس کی بھی ایک کاپی یونیورسٹی کو نذر کر دیں گے۔ مجاز پر کہانی میں خود لکھ رہا ہوں اور فلم میں ایک عزیز دوست کی شخصیت اور کردار کو مسخ نہ ہونے دوں گا۔ اس کی طرف سے اطمینان رکھئے، اس کے لئے مجھے مجاز کی زندگی کے زیادہ سے زیادہ واقعات کی ضرورت ہے، آپ نے جو میٹیریل جمع کیا ہے وہ مجھے دیکھنے کے لئے بھیج دیجئے۔ رجسٹری کے ذریعہ سے روانہ کر دیجئے اور اطمینان رکھئے کہ وہ ضائع نہیں ہوگا۔ میں آپ کو

فروری میں واپس کردوں گا۔ میں اسے فلم کی کہانی کے لئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ جو ناول کے انداز کی چیز ایریل کی طرح کی لکھنا چاہتے ہیں، وہ ضرور لکھئے، ناول اور افسانے میرے بس کی چیزیں نہیں ہیں۔

مجاز کے سلسلے میں ہم لوگ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کے لئے اگر کمیٹی بن جائے تو بہتر ہے۔ سرور صاحب سے بات کر کے کمیٹی ی تشکیل کر ڈالئے۔ یہاں ہم لوگ ایک تو فلم بنانا چاہتے ہیں اور دوسرے مجاز کی غیر مطبوعہ چیزوں کو ایک چھوٹی سی کتاب کی شکل میں چھاپنا چاہتے ہیں۔ ان دونوں کی آمدنی ہم مجاز فنڈ کے لئے دے دیں گے۔

میں فروری میں علی گڑھ آرہا ہوں، تفصیلی باتیں اس وقت کروں گا، فی الحال اب مجھے مجاز پر اپنا میٹیریل اور ان کی غیر مطبوعہ چیزیں جو آپ کے پاس ہیں بھیج دیجئے۔ آپ کی کتابوں کا بھی شدید انتظار ہے۔

امید ہے کہ بخیر ہوں گے۔ آپ کا سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، کھیت واڑی، بمبئی۔۴

۲۲/نومبر ۵۶ء

برادرم تسلیم! آپ کا ۱۷/نومبر کا خط پرسوں ملا۔ یاد آوری کا شکریہ میں اب اچھا ہوں، اور اس ماہ کے آخر تک مجھے سفر کرنے کی اجازت مل جائے گی، ویسے میں سفر کرنے کے قابل ہوں لیکن چونکہ علاج جاری ہے، اس لئے یہاں رکنا پڑ رہا ہے، مجھے ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے سلسلے میں اس ماہ کے شروع میں دہلی جانا تھا، لیکن اپنی بیماری کی وجہ سے نہ جاسکا، اب میں جلد سے جلد دہلی پہونچنا چاہتا ہوں۔

میں مجاز مرحوم کی برسی میں ضرور شریک ہوں گا۔ کیا پروگرام ایک ہفتے کا ہے؟ آپ نے مجھے علی گڑھ ۴/دسمبر کو بلایا ہے۔ لیکن برسی کی تاریخ ۱۱/دسمبر لکھی ہے، میرے لئے شاید علی گڑھ میں ایک ہفتے ٹھہرنا ممکن نہ ہو۔ اس لئے مجھے بواپسی ڈاک مطلع کیجئے کہ میں کس تاریخ کو علی گڑھ پہنچ جاؤں، کل میری عدم موجودگی میں ساحر آئے تھے اور وہ کہہ گئے ہیں کہ وہ بھی علی گڑھ جائیں گے اور شاید میری طرف سے بھی انہوں نے وعدہ کرلیا ہے، عصمت بھی دہلی جانے والی ہیں، میں کوشش کروں گا کہ انھیں بھی علی گڑھ پکڑ لاؤں۔

آپ کے جواب کا انتظار ہے، امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔ تمام احباب کو سلام کہئے گا۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، کھیت واڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴
۴/ مارچ ۵۷ء

برادرم محمد حسن، تسلیم! نقوش سات میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ حالانکہ مجھے اس کے بعض حصوں سے اختلاف ہے، لیکن جزوی اختلاف کے باوجود بحیثیت مجموعی میں آپ کا ہم خیال ہوں اور بہت بڑی حد تک اس تنقید سے بھی متفق ہوں جو آپ نے میری شاعری پر کی ہے اور میں اس کے لئے آپ کا شکر گذار ہوں جس حصے سے اتفاق نہیں ہے اس کا ذکر اس لئے کرنا مناسب نہیں سمجھتا کہ میں اپنی شاعری کی آپ جمایت کرنے کا عادی نہیں ہوں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں جولائی سے ایک سہ ماہی رسالہ **''نگاہ''** نکال رہا ہوں۔ نقوش کے سائز کا ڈھائی سو صفحات کا پرچہ ہوگا اور ٹائپ میں شائع کیا جائے گا۔ میں پرچے کی علمی حیثیت کو بلند رکھنے کی کوشش کروں گا۔ اس لئے ہر اشاعت میں ایک طویل اور مفصل مضمون ہوا کرے گا۔ پہلے مضمون کے لئے آپ کو زحمت دینا چاہتا ہوں۔ اقبال، جوشؔ، جگرؔ اور پریم چند کے بعد کے پانچ ترقی پسند شاعروں اور پانچ ترقی پسند افسانہ نگاروں پر ایک سو صفحے کا مضمون لکھ دیجئے جس میں ان کی تخلیقات پر مفصل بحث ہو۔ آپ ہر ایک کے اچھے اور کمزور دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈال سکتے ہیں، مضمون آپ جیسا لکھیں گے ویسا ہی شایع کیا جائے گا اور اس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی جائے گی۔ معاوضے کا لفظ میں استعمال نہ کروں گا، لیکن ایک چھوٹی سی رقم جو آپ کے مضمون کے مقابلے میں حقیر ہوگی پیش کرنے کی کوشش کروں گا، اگر مجھے آپ کا مقالہ اپریل کے آخری ہفتے میں مل جائے تو مناسب ہوگا۔

ابھی میں نے تمام ادیبوں کو خطوط نہیں لکھے ہیں، تمام چیزیں چھپ جائیں تو انہیں لکھوں، آپ کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ وقت کم ہے، اور ایک طویل مقالے کے لئے آپ کو کم سے کم دو مہینے مل جائیں۔ امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔

اس مہینے کے آخر میں علی گڑھ آ رہا ہوں، اس وقت ملاقات ہوگی۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، کھیتواڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴۔
۱۲/ مارچ ۵۷ء

برادرم محمد حسن صاحب تسلیم! آپ کا خط ملا۔ مجھے اندازہ ہے کہ ایک مہینے میں اتنا بڑا مقالہ

مکمل کرنا مشکل ہوگا، اس لئے یہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ اس بار پانچ یا چھ افسانہ نگاروں پر لکھ دیجئے۔ اور وسط مئی تک اسے مکمل کر کے بھیج دیجئے۔ صفحات پچاس ساٹھ کافی ہوں گے، دوسری اشاعت کے لئے شاعروں پر لکھ دیجئے گا۔

غالباً مجھے یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہمیں اپنے پرچے کے لئے عام قسم کا مضمون نہیں چاہیے جس میں اکثر و بیشتر مصنفین کی فہرست ہوئی ہے اور بار ہا کے کہے ہوئے ''عام اصول'' دہرا دئے جاتے ہیں، میں آپ سے عملی اور تخلیقی قسم کی تنقید کی درخواست کر رہا ہوں۔ مثلاً میرا خیال یہ ہے کہ کرشن، منٹو، عصمت، بیدی، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی وغیرہ ہر ایک الگ الگ مضمون کا مستحق ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے مضمون میں جن افسانہ نگاروں کو لیں گے ان کی خصوصیات پر (اچھی اور بری دونوں) کھل کے لکھیں گے۔

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہر پرچے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے علاوہ دو طویل ادبی اور علمی مضامین، ایک مباحثہ، ایک ناول اور ایک طویل نظم شائع کریں، بیرونی تراجم پر بھی خاص طور سے توجہ کرنا چاہتے ہیں، مثال کے طور پر ایشیائی ممالک کا جدید ادب یا امریکی افسانہ نگاری جس کے ترجمے اردو میں بہت کم ہوئے ہیں اور جس کا اچھا اثر ہمارے ادب پر پڑ سکتا ہے، اس بار ہم مباحثے کے لئے ''سوشلزم کا مستقبل'' عنوان قرار دینا چاہتے ہیں۔ ایک سوال نامہ بنا کر مختلف ادیبوں کے پاس بھیجا جائے گا پھر اس کے جوابات کو مرتب کر کے شائع کیا جائے گا۔

ابھی ہم نے تمام ادیبوں کو خطوط نہیں لکھے ہیں اور نہ عام اعلان کیا ہے۔ تیاریاں مکمل ہوتے ہی اعلان کیا جائے گا۔ آپ کو اور بعض دوسرے احباب کو خصوصی مضامین کے لئے لکھا ہے۔

امید ہے کہ آپ کو اب قیود کی شکایت نہ ہوگی، صفحات بھی کم ہو گئے ہیں، مصنفین کی تعداد بھی زیادہ نہیں دی گئی ہے، اور وقت بھی بڑھا دیا ہے۔

پرچے کے سلسلے میں کوئی مشورہ ہو تو ضرور دیجئے، یہ پرچہ میرا کرشن چند اور احمد عباس کا ذاتی، پرچہ ہے، جسے ہم ترقی پسند حدود میں رہتے ہوئے مختلف الخیال رویوں کا ترجمان بنانے کی کوشش کریں گے۔ داخلی اور ہیئتی قسم کے تجربوں کو بھی جگہ دیں گے اور فنی معیار کی طرف سے کوتاہی نہیں برتیں گے۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

Nigah

Urdu Publishers, 63, Moreland Road, Bombay-8

۲۴/اکتوبر ۵۷ء

برادرم تسلیم! آپ کو غالباً اس کا علم ہوگا کہ میں اردو اور ہندی میں دیوان غالب کا ایک خاص ایڈیشن شائع کر رہا ہوں، جو فروری ۵۸ء میں تیار ہو جائے گا، دیوان کے آخر میں غزلوں کے مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ ہندی ترجموں کے ساتھ ہوگی، کیا یہ ممکن ہے کہ یہ کام آپ کر دیں؟ میرا خیال ہے کہ کوئی تین چار ہزار الفاظ ہندی میں ترجمہ کرنا ہوں گے۔ یہ کام مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر ہو جانا چاہیے۔ اگر آپ زحمت کریں تو شکر گذار ہوں گا۔ معاوضے کی رقم معقول ہوگی اور فرہنگ موصول ہونے پر آپ کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔ اگر آپ کچھ پیشگی چاہیں تو وہ بھی ممکن ہے۔ جواب فوراً دیجئے تا کہ اس ہفتے میں فیصلہ ہو جائے، میرے پاس وقت کم ہے۔

یہ پیشکش میں آپ کو ہندستانی بک ٹرسٹ کی طرف سے کر رہا ہوں۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

Nigah

Urdu Publishers, 63, Moreland Road, Bombay-8

۲۴/اکتوبر ۵۷ء

برادرم محمد حسن صاحب تسلیم! آپ کا خط ملا، میرا کوئی قصیدہ مکمل نہیں اس لئے مکمل صورت میں کوئی چیز آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔

آپ افسانہ نگاروں پر اپنا مضمون آئندہ شمارے کے لئے دے دیجئے گا، فی الحال کوئی دوسرا مقالہ تیار ہو تو بھیج دیجئے۔ یا اگر ممکن ہو تو موجودہ دور میں نظم اور غزل کی جو کشمکش ہے اس پر ایک مضمون لکھ دیجئے، سنا ہے کہ آپ نے علی گڑھ میگزین میں کوئی ایسا مضمون لکھا ہے، میں چاہتا ہوں کہ نگار کے اصناف سخن نمبر میں مجنوں اور فراق کے مضامین (غزل پر) جو شائع ہوئے ہیں انہیں پیش نظر رکھ کر آپ اپنا مضمون دوبارہ لکھ دیجئے۔ میرا خیال ہے کہ مجنوں نے غزل کو ایک صنف کے بجائے ایک کیفیت بنا دیا ہے اور ہمہ اوست کی طرح ساری شاعری کو ''ہمہ غزل است'' کی صورت میں دیکھا ہے اور وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے ہیں کہ اعلیٰ ترین نظم کا بھی بہترین کارنامہ وہ اس کے کسی شعر یا مصرعے کو سمجھتے ہیں

جوضرب المثل بن سکے۔شاعری کا یہ معیار میری سمجھ سے باہر ہے۔
امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔

آپ کا،سردار جعفری

☆

Nigah

Urdu Publishers, 63, Moreland Road, Bombay-8

۸/نومبر ۵۷ء

برادرم تسلیم! آپ کا خط چند روز ہوئے ملا تھا۔جواب میں تاخیر ہوگئی،آپ اپنا مقالہ اب بھی دے دیں تو میں نگاہ میں شامل کرسکتا ہوں حالانکہ وقت بہت کم ہے۔آپ کو حیرت ہوگی کہ ایک سال کی کوشش کے باوجود میں اب تک کوئی مضمون حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ایک بھی دوست کا وعدہ شرمندۂ وفا ہوا۔یہی حال دیوان غالب کی فرہنگ کا ہے۔میں پریشان ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں،ڈاکٹر مسعود حسین خان نے انکار کردیا تھا،احتشام سے دو ماہ سے خط وکتابت جاری ہے مگر وہ اب تک ''اگر مگر'' کے حدود سے آگے نہیں بڑھے ہیں،گذشتہ ماہ بیس بائیس دن تک جواب نہیں آیا تو میں نے سجاد ظہیر سے بات کی انہوں نے لکھنؤ جا کر خط لکھا کہ وہ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں،پھر انہوں نے بھی جواب گول کردیا تو میں نے آپ کو لکھا،آپ کا جواب آنے سے پہلے ان کا خط آیا کہ وہ کام کرسکتے ہیں،میں نے تفصیلات لکھ کر تصدیق چاہی،اس کا جواب اب تک غائب ہے۔اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ بنے بھائی اور احتشام سے کیسے معاملہ کروں اور آپ کو کیا جواب دوں۔

آپ کا سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ،کھیت واڑی،مین روڈ،بمبئی۔۴

۲۶/نومبر ۵۷ء

برادرم تسلیم! آپ کا خط مورخہ ۱۹/نومبر کل بھوپال سے واپسی پر ملا،میں نے یوم مجاز کے متعلق ایک خط آپ کو بھوپال جانے سے پہلے لکھا تھا،لیکن وہ غلطی سے پیڈ میں رکھا گیا،یوم مجاز میں میرے لئے شریک ہونا تقریباً ناممکن ہے۔میری صحت خراب ہے اور مالی حالت اس سے زیادہ خراب۔کل دس دن بعد بھوپال سے آیا ہوں اور حیدرآباد کے ایک دوست یہاں موجود ہیں جو مجھے

عثمانیہ یونیورسٹی کی کسی تقریب میں کھینچ لے جانا چاہتے ہیں۔ وہاں جانا بھی محال ہے۔ مجھے ایک ہفتے میں اتنے روپیے حاصل کرنے ہیں کہ اپنے بچے کی فیس بھیج سکوں جس کی دو قسطیں جمع ہوگئی ہیں اور ۵/ دسمبر کو اس کا اسکول جاڑوں کی چھٹیوں کے لئے بند ہو رہا ہے، 'نگاہ' کا بھی بہت سارا کام سر پر ہے اور دیوان غالب کا بھی۔ نگاہ کے لئے بھی کچھ روپیہ اور فراہم کرنا ہے، جو میں تنہا جھولی لے کر جمع کر رہا ہوں، ان حالات میں فوراً بمبئی سے نکل کر کھڑا ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ پھر یونین کے کرائے سے آؤں گا، تو ۱۵/ نومبر تک علی گڑھ رہنا پڑے گا۔ یہ بھی مشکل ہے، میری بیوی آج کل بیمار ہیں اور اسپتال میں ہیں، جب تک وہ اسپتال سے نہ آجائیں تب تک میں بمبئی سے نہیں نکل سکتا۔ لیکن امید ہے کہ میں اپنی تمام پریشانیوں سے ۸/ ۹/ دسمبر تک فارغ ہو جاؤں گا۔ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ میں یونین کی جوبلی میں شریک ہوسکوں۔ آپ میری وجہ سے بددل ضرور ہوں گے لیکن آپ سے زیادہ شاید میں خود اپنے آپ سے بددل ہو چکا ہوں۔ شکست اور مایوسی میرے مزاج میں کبھی دخل نہیں پا سکی، لیکن وقتی طور پر پیروں میں بیڑیاں ضرور پڑ جاتی ہیں۔

یوم مجاز میں ساحر اور جاں نثار اختر شریک ہونے کا پورا ارادہ رکھتے ہیں، وہ دونوں ابھی تک بھوپال میں ہیں، غالباً کل تک واپس آجائیں گے، آپ مجاز کے نام پر جو گولڈ میڈل قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کے لئے کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے جمع کرنے میں ہم لوگ بمبئی سے کچھ مدد کر سکیں؟

نگاہ کے لئے آپ کے مقالے کا بڑی بے چینی سے انتظار ہے، آپ میری تشویش کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پہلے شمارے کے لئے آپ کے علاوہ سجاد ظہیر، سرور، احتشام، منیب الرحمٰن، مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر اشرف، چغتائی اور باقر مہدی کے وعدے تھے، لیکن اب تک ایک مقالے کی بھی صورت نہیں دیکھی ہے، وعدوں کی مدت طویل ہوتی جا رہی ہے اور نصف رسالہ چھپا ہوا ہے۔ اب میں نے مجوزہ موضوعات کا خیال ترک کر دیا ہے، جس موضوع پر بھی مقالہ مل جائے اچھا ہے۔

میں نے آپ کا مقالہ خطرناک میلان'' علی گڑھ میگزین میں تو نہیں دیکھا لیکن ادب ادب لطیف اور قومی زبان کراچی میں پڑھا ہے، مقالہ بہت تشنہ ہے۔ اس میں خطرناک میلان پر اور زیادہ لکھنے کی ضرورت تھی، ترقی پسند تحریک کی غلطیاں یقیناً ردعمل کی صورت اختیار کریں گی لیکن ترقی پسند رجحانات اور سماجی شعور سے بھاگنے کی کوشش بجائے خود ایک مرض ہے جسے ردّعمل سے تقویت پہونچی ہے۔ اس لئے محض ردعمل کو ذمہ دار قرار دینا میرے نزدیک کچھ زیادہ صحیح نہیں ہے۔ علی گڑھ میں ملاقات ہوگی تو اس پر تفصیل سے باتیں کروں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے آپ کا مقالہ ناپسند ہے، آپ نے نشتر اٹھایا ہے، یہ خود ایک

بڑی بات ہے، اور ہاتھ میں نشتر ہو تو کسی نہ کسی دن وہ پھوڑے کی جڑوں تک پہونچ جائے گا۔ آج کل تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے مصلحت اندیشی کو ادب کی ابدی اور دائمی قدر بنالیا ہے۔

حسن عسکری نے ساقی میں جو کچھ لکھا ہے وہ میری نظر سے نہیں گذرا، میں اسے پڑھوں تو شاید کچھ لکھنے پر آمادہ ہو جاؤں، مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ فراق صاحب سے میری پہلے چل چکی ہے۔ سرور کو تو ایک نہ ایک دن زد میں آنا تھا اور وہ آ گئے، دیکھنا یہ ہے کہ ردعمل کیا ہوتا ہے۔

دیوان غالب کی فرہنگ کا کام سجاد ظہیر نے طے کیا ہے، امید ہے کہ وہ وقت پر کام کر دیں گے۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو آمادہ کرنے کے بعد میں یہ کام آپ کو نہ دے سکا۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

عرب بلڈنگ، کھیت واڑی، مین روڈ، بمبئی۔۴

۲۷/نومبر ۵۷ء

برادرم تسلیم! کل ایک خط آپ کے پہلے خط کے جواب میں لکھ چکا ہوں۔ آج یونیورسٹی یونین کے مطبوعہ دعوت نامہ کے ساتھ دوسرا خط ملا، آپ نے اپنے پہلے خط میں لکھا تھا کہ یونین والے ''کرایہ اور کچھ رقم بھی پیش کریں گے'' لیک مطبوعہ دعوت نامہ میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آپ ان سے بات کر کے اگر روپیہ بھجوا دیں تو آسانی ہو جائے گی۔

میں اس وقت اس قابل ہرگز نہیں ہوں کہ اپنی جیب سے کچھ خرچ کر سکوں۔ گذشتہ چند ماہ سے میری مالی حالت بہت خراب ہے اور ادھر کئی کانفرنسوں اور مشاعروں میں شریک ہونا پڑا جس کی وجہ سے جیب سے بہت زیادہ خرچ ہو چکا ہے ہے۔ اب کوئی مزید گنجائش نہیں ہے۔ عام طور سے کانفرنس اور مشاعرے والے جو کرایہ دیتے ہیں وہ اتنا بندھا ٹکا ہوتا ہے کہ ہفتہ بھر کے سفر اور قیام کے لئے ناکافی ہوتا ہے۔ اس لئے بہت سارا بار خود اٹھانا پڑتا ہے۔ جب تک ممکن ہوتا ہے، یہ بار برداشت کر لیتے ہیں، اس کے بعد مطالبہ کرنا پڑتا ہے، اب علی گڑھ یونیورسٹی یونین سے مطالبہ مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا اس لئے آپ کو لکھ رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ اچھی طرح ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

Nigah

Urdu Litrary and cultural Journal

Urdu Publishers, 63, Moreland road, Bombay.8

۲/ستمبر ۵۷ء

برادرم تسلیم! آپ کے مقالے کا شدید انتظار ہے۔ باقر مہدی سے معلوم کہ آپ مجھ سے کچھ کبیدہ خاطر ہیں، ایسی رنجشوں کے مواقع تو دوستی میں آتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی بات ہو تو نظر انداز کر دیجئے۔ اور مقالہ ارسال فرما دیجئے۔ پرچہ بس آپ کے انتظار میں رکا ہوا ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

علی گڑھ، ۲۰/ جنوری ۵۸ء

بھئی محمد حسن صاحب! میری دلی مبارکباد قبول کیجئے۔

کل دعوت میں ضرور شریک ہوں گا۔ میں تو برات میں بھی چلتا، لیکن آتے ہی بیمار پڑ گیا اور جب اس قابل ہوا کہ آپ سے مل سکتا تو معلوم ہوا کہ آپ دلہن لانے چلے گئے ہیں، خدا کرے آپ کا گھر محبت اور مسرت سے مہکتا رہے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

بومن جی پٹیٹ، ۱۰/ سیتا محل روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۱۴/ اگست ۶۵

برادرم تسلیم! کل آپ کی شاگرد ذکیہ انجم آپ کا خط لے کر آئیں، میں نے ان کے مقالے کا خاکہ دیکھا، کتابیات پر نظر ڈالی، ان کا مقالہ اپنے حدود کے اعتبار سے ۳۹ء، ۴۰ء پر ختم ہو جانا چاہیے۔ اس لئے میں نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ آخر میں ایک باب اور شامل کر دیں جو اتنا تفصیلی نہ ہو اور ۱۹۴۷ء تک کا جائزہ لے لیں لیکن اس کا فیصلہ دراصل آپ کو کرنا ہے۔ شروع میں بھی پس منظر کے لئے علی گڑھ تحریک کا مطالعہ ضروری ہے، میں جتنی ممکن امداد ہے ضرور کروں گا۔ انہوں نے کچھ حصے لکھ لئے ہیں۔ وہ ایک ہفتے میں دکھائیں گی اس کے بعد انہیں کوئی معقول مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ کچھ کتابوں کے نام میں نے اور بتائے ہیں ان کا مطالعہ ان کے لئے مفید ہوگا۔ یہاں وہ ندوی صاحب کے ذریعہ سے مرکزی لائبریری اور یونیورسٹی لائبریری کی ممبر بن جائیں تو کام میں سہولت ہوگی۔

بھائی، اردو والوں پر بڑی بے دلی چھائی ہوئی ہے، جیسے بجھ گئے ہیں۔ ہمارا بیان مختلف شہروں میں دستخط کے لئے گیا ہے، ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ میرے خیال میں ایک مہینہ اور لگے گا۔

یہاں ۸/ ادیبوں نے دستخط کر دئے ہیں، آپ دلی والوں کے دستخط جلد سے جلد حاصل کر لیجئے۔ میں ۱۵ ستمبر کے آس پاس دو چار دن کے لئے آؤں گا، اس وقت آپ سے مزید مشورہ کرلوں گا۔

دھرم یُگ والے غالباً میرا مضمون نہیں شایع کریں گے۔ میں نے عام بحث کے لئے لکھ دیا تھا، ہندی والے سنجیدہ بحث سے گھبراتے ہیں، صرف اردو والوں کو گالیاں دیتے ہیں اور وہ بھی سیاسی، مگر یہ چیز زیادہ کام نہ آسکے گی، اب یہ اردو ہی میں چھپ سکتا ہے۔ پارٹی کے پریس میں ہندی میں بھی چھپ جائے گا۔

ادھر ایک نظم کہی ہے وہ شاعر میں چھپ رہی ہے، اور کچھ شعر ہیں وہ تحفۃً بھیج رہا ہوں ممکن ہے پسند آئیں:

جام ومیخانہ وساقی کا گماں تھا لیکن — دیدۂ تر ہی تھا یاں دیدۂ تر سے پہلے
جم گیا دل میں لہو، سوکھ گئے آنکھ سے اشک — تھم گیا دردِ جگر، رنگِ سحر سے پہلے
خون سب بہہ گیا، موت آ گئی دیوانوں کو — بارش سنگ سے، طوفانِ شرر سے پہلے
مقتلِ شوق کے آداب نرالے ہیں بہت — دل بھی قاتل کو دیا کرتے ہیں سر سے پہلے

امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰۔ سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۱۹/ اگست ۶۵ء

برادرم تسلیم! ہندستانی بک ٹرسٹ بمبئی کی طرف سے جدید اردو ادب کا ایک انتخاب بارہ جلدوں میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سے مراد پریم چند اور اقبال کے بعد کا دور ہے، اس لئے یہ بزرگ اس انتخاب میں شامل نہیں ہوں گے۔ یہ سیٹ ہندی اور اردو زبانوں میں الگ الگ شایع کیا جائے گا۔ پہلی تین جلدیں (۱) رباعیاں (۲) نظمیں اور (۳) غزلیں قریب قریب تیار ہیں باقی جلدیں (۴) افسانہ حصہ اول (۵) افسانہ حصہ دوم (۶) ناولٹ حصہ اول (۷) ناولٹ حصہ دوم (۸) طنز ومزاح (۹) تنقید حصہ اول (۱۰) تنقید حصہ دوم (۱۱) یادیں (۱۲) نئے ادب کے معمار ترتیب دی جا رہی ہیں اور جلد سے جلد پریس بھیج دی جائیں گی۔

میری خواہش ہے کہ اس سیٹ کی آٹھویں جلد ''طنز ومزاح'' اور گیارہویں جلد ''یادیں'' آپ مرتب کردیں اور مجلس ادارت میں اپنا نام استعمال کرنے کی اجازت دیں۔ مجلس ادارت میں آپ کے علاوہ فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر عصمت چغتائی وغیرہ ہیں۔ طنز ومزاج میں نثر ونظم دونوں شامل ہوں گی اور یادیں میں سفرنامے، خودنوشت حالات اور ادبی خطوط یا دلچسپ نجی خطوط شامل ہوں گے، اس کی بارہویں جلد بہت دلچسپ ہوگی۔ جتنے ادیبوں کا انتخاب گیارہ جلدوں میں ہے ان پر عصمت چغتائی اپنے ذاتی تاثرات لکھ رہی ہیں۔

آپ کا جواب آنے پر ہندستانی بک ٹرسٹ کی طرف سے معاہدے کے کاغذات بھیج دئے جائیں گے۔ آپ کا معاوضہ محنتانہ یا نذرانہ جو کچھ ہے ڈھائی سو روپے فی جلد ہوگا، یعنی کل پانچ سو روپے۔ امید ہے کہ آپ اس پیشکش کو قبول کریں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰ سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۲۰/نومبر ۶۵ء

برادرم تسلیم! آپ کا تار اور خط ملا۔ مبارک باد کا شکریہ ادا کرنا بڑی رسمی بات معلوم ہوتی ہے پھر بھی خمار رسوم وقیود کی سرگشتگی سے نجات ممکن نہیں، اس لئے میرا شکریہ قبول کیجئے۔

ہاں عجیب اتفاق ہے کہ میں اس بار کئی ہفتے دہلی میں مقیم رہا، لیکن ملاقات کی صورت نہ نکل سکی، اب میں ۱۳/ دسمبر کو پھر دلی آرہا ہوں، اس بار بھی قیام طویل ہوگا اور ضرور ملاقات ہوگی۔ میں دلی پہونچ کر اطلاع دے دوں گا۔ میری بیوی اور بچے بھی ساتھ ہوں گے۔ کبھی کبھی جاڑوں میں بچوں کو دلی، لکھنو کی سیر کرادیتا ہوں تاکہ ان کے وجود سے بمبئی کی کاروباری زندگی کی گرد صاف ہوجائے اور ادھر کی معتدل فضا یہاں کی شہری زندگی کی کرختگی کو کچھ دور کرسکے۔

نظموں پر آپ نے زبانی بات کروں گا۔ میرا ایک مجموعہ ''پیراہن شرر'' کے نام سے شائع ہو رہا ہے اور غالباً دسمبر تک چھپ جائے گا۔

میں آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ جدید معاشرے کے لئے جس کی پیدائش کا عمل ایک طویل عرصے سے جاری ہے، اور شاید ایک مدت تک جاری رہے؛ بیک وقت صوفی اور سنت شاعروں کے دل کی پنکی اور اشتراکی معیشت کی برکت کی ضرورت ہے۔ مجاہدۂ حیات، نفس سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ شاید میری نئی نظموں میں اس نئے عقیدے کی جھلک آگئی ہے۔

کبھی کبھی میں بہت اداس ہوجاتا ہوں، لیکن یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہیں رہتی کہیں سے یقین اور امید کا اجالا آجاتا ہے، اور میں دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔

یہ نیا زمانہ اے دل جو وقار کھو چکا ہے — اسے اپنی سربلندی، اسے اپنا بانکپن دیں
جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے جو ہیں ساقی بہکے بہکے — انہیں درس میکدہ دیں انہیں ذوق انجمن دیں
بڑی دیر ہوچکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے — چلو اب شبِ شبینہ نئی صبح کا کفن دیں
لبِ تیغ پر لہو ہے، لب زخم پر تبسم — یہ حیاتِ تن برہنہ، اسے کیسا پیرہن دیں

آج کل بیک وقت کئی کتابوں پر کام کر رہا ہوں، کچھ ترجمے میں اور کچھ تخلیقات، جیسے بچہ کھلونوں کی دکان میں بوکھلا جاتا ہے، ایسی ہی حالت ہو رہی ہے۔ ایک کام ختم نہیں ہوتا کہ دوسرے کام کی طرف توجہ منتقل ہوجاتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''جاایں جاست'' دیکھیے یہ معاملہ کب تک چلتا ہے۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے، بیگم صاحب کی خدمت میں آداب، جواب کا انتظار ہے۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰/ سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۱۱/ اپریل ۶۶ء

برادرم محمد محسن صاحب تسلیم , آپ کا خط ملا تھا لیکن میں اپنی نامعقول مصروفیات کی وجہ سے جلد جواب نہ لکھ سکا۔ بھائی مجھے افسوس ہے کہ آپ کا چیک اب تک نہ بن سکا، میں نے مارچ میں آپ کو بتا دیا تھا کہ یہ کام اپریل میں ہو سکے گا اور اب ہو بھی جائے گا۔ لیکن مسودہ مکمل کر کے فوراً بھیج دیجئے۔ واؤچر کے ساتھ مسودے پر بھی ٹرسٹیوں کے دستخط ہوتے ہیں۔ مسودہ موصول ہوتے ہی چیک روانہ کر دیا جائے گا۔

اس بار دہلی میں آپ سے دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی بار یونیورسٹی کی طرف آنے کا ارادہ کیا۔ دو محفلوں میں ڈاکٹر فاروقی اور نارنگ صاحب سے بھی سرسری ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ پر نارنگ کو عذر لنگ تھا۔ مگر میں کوشش کر کے بھی وقت نہ نکال سکا۔

کل پروفیسر ندوی صاحب فرما رہے تھے، کہ اگر ذکیہ انجم کا مقالہ جون تک تیار ہوجائے اور آپ کے ذریعہ سے یونیورسٹی میں پیش کر دیا جائے تو مناسب ہے۔ انجم نے آدھے سے زیادہ کام کر لیا ہے اور امید ہے کہ آخر مئی تک مقالہ مکمل ہوجائے گا، محنتی لڑکی ہے۔ جون کے پہلے ہفتے میں مجھے

سوویت یونین کے سفر کے لئے دلی آنا ہے۔ میں نے انجم سے کہا ہے کہ اس وقت تک مقالہ مکمل کرلو۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا ہے۔

میں غالباً ۶/ جون کو دلی پہونچوں گا۔ ۸/ جون کو صبح ساڑھے سات بجے ماسکو کے لئے روانہ ہوجاؤں گا۔ کیا آپ اس زمانے میں دلی میں ہوں گے۔

میری کتاب پیراہن شرر شائع ہوگئی ہے۔ اس ہفتے میں اس کی ایک جلد آپ کو بھیجی جائے گی۔

اب میں اپنے مضامین کے دو مجموعے مرتب کر رہا ہوں۔ کوشش ہے کہ اس سال کے آخر تک شائع ہوجائیں۔

ادھر کچھ نئی نظمیں ہوئی ہیں، تین نظمیں اس ہفتے کے اردو بلٹز میں آرہی ہیں، دیکھئے گا، شاید پسند آئیں۔ ایک چھوٹی سی نظم ''آبروئے تشنہ لبی'' ہے۔

اب کسی کو بھی نہیں حوصلۂ تلخیٔ جام — خاک پر بکھرے ہیں ٹوٹے ہوئے شیشوں کے نجوم
واعظ شہر کو میخواروں نے مانا ہے امام — خانقاہوں میں ہے رندانِ بلاکش کا ہجوم
آج سے جرأت شعلہ طلبی ختم ہوئی — دوستو آبروئے تشنہ لبی ختم ہوئی
نئی روح جسم خستہ کہ غزل نہ ہوسکے تو — یہ کریں کہ روحِ نو کو، کوئی اک نیا بدن دیں
نئی ابروؤں کو بجلی، نئی انکھڑیوں کو صہبا — نئی تیغ دیں نظر کو، نئی زلف کو شکن دیں
یہ زمیں مری زمیں ہے، یہ فلک مرا فلک ہے — انہیں قید کر چکی ہیں مرے فکر کی کمندیں(۱)

پھر کبھی دوسری کیفیت طاری ہوجاتی ہے:

گیت کے دل میں خنجر ہے، الفاظ ہیں سر بریدہ
اپنے قبضے میں اک بے بسی کے سوا کچھ نہیں ہے
نالے بیکار، فریاد بے سود ہے آؤ مل کر محبت کو آواز دیں
نیکیوں کو پکاریں(۲)

یہ دنیا گمراہ ہے اب تک، پھر بولو اے سنت کبیر
ایک ہی سونے کے سب گہنے، ایک ہی مٹی کے برتن

میں ابھی ہارورڈ فاسٹ کا نیا ناول پڑھ رہا تھا، اس میں ایک یہودی کردار کی زبان سے یہ الفاظ بڑے اچھے معلوم ہوئے کہ ''توریت مکمل قانون ہے اور مقدس ہے لیکن توریت سے زیادہ مقدس انسان ہے''۔

معلوم نہیں میری نئی کتاب ''کبیر بانی'' آپ کی نظر سے گزری یا نہیں، اس کا مقدمہ اور حواشی اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں میرے عقاید کی جھلک ہے، میں نے مارکسزم اور سماجی شعور کی بنیاد پر صوفی اور بھگتی تحریک کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔

میں کبیر کو ہندی کا سب سے بڑا شاعر سمجھتا ہوں اور بڑی دلچسپ یہ ہے کہ رومی، کبیر اور اقبال اور ٹیگور مجھے ایک ہی سلسلے کی کڑیاں معلوم ہوتے ہیں، گرونانک بھی ان میں شامل ہیں۔

لیجئے کاغذ ختم ہوگیا۔ خط کو بھی ختم ہونا چاہیے۔ خاتمہ برحق ہے، امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے، اپنی بیگم صاحب سے میرا سلام کہئے گا۔ آپ کا، سردار جعفری

حاشیہ: (۱) پیراہن شرر میں غزل مطلع ومقطع کے ساتھ ص ۴۷ پر موجود ہے:

وہ بہاریں وہ ہوائیں، جو زمیں زمیں چمن دیں — وہی مہر وماہ لائیں، جو افق افق کرن دیں
اسی بزم میں ملیں گے ابھی شعر تر کے ساغر — چلو بزم جعفری میں تمہیں جام فکر وفن دیں

(۲) پیراہن شرر میں ص ۱۴ پر شامل نظم **دعا** کا آخری بند ہے۔

☆

۱۰۔ سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۱۲/ جنوری ۶۸ء

برادرم تسلیم! ابھی بیس بائیس دن بعد بمبئی واپس آیا تو آپ کا ۵/ جنوری کا خط اور ۲۳/ دسمبر کا پوسٹ کارڈ ملا۔ خط پڑھ کر مومن کا مصرعہ یاد آ گیا۔ ''الٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ''۔

بھائی مجھ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ جب دہلی آتا ہوں تو دوسرے احباب کی طرح آپ سے بھی ملنے کی کوشش کرتا ہوں اور آپ کی طرف سے گرم جوشی کے اظہار میں کمی پا کر خوش ہو جاتا ہوں، آج بات نکل آئی ہے تو کہہ رہا ہوں۔ پہلے پوسٹ کارڈ میں اپنا ٹیلی فون نمبر اور دہلی پہونچنے کی تاریخ لکھ دیتا تھا تاکہ فاصلے حائل نہ ہوں اور آپ ٹیلی فون کر لیں، تاکہ کہیں ملاقات کی صورت پیدا کی جائے لیکن کبھی اس مسرت کا موقع نہ ملا۔ اس کے باوجود کئی بار آپ کے گھر پر حاضری دی۔ گزشتہ اپریل میں علی گڑھ سے واپسی پر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے آپ کا نیا گھر تلاش کرتا رہا اور آپ تک رسائل بھی ہوگئی لیکن بازدید کی سعادت سے محروم رہا، اس بار آپ کے دئے ہوئے ٹیلی فون نمبر سے فائدہ اٹھایا اور

آپ کو ٹیلی فون تک آنے کی زحمت دی لیکن جواب یہ ملا کہ ''آپ ہی آیئے آپ Active آدمی ہیں''۔ یہ انداز پذیرائی نہ تو بے تکلف تھا نہ پرشوق ___ حالانکہ آپ کتابوں کی نمائش کے سلسلے میں دہلی کی طرف آنے والے تھے لیکن مجھے اس کا بھی گلہ نہیں۔ یہ باتیں صرف اس لئے لکھ دیں کہ میں غالباً اس مصرع کا مستحق نہیں ہوں۔ ''راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں''۔

علی گڑھ سمپوزیم کی تقریر اور مقالہ نہ چھاپنے کی شکایت اور بھی بے جا ہے، آپ کا کوئی مقالہ مجھے نہیں ملا۔ آپ نے صرف تقریریں بھیجی تھیں۔ ان کے شائع نہ کرنے کی وجہ میں نے زبانی بتا دی تھی۔ میں سمجھا تھا کہ آپ مطمئن ہو گئے۔ اب پھر لکھ رہا ہوں تا کہ کوئی غلط فہمی باقی نہ رہے۔ اگر تقریروں کے ساتھ مقالہ ہوتا تو میں ضرور چھاپ دیتا مقالے کے لئے تو میں نے بہت اصرار کیا تھا۔ میری دشواری یہ تھی کہ تقریروں سے بات نہیں بن رہی تھی، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے آپ کے علاوہ ڈاکٹر قمر رئیس اور خلیل الرحمٰن اعظمی سے بھی رپورٹ لکھنے کی فرمائش کی تھی، دونوں نے وعدہ کیا اور پھر دونوں ٹال گئے، خلیل الرحمٰن اعظمی اس لئے کہ غالبا آل احمد سرور اس کے حق میں نہیں تھے۔ قمر رئیس کی کیا مصلحت تھی وہی بہتر جانتے ہیں۔ آخر میں نے قمر رئیس کو ایک سوال نامہ بنا کر بھیجا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھے ایک طویل خط لکھا دیا اس میں میرے سوالات کے جواب نہیں تھے، اور اس سے علی گڑھ سمینار کی پوری تصویر نہیں ابھرتی تھی، صرف یہ اثر پڑتا تھا کہ سرور کا مقالہ بہت اچھا تھا، سمینار کا معیار بہت بلند تھا۔ صرف اتنی خرابی تھی کہ جدیدیت کو ترقی پسندی کا حریف سمجھا جا رہا تھا۔ اس کے برعکس آپ کی تقریروں کا انداز بالکل دوسرا تھا۔ دو ترقی پسند ادیبوں کے متضاد بیانات سے بات اور بھی الجھ جاتی، میں مجبورا خاموش ہو گیا۔ آپ کی یہ تقریریں میں نے اپنے ریکارڈ کے لئے رکھ چھوڑی ہیں اگر آپ انہیں فورا شائع کر رہے ہوں تو بھیج دوں ورنہ اپنے پاس محفوظ رکھوں۔ اس میں ایڈیٹر کی کج کلاہی کا کوئی دخل نہیں ہے۔

میں عام طور سے ''ہماری زبان'' یا ''اردو ادب'' نہیں پڑھتا ہوں، یہ پرچے میرے پاس آتے بھی نہیں ہیں۔ ویسے بھی وقت کی کمی کی وجہ سے کتابوں اور رسالوں کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ سرور اور خلیل نے جو لکھا ہوگا وہ وہی ہوگا جو ان کا آج کل عام رویہ ہے اور شاید یہی جواب دیں گے کہ یہ ان کا ذاتی نقطۂ نگاہ ہے، انجمن ترقی اردو کے پالسی نہیں ہے، آپ اس کا جواب لکھ سکتے ہیں، یہ بات برسوں سے چلی آ رہی ہے کبھی کسی نے سرور کو ٹوکا نہیں، اب آپ ٹوک کے دیکھیے، شاید کوئی خاطر خواہ صورت پیدا ہو سکے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں انجمن کی مجلس عام کا ممبر نہیں ہوں اور ایک دشواری یہ بھی ہے

کہ میں ذاتی معاملوں کا جواب کبھی نہیں دیتا۔ ''پیراہن شرر'' کے تعلق سے مجھے مکار، موقع پرست اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا ہے وہ تبصرہ میری شاعری پر نہیں ہے، ذاتی معاملہ ہے، اس لئے نظموں کے اقتباسات صحیح نہیں ہیں، بعض مصرعے خارج کر کے مفہوم مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن میں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا، جواب صرف میری شاعری ہے، اپنے ضمیر کا نگہبان میں خود ہوں، کوئی دوسرا اس کی نگہبانی نہیں کر سکتا، سرور کا جواب بھی ''گفتگو''، ''آئینہ'' پرچوں کی اشاعت ہے اور کچھ نہیں، ''گفتگو'' پڑھنے والا حلقہ ان کی رائے سے متاثر نہیں ہوتا۔ ایسے نقادوں سے زیادہ اہم میرے وہ عام پڑھنے والے ہیں جن کی محبت اور خلوص میرا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

اب آپ کے خط کی چوتھی بات اور یہ سب سے زیادہ کام کی بات ہے، یہ اچھی بات ہے کہ آپ کتاب کا ایک شمارہ مرتب کر رہے ہیں۔ میں اس میں ضرور لکھوں گا، لیکن اس وقت میرے پاس کوئی غیر مطبوعہ نظم یا غزل نہیں ہے۔ اب جو بھی نظم ہوگی وہ کتاب کے لئے بھیج دوں گا۔ آپ نے اپنے پوسٹ کارڈ پر کرشن چندر پر بھی کچھ لکھنے کی فرمائش کی ہے، وہ بھی پوری کروں گا، لیکن اس کے لئے وقت درکار ہے۔ ۶/فروری تک مجھے بالکل فرصت نہیں ہے۔ اس کے بعد کچھ لکھ سکوں گا۔ یہ بتایئے کہ آپ مجھے کتنا وقت دے سکتے ہیں، آپ نے کچھ سوالات کے جواب بھی مانگے ہیں لیکن سوالات نہیں لکھے۔ وہ بھی بھیج دیجئے۔

ہاں ایک غیر مطبوعہ چیز میرے پاس ہے لیکن یہ کچھ ''سخن گسترانہ'' ہے۔ معلوم نہیں آپ اس کو شائع کرنا پسند کریں گے یا نہیں۔ ابھی ہندی میں میری منتخب نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ناشر کی فرمائش پر میں نے اس کا دیباچہ خود لکھا ہے، جس میں اپنی شاعری کی فکری بنیادوں اور اپنے عقائد سے بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کچھ اپنی شاعری کا بھی تذکرہ آ گیا ہے۔ یہ دیباچہ ایک صبح کی محفل میں راجندر سنگھ بیدی اور دوسرے احباب نے سنا، ان کے کہنے پر میں نے اس کو دوبارہ ذرا زیادہ تفصیل سے لکھا ہے۔ اردو میں میری تیس برس کی شاعری کا ایک بڑا انتخاب شائع ہو رہا ہے، یہ مضمون اس کے دیباچے کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ ہے لیکن اس کے چھپنے میں سات آٹھ مہینے لگ جائیں گے۔ اگر آپ کہیں تو میں یہ مضمون بھیج سکتا ہوں، اس کا نام ''لمحوں کا رقص'' ہے۔

آپ نے اشتہار کے بارے میں بھی لکھا ہے، ہندستانی بک ٹرسٹ عام طور سے اشتہار نہیں دیتا ہے، پھر بھی ''کتاب'' کے لئے کوشش کروں گا، ایک خط ہندستانی بک ٹرسٹ کے نام انگریزی میں لکھ دیجئے اور اگر اشتہارات کا مطبوعہ نرخ نامہ ہو تو وہ بھیج دیجئے ورنہ صرف یہ لکھ دیجئے کہ ایک صفحہ کی قیمت کیا ہوگی۔

میرے خط کی کوئی بات ناگوار گزری ہوتو اسے پرانی رفاقت کے نام پر نظرانداز کر دیجئے۔
کرشن چندر اچھے ہیں۔ میں نے دریافت کیا تھا۔ انہیں آپ کا خط نہیں ملا۔ عینی کا پتہ ہے:

2, Asha Mahal, Gamadia Road, Bombay-26

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے، بیگم کو آداب، بچوں کو پیار۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

گفتگو، کھیتان بھون، ۱۹۸، جے ٹاٹا روڈ، بمبئی

۲۹/ جنوری ۶۸

برادرم تسلیم! آپ کا ۹/ جنوری کا خط ملا، شکریہ، میں مصروف تھا، اس لئے فوراً جواب نہ لکھ سکا، اس مصروفیت میں دلی کا ایک چھوٹا سا سفر بھی شامل تھا۔ صرف ایک رات کا قیام۔ پرسوں رات کو گیا اور صبح واپس آ گیا۔

آپ نے یہ رائے کیسے قائم کر لی کہ میں ادبی تبصرے سے ناراض ہوں، یا اسے معروضی طور سے دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شعر اور ذات کے بارے میں رائے قائم کرنے کا حق کسی سے نہیں چھینا جا سکتا۔ چنانچہ آپ کو اور آپ کے احباب کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ جب کوئی یہ حق استعمال کرتا ہے اور زد میں میری ذات ہوتی ہے تو میں برافروختہ نہیں ہوتا۔ صرف یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ تبصرہ نگار کے قلم کے محرکات کیا ہیں، ادبی تبصرے کے بارے میں بھی میرا ردعمل صرف اتنا ہے کہ کام درویش میں ہر تلخ ہے مانند نبات! کہ اس کا ذکر میرے خط میں مثال کے پر طور پر آیا تھا کہ میں اس قسم کے حملوں کا جواب نہیں دیتا لیکن اگر رفیقانہ گفتگو میں بات نکل آئے تو مضائقہ بھی نہیں ہے کیوں کہ اس کا مقصد مناظرہ نہیں دوستانہ مفاہمت ہوتا ہے، اس قسم کی صاف گوئی کو تلخ نوائی نہیں سمجھنا چاہیے۔

آپ کو ''پیراہن شرر'' کی نظموں میں جنگ کی مخالفت اور بین الاقوامی اخوت نظر نہیں آتی تو اس میں میرا یا میری نظموں کا قصور نہیں ہے، قلب و نظر کے حجابات قائم ہو جائیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ شعر و سخن کے ابلاغ میں ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں شاعر اور قاری کے عقائد ٹکراتے ہیں کیوں کہ کوئی قاری اپنے نظریاتی تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر شعر نہیں پڑھتا۔ اور جب کبھی ایک ایک ہی نظریے کے ماننے والوں، ایک ہی عقیدے کے گروہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے تو یہ تعصّبات آہنی دیواریں بن جاتے ہیں اور پھر وہی دکھائی دیتا ہے جو تعصب دکھاتا ہے، آج ہی کے اخبارات میں

پیکنگ ریڈیو کا بیان شائع ہوا ہے، جس میں سویت یونین اور کوسی گن کو سامراج کا پالتو کتا کہا گیا ہے۔ یہ نظریاتی اختلافات کی عجوبہ کاریاں ہیں۔

یہی عجوبہ کاریاں میرے اور آپ کے درمیان گل کھلا رہی ہیں آپ ہند پاک جنگ کو دوسرمایہ دار ملکوں کی جگن سمجھتے ہیں اور میں اسے تقسیم ہند کی سیاست کا ایک شاخسانہ سمجھتا ہوں۔ آپ میری شاعری میں مسلح انقلاب کی رجز خوانی سننا چاہتے ہیں اور مجھے مسطح انقلاب کے آثار ہندستان میں کہیں نظر نہیں آرہے ہیں، آپ مجھے فائیڈل کاسٹرو کی صفوں میں دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ میں کیوبا منتقل نہیں ہوسکتا اور ہندستان میں فائیڈل کاسٹرو کے پیدا ہونے کے کوئی امکانات نہیں ہیں، لیکن بین الاقوامی سطح پر ہر ترقی پسند فائیڈل کاسترو کی صف میں ہے۔

لیکن میں صرف اتنی سی بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو مطالبات اور توقعات آپ کو مجھ سے ہیں اور میری شاعری سے ہیں وہ کسی دوسرے ترقی پسند اور انقلابی شاعر سے کیوں نہیں ہیں۔ خود آپ اس پر عمل پیرا کیوں نہیں ہیں۔ آپ کی کون سی تحریریں ہیں جن میں مسلح انقلاب کی فضا ہے۔ ہند پاک جنگ کے دوران یا اس کے بعد آپ نے اپنی تحریروں میں اس کو دوسرمایہ دار ملکوں کی جنگ کہا ہے، مجھے تو کوئی سیاسی جماعت بھی نظر نہیں آرہی ہے جس نے جنگ کے زمانے میں یا جنگ کے بعد ان بنیادوں پر اپنی پالیسی کو استوار کیا ہو، دونوں کمیونسٹ پارٹیوں کی پالیسی اور جدوجہد ہمارے سامنے ہے۔

لیکن اس اختلاف کے باوجود آپ کو یا آپ کے رفیق کار کو مکار اور موقع پرست کہنے کی ہمت نہیں کروں گا۔ ترقی پسند دائرے کے اندر اختلافات کا احترام کرنا چاہیے، اپنے رفیقوں کی شخصیت کو مسخ کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔

میں آپ کے تینوں نوٹ ''گفتگو''(۲) میں چھاپ رہا ہوں۔ پرچہ فروری میں آجائے گا۔
امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

حاشیہ: (۱) کتاب کے لئے اپنا مقالہ نقل کرانے کے بعد بھیجوں گا۔

(۲) میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ انجمن ترقی اردو اور اس کے ترجمان ہماری زبان کو ادبی گروہ بندیوں کے لئے نہیں استعمال کرنا چاہتے، سب سے پہلے اس کے خلاف ہماری زبان میں لکھئے اور پھر انجمن کے جلسے میں آواز اٹھائیے۔

☆

بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔۲۶
۱۲/اپریل ۶۸ء

برادرم تسلیم! کل شام کو آپ کا خط ملا اور خلاف معمول جلدی مل گیا۔ صرف ایک دن میں پہلے دہلی کی ڈاک خوش رفتاری سے آتی تھی، لیکن درمیان میں نہ جانے کیسے فاصلے بڑھ گئے اور ہوائی جہاز کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس بار پھر کوئی تیز پرواز طیارہ مل گیا۔

خوشی کی بات ہے کہ آپ بمبئی آ رہے ہیں، اردو کنونشن میں شریک ہو رہے ہیں، اور **گفتگو** کے ترقی پسند ادب نمبر کو یہاں بیٹھ کر ترتیب دینے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہ تینوں کام مبارک ہیں۔

اردو کنونشن ۲۴، ۲۵، ۲۶/مئی کو ہوگا۔ دعوت نامے جلد بھیجے جائیں گے دوسری زبانوں سے اچھی نمائندگی کی امید ہے، اردو کی نمائندگی بھی معقول ہونی چاہیے، آپ بھی آیئے اور قمر رئیس، صدیق قدوائی اور دوسرے احباب کو بھی ساتھ لایئے، خواجہ احمد فاروقی کو بھی آمادہ کیجئے۔

میں آج کل کنونشن کی تیاریوں کی وجہ سے بہت مصروف ہوں۔ گفتگو کی ادارت اور طباعت اور روزگار کی ریاضت اپنی جگہ ہے۔

دہلی میں ابھی کنونشن کا بہت کام باقی ہے، پنجابی کے پانچ سو چار ادیبوں نے اردو کے مطالبے پر دستخط کیے ہیں۔ دوسری زبانوں سے بھی اتنا ہی تعاون ملنے کی امید ہے، لیکن ابھی اردو اور ہندی حلقوں میں معقول کام نہیں ہوا ہے۔ بنّے بھائی نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دہلی کے ہندی ادیبوں سے ملنے میرے ساتھ چلیں گے، اب آپ لوگ مل کر وہاں سے آنے والے اردو اور ہندی ڈیلیگیشن کی تشکیل کر ڈالیے، مصروفیت کے باوجود اس مصروفیت ہی میں سے وقت نکالنا پڑے گا، جیسے محدود آمدنی میں سے بیماری میں روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

بھائی، بمبئی میں ہر چیز دستیاب ہوتی ہے، مکان عنقا ہے۔ لوگ شادی کرنے سے گھبرانے لگے ہیں، بیوی کو کہاں لے کر جائیں گے۔ آپ تنہا ہوتے تو قیام کا انتظام بہت آسان تھا لیکن آپ مع اہل بیت کے آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ فوراً جواب نہیں دے سکتا۔ سوچوں گا، دوستوں سے مشورہ کروں گا، امید ہے کہ کوئی معقول صورت نکل آئے گی۔ یہ بھی خیال رکھنا ہے کہ آپ کی قیام گاہ اور میرے گھر کا فاصلہ کم ہوتا کہ ملاقات آسانی سے ہو سکے۔ نقل نویس کا انتظام ہو جائے گا، قمر رئیس کو بھی کسی طرح آپ کے ساتھ روک لیا جائے تو اچھا ہوگا۔

''ہماری زبان'' میری نظر سے نہیں گذرا۔ پرسوں قرۃ العین حیدر ذکر کر رہی تھیں، کہ میرے

خلاف کچھ گل افشانیاں کی گئی ہیں، میں ان لغویات کو پڑھنے کے لئے وقت کہاں سے لاؤں۔ کبھی کبھی سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ: ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے۔ یہ بے چارے کس عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں، ترقی پسندی ایک کابوس بن کر ان کے سینوں پر سوار ہے۔ برسوں سے وہ دن رات اس کابوس پر لعنت بھیج رہے ہیں، اور انجمن ترقی اردو کے سرکاری ترجمان کو استعمال کر رہے ہیں، اکثر یہ ہوتا ہے کہ جب تخلیق کا شعلہ ماند پڑنے لگتا ہے تو بعض لوگ نفرت کی آگ سے سینے کو گرم رکھتے ہیں، کسی شاعر یا ادیب کی اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے آپ سے تخلیق شعر کا وقت چھین کر نفرت انگیز میں صرف کرتا ہے۔ دعا کیجئے کہ ان کو اس جہنم سے نجات ملے اور یہ شعر و ادب کی کھلی فضا میں سانس لے سکیں۔

علی گڑھ کے سمینار کی رپورٹ مل گئی ہے، یونیورسٹی کے ہندی ڈپارٹمنٹ سے ڈاکٹر کنور پال سنگھ نے بھیجی ہے۔ تاخیر سے آئی لیکن میں اسے پرچے میں شامل کر رہا ہوں، پرچہ قریب قریب تیار ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ بیگم کو آداب، بچوں کو پیار۔

آپ کا سردار جعفری

☆

۱۰/ سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۳۰/ اپریل ۱۹۶۹ء

برادرم تسلیم! آپ کی کتاب ''دہلی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر'' میرے سامنے ہے، یہ کتاب آپ نے مجھے مارچ ۱۹۵۶ء میں عنایت کی تھی۔

(۱) آپ نے اپنی کتاب میں آبرو کے دیوان کے چار نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک کوئی نسخہ شائع نہیں ہوا تھا، لیکن شاید بعد کو دیوان آبرو کی تدوین آپ نے کی ہے اور وہ شاید شائع بھی ہو گیا ہے، اس کی تصدیق کیجئے اور بتائیے کہ کہاں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) اپنی کتاب کے صفحہ ۳۰۴ پر آپ نے یہ شعر ناجی کے نام سے نقل کیا ہے ؎

صبح دم جب جا چمن میں تم نے زلفیں کھولیاں
لے چلی باد صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں

لیکن مجھے یہ شعر اس طرح یاد ہے ؎

جب چمن میں جا کے پیارے تم نے زلفیں کھولیاں

لے گئی باد صبا خوشبو کی بھر بھر جھولیاں

اور میرے ذہن میں شاعر کا نام آبرو ہے، اس کی تصدیق یا تردید کر دیجئے اور ماخذ کا نام بھی لکھ دیجئے تو عنایت ہوگی۔

(۳) صفحہ ۳۰۴ پر ''بسنت رت'' کی ردیف کے جو دو شعر ہیں وہ کس کے ہیں؟

(۴) کیا اردو کے شاعر نے اس شعر میں قصائی کا لفظ کاف اور سین سے لکھا ہے؟

(۵) کیا ابہام کا سلسلہ ایہام گویوں کے بعد بھی جاری رہا ہے، ایک صنعت کی شکل میں: مثلاً انیس ''سایہ کنویں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے'' کیا اسے ایہام کہہ سکتے ہیں۔

(۶) ایہام اور ضلع جگت میں کیا فرق ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔۲۶

۱۳/مئی ۱۹۶۹ء

برادرم تسلیم! آج آپ کا خط دیکھ کر خیال آیا کہ میں نے اپنے خط میں غلط پتہ لکھ دیا تھا، غالباً D/7 کے بجائے D/5 تھا۔ لیکن پھر بھی آپ کو خط مل گیا اور مجھے جواب میں تاخیر کا سبب نہ معلوم ہونے کی وجہ سے گمان تھا کہ شاید خط کہیں گم ہو گیا۔ ڈاک خانے والے اب بھی اچھے خاصے مستعد لوگ ہیں، سراغ لگا لیتے ہیں۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں، ورنہ بمبئی آنے کی دعوت دیتا، حیدر آباد کو ایک راستہ بمبئی ہو کر بھی جاتا ہے۔ وہاں کی پروفیسر شپ آپ کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ اب اسے بھول جایئے۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر۔

دیوان شاکر ناجی میرے پاس آ گیا ہے۔ طباعت بڑی ناقص ہے پھر بھی تو اگر ممکن ہو تو اپنا مرتب کیا ہوا دیوان آبرو بھیج دیجئے شکر گزار رہوں گا۔

میں نے ایک بات دریافت کی تھی کہ کیا ایہام گویوں کے بعد بھی غالب اور انیس کے یہاں ایہام کا کچھ اثر باقی رہا ہے؟ یا صرف رعایت لفظی ہے۔

میری صحت اب بہتر ہے۔ لیکن جسم میں خون کی کمی اور خون میں شکر کی کمی ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھی کمزوری بڑھ جاتی ہے، زیادہ وقت گھر پر گذارتا ہوں اور پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتا

ہوں۔آج کل ''سرمایۂ سخن'' پر کام کر رہا ہوں۔
امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی پٹیٹ، بمبئی۔۲۶
۱۴/مئی ۶۹ء

برادرم تسلیم! ایک خط کل لکھ چکا ہوں۔آپ غالباً ۱۸/مئی کو مراد آباد جانے والے ہیں، اس لئے یقین ہے کہ میرا دوسرا خط بھی آپ کے رختِ سفر باندھنے سے پہلے آپ کو کل مل جائے گا۔ جواب ضروری نہیں کہ آپ دہلی سے دیں، مراد آباد سے لکھ دیجئے گا۔

(۱) حافظ شیرازی کے یہاں چاک گریباں کا مضمون نہیں ہے۔ مجھے علم نہیں کہ سعدی کے یہاں ہے یا نہیں، اگر آپ کو علم ہو تو لکھیے کہ یہ چاک گریباں کا مضمون کب سے چلا ہے۔ فارسی شعراء میں کس نے پہل کی اور اردو شعراء میں کس نے؟ اردو میں بہترین شعر میرؔ کا ہے۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(۲) ساقی نامہ کب شروع ہوا اور کس نے شروع کیا، حافظ کے یہاں ساقی نامے کے قسم کی ایک چیز ہے لیکن اس کا عنوان ''ایضاً لہٗ'' لکھا ہے، اور غزلوں کے بعد ہے۔ مرثیوں میں ساقی نامے کو میں عجز بیان سے تعبیر کرتا ہوں لیکن ایک الگ صنف کی حیثیت سے اس میں شاعری کے بہت امکانات ہیں۔
امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی، پیٹیٹ روڈ، بمبئی۔۲۶
۳/نومبر ۶۹ء

برادرم تسلیم! خط ملا، یاد آوری کا شکریہ، میں خوش قسمت ہوں کہ اختلافات کے باوجود آپ کو میری شاعری اور شخصیت سے دلچسپی باقی ہے، یہ رفاقت زیادہ قیمتی ہے، تاباں کو شاید کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی شکایت نہیں کی تھی، بر سبیل تذکرہ سویت یونین ہندستان کمیونسٹ پارٹی، مخدوم اور میرے بارے میں آپ کے رویے کی بات نکلی تھی، اب اس کی تفصیل یاد نہیں۔ میں ادبی یا نظریاتی اختلافات کو ذاتی شکایت کی بنیاد نہیں بناتا۔

یہ فصل ہی کچھ اختلافات کی ہے۔ سیاسی تنظیموں اور انقلابی جماعتوں میں اختلاف ہیں، انقلابی ملکوں میں اختلاف ہیں اور ادیبوں اور شاعروں کے درمیان اختلاف ہونا تو ایک ایسی ازلی اور ابدی حقیقت ہے جو ہر نظام، ہر سماج، ہر موسم، ہر فصل میں زندہ اور تابندہ ہے۔ پھر میرا اور آپ کا اختلاف کیوں نہ مبارک سمجھا جائے۔ سیاسی جماعتوں کے اختلافات ''عیب مے جملہ بگفتی'' کی گرد آلود راہوں میں بھٹکتے رہتے ہیں اور ''ہنرش نیز بگو'' کی منزل میں کبھی نہیں آتے، ادیبوں کے اختلافات کبھی کبھی اس منزل میں بھی قدم رکھ لیتے ہیں۔

آپ کے پرچے کا ذکر میں نے کسی کی زبانی سنا تھا، اب آپ کے خط سے تصدیق ہوگئی لیکن اس وقت میرے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ غالب والا مضمون کتاب کو بھیج چکا ہوں، سرمایۂ سخن کا کام اب صرف الفاظ اور ترکیبوں کے انتخاب تک محدود ہے۔ کچھ نوٹ لکھ رہا ہوں اور پہلی جلد کے تمہیدی مضمون پر کام کر رہا ہوں، غالب والا مضمون اس کا ایک حصہ ہے۔ شعر نہیں ہوتا، دل میں اتنا خون نہیں ہے کہ جذبات اور احساسات کی ناؤ اس میں ''سہج'' کے ساتھ تیر سکے Coronary insufficiency جو انجائینا ہی کی ایک قسم ہے، اس میں یہی ہوتا ہے، خوشی اور غم میں دل کو جس مزید خون کی ضرورت ہوتی ہے وہ مہیا نہیں ہو پاتا، اس لئے جذباتی بار بھی برداشت نہیں ہوتا، دوسرے لوگ اسے سمجھ نہیں پاتے۔

اردو کنونشن ۲۸/ دسمبر کو ہے، مطبوعہ دعوت نامہ بھیجا جا چکا ہے، میں نے خواجہ احمد فاروقی سے ان کی دعوت میں شریک نہ ہو سکنے کی معذرت کر لی تھی اور یہ کہا تھا کہ آپ کنونشن میں شریک ہونے کا فیصلہ کیجئے۔ اب کہیے کہ دلی یونیورسٹی سے کتنے حضرات آئیں گے۔ یہاں قیام اور طعام کا انتظام اردو کمیٹی کی طرف سے ہوگا۔ میں شاید وسط نومبر تک دہلی آؤں۔ اس وقت ملاقات ہوگی۔ امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۲۴/ جنوری ۱۹۷۰ء

برادرم تسلیم! آج ''عصری ادب'' کے پانچ نسخے بذریعہ رجسٹری موصول ہوئے، شکریہ اور مبارکباد۔ ایک پرچہ تو میرے نام ہوگا۔ باقی چار کس کو دے جائیں۔ ادیبوں میں تقسیم کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے خود انہیں یاد رکھا ہوگا۔ آپ کہیں تو کسی کتب فروش کو دے دیئے جائیں تاکہ

مستحقین اور صاحبان ذوق کے ہاتھوں تک پہونچ سکے۔

میری صحت قدرے بہتر ہے۔ اس بار دل ذرا خوش خرامی سے نارمل منزل کی طرف آرہا ہے، علاج اور احتیاط جاری ہے۔ اب کچھ پڑھنا لکھنا شروع کر دیا ہے۔

آپ میرے ایک سوال کے مقروض ہیں، جواب عنایت کیجئے۔ چاک گریباں کا مضمون کب شروع ہوا۔ رضی دانش اور بعض دوسرے متاخرین فارسی شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ حافظ، سعدی، خیام، رومی کے یہاں تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اپنے خط میں نظیری کی جو مثال دی تھی، چاک گریباں نہیں چاک پیراہن ہے۔ ''پیراہن چاکش نگر'' یہ محبوب کا چاک پیرہن ہے جو حافظ کے یہاں بھی ہے۔ فدائے پیرہن چاک ماہر دہان باد'' مجھے عاشق کے چاک گریبان کی فکر ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی پٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۲۷/ جنوری ۱۹۷۰ء

برادرم تسلیم! ۲۲/ دسمبر کا خط کل ملا، اس دوران میں آپ کو میرا خط بھی ملا ہوگا۔ عینی اتفاق سے میرے گھر آئی ہوئی تھیں، ان کے نام کا پرچہ انہیں دے دیا، کرشن چندر سے سنیچر کو ملاقات ہوگی۔ مجروح اور کیفی کے پرچے بھی ان کے گھر بھیج دئے جائیں گے۔ ویسے میرے اور ان کے گھر کے درمیان لکھنؤ اور بارہ بنکی کا فاصلہ ہے۔ بمبئی میں یہ فاصلہ بے معنی ہے۔

سالانہ چندے کے بیس روپئے جلد حاضر کر دئے جائیں گے۔ تازہ کلام ہے نہیں، جب سے دل کا دورہ پڑا ہے، شاعری بند ہے۔ شاید پہلے کبھی لکھا تھا کے ہر قسم کے ہیجان سے بچنا پڑتا ہے۔ غم، خوشی، پریشانی، کوفت، شاعری، جذباتی ردعمل، ابھی دیکھیے کتنے دن اور لگتے ہیں۔ اس بار شروع نومبر سے اب تک دل کی ناز برداریوں کا سلسلہ جاری ہے، جس کی وجہ سے اردو کنونشن میں بھی حصہ نہ لے سکا۔ علمی قسم کے غیر جذباتی کام کر سکتا ہوں۔ ''نہرو فیلوشپ'' کے کام کا سلسلہ جاری ہے۔ اب اس میں ایسی چیزیں نکل سکتی ہیں جو شاید آپ کے پرچے کے کام آسکیں، اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی کے لئے دو توسیعی لکچر تیار کر رہا ہوں، آخر فروری میں ''محنت کا عمل اور وقت کا نقش قدم'' ہے۔ لیکن وہ در اصل میری شاعری میں محنت کے عمل اور وقت کے تصور سے متعلق ہے، دوسرے کا عنوان ہے ''اردو شاعری میں محبوب کی بزم آرائیاں''، یہ مضمون اپنے عنوان سے جتنا رومانی معلوم ہوتا ہے، اتنا ہلکا پھلکا

نہیں ہے۔ اس میں عیسائی، بدھ، ہندو اور مسلم تصورات حیات سے بحث کی گئی ہے۔ لیکن دونوں مقالے طویل ہیں، ۴۰ منٹ کا ایک، بہر حال کا اس فیصلہ دہلی میں ہوسکتا ہے۔ میں آخر فروری میں آؤں گا۔ اس دوران میں میری نئی کتاب بھی آجائے گی : کبیر بانی، دیوان میرا اور دیوان غالب کے دیباچوں پر مشتمل ہے اس کا نام ''پیغمبرانِ سخن'' ہے : تین دیباچوں پر چوتھے دیباچے کے اضافے کے ساتھ۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۱۴/فروری ۱۹۷۰ء

برادرم تسلیم! ''سارے الفاظ'' کی نقل کا کام کل تک پورا ہو جائے گا۔ پرسوں پیر کے دن سپر ڈاک کر دوں گا۔ دو تین دن میں آپ کو مل جانا چاہیے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، ستیا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۱۰/اپریل ۱۹۷۱ء

برادرم تسلیم

دستۂ گل ۱۹۷۰ء کل ساہنی صاحب کی عنایت سے موصول ہوا، اس کے تعارف کا پہلا پیرا گراف پڑھ کر یہ شبہ ہوتا ہے کہ خم خانۂ جاوید کے لالہ سری رام اور دہلی کلاتھ ملز کے لالہ سری رام دو شخصتیں نہیں ہیں، میں اب تک انہیں دو الگ الگ شخصیتیں سمجھتا رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، سیتا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۲۶/اپریل ۷۱ء

برادرم تسلیم! پوسٹ کارڈ ملا۔ آپ کو خیال نہیں پیدا ہونا چاہیے کہ میں صرف تسامحات سے

''آگاہ فرماتا رہتا ہوں''، اور آپ کی کوئی توصیفی کلید میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے اب اس عمر میں بڑی شدت سے وقت کی کمی کا احساس ہے۔ اس لئے میں بہت ہی منتخب چیزیں پڑھتا ہوں، لیکن آپ کی کوئی تحریر نظر انداز نہیں کر پاتا ہوں، اور اس سے حسب توفیق روشنی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ میرے ایک سوال ''چاک گریباں'' کے ابھی تک مقروض ہیں، حافظ اور نظیری کے یہاں محبوب کے چاک پیراہن کا ذکر ہے، چاک گریباں اور گریبان بہار افشاں آخر دور کے فارسی شعراء کے یہاں نظر آتا ہے، یہ کہاں سے شروع ہوا اور کیسے۔ اس کی فکر میں ہوں۔ ''نثار پیرہن چاک ماہر ویاں باد'' حافظ۔ ''درسینہ دارد پیراہن چاکش نگر'' نظیری: ''گریباں چاکی عشاق از ذوق فنا باشد'' صائب۔ معشوق کے حسن سے عاشق کی پریشانی اور زندگی سے فنا کی طرف۔ یہ سفر کیسے شروع ہوا ذرا اس کو نظر میں رکھیے۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰، ستیا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی۔ ۲۶

۹/ جنوری ۷۴ء

برادر تسلیم! اردو میں انقلاب اور ترقی پسند شاعری کو فروغ دینے کے لئے آپ والٹ دھٹ میں مایا کوفسکی، پابلو نرودا اور ناظم حکمت کی نظموں کے ترجمے بھی عصری ادب میں شائع کریں تو مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے درمیانی طبقے کے نقادوں کے مینی بورژوا نظریہ جمال نے جس کی کوئی شعوری تشکیل نہیں کی گئی ہے، اردو شاعری کو بہت نقصان پہونچایا ہے، اس لئے مارکسی مجالیات پر بھی کام کرنے کی ضرورت ہے جس سے محنت کے عمل کے حسن کا شعور بھی نکھرے گا، مارکسی جمالیات کے لئے مارکس اور اینگلز سے لے کر جدید عہد تک مارکسی نقادوں کی تحریروں کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ہمارے زیادہ تر نقاد کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لکچرر اور پروفیسر ہیں، اور بورژوا عہد کے مغربی نقادوں کے خوشہ چیں ہیں، اس میں بھی انہوں نے تخلیقی سفر طے نہیں کیا ہے، سیاسی ترقی پسندی اور ادبی رجعت پرستی یا ماضی پرستی کا امتزاج بہت عام ہے، جدوجہد بڑے پیمانے پر نہ کی گئی تو ترقی پسند اور انقلابی ادب کو بہت نقصان پہنچے گا۔

نہ جانے یہ خط آپ کو کیوں لکھ رہا ہوں، مگر آپ ہی کو جی چاہا اور لکھ دیا۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا، سردار جعفری

☆

۱۰،ستیا محل، بومن جی پیٹیٹ روڈ، بمبئی۔۲۶
۱۴/جنوری ۷۴ء

برادرم تسلیم! آپ کا خط ملا، اپنی مصروفیت کے باوجود آپ، ڈاکٹر قمر رئیس اور قدوائی صاحب اگر انقلابی اور ترقی پسند شاعری کے ترجموں اور مارکسی تنقید کے اقتباسات کے لئے وقت نکالیں تو بہت کام ہوسکتا ہے۔ سہ ماہی پرچے میں ایک ایک ہفتے کی محنت سے آپ تین چار چیزیں دے سکتے ہیں۔ مایاکوفسکی کی نظم لینن کا ترجمہ شائع ہوتو بہت اچھا ہے۔ آپ ظ انصاری سے درخواست کیجئے۔ انگریزی اور روسی کو سامنے رکھ کر اس عظیم الشان نظم کا ترجمہ کر دیں۔ ڈاکٹر قمر رئیس روسی جانتے ہیں وہ بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ مضامین لکھنے کے لئے آپ حضرات وقت نکالتے ہیں اس میں سے کچھ وقت ترجموں کے لئے نکالئے۔

میں نے دس برس کی محنت سے والٹ دھٹ مین کی ستر نظموں کے ترجمے کئے تھے جن میں صرف ایک ترجمہ گفتگو کے پہلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ باقی ساری نظمیں کھو گئیں۔ کسی نے میری پرانی فائلوں کے ساتھ انہیں ضائع کر دیا۔ پھر بھی کبھی وقت نکال کر ترجمہ کر دیا جائے گا۔ اس خط کے ساتھ برشٹ کی دو نظمیں بھیج رہا ہوں۔ ایک شام میں آپ ان کا ترجمہ کر سکتے ہیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ آپ کا، سردار جعفری

انگریزی امریکی شاعر کارل سینڈ برگ Carl Sand berg کی کتاب The yes people کی بھی کچھ نظمیں بہت شاندار ہیں، ان کی طرف بھی توجہ لیجئے۔ سردار

☆

بمبئی، ۲۴/ستمبر ۷۴ء

برادرم تسلیم! ایک عرصے سے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دہلی کی کسی محفل میں بھی آپ نظر نہیں آئے، خیریت کا کوئی خط بھی نہیں ملا۔ آپ غالباً اپنے کام میں زیادہ مصروف ہیں، عصری ادب بھی مدت سے شائع نہیں ہوا ہے اس کے لئے میں نے پابلو نرووا، جولیو کیوری، پال روبسن، لوئی آف گون وغیرہ پر چند نظمیں بھیجی تھیں۔ اگر عصری ادب کی اشاعت میں تاخیر ہوتو اجازت دیجئے کہ میں وہ نظمیں کہیں اور شائع کر دوں۔ آپ کے جواب کا منتظر ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

بمبئی،۴/اکتوبر۷۴ء

برادرم تسلیم! آپ کا خط ملا،شکریہ۔عصری ادب کا آخری شمارہ نمبر۱۳تا۱۶ مجھے نہیں ملا ہے، کہیں ڈاک کی بدانتظامی کی نذر ہوگیا ہوگا،مہربانی فرما کر ایک کاپی دوبارہ بھجوادیجئے۔

۵/دسمبر کو دہلی میں یوم مجاز منانے کا خیال بہت اچھا ہے،اس تقریب کی تفصیلات جب مکمل ہوجائیں تو تحریر فرمایئے گا۔میرا خیال ہے کہ اس شام کو دہلی ٹیلی ویژن سے مجاز پر ایک آدھے گھنٹے کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونا چاہیے۔اس معاملے میں آپ دہلی ٹیلی وژن کے ڈائریکٹر چاؤلا صاحب سے اور پروڈیوسر خالد سلطان سے مشورہ کرلیجئے۔اگر ضرورت ہوتو میں چاؤلا صاحب کو خط لکھ دوں۔

آئندہ دہلی کی طرف گزر ہوگا تو آپ کو ضرور ٹیلی فون کروں گا۔آپ کو یہ خوش خبری سنادوں کہ ہندستانی بک ٹرسٹ کی طرف سے مجاز کی کتاب آہنگ کا اردو ہندی ایڈیشن غالب اور میر کے دیوانوں کے انداز پر ۱۹۷۵ء کے شروع میں غالباً تیار ہوجائے گا۔

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کا،سردار جعفری

☆

بمبئی،۲۱/نومبر۷۴ء

برادرم تسلیم! آپ ک ۲۸/اکتوبر کے خط کا جواب اتنی تاخیر سے دے رہا ہوں۔شرمندہ ہوں،وجہ کوتاہ قلمی نہیں بلکہ بے انتہا مصروفیت۔

یوم مجاز کا پروگرام میں بمبئی میں بیٹھ کر نہیں بنا سکتا۔یہ کام آپ ہی کو کرنا ہے۔میں حاضر ہوجاؤں گا۔دسمبر کے پہلے ہفتے میں دہلی آرہا ہوں۔وسط دسمبر میں بمبئی اور حیدرآباد کی مصروفیات ہیں پھر آخر دسمبر میں آسکتا ہوں۔

عصری ادب کے ایک نمبر کو ترقی پسندی کے پانچ شعرا کے فن اور شخصیت کے لئے وقف کرنے کا خیال بہت مبارک ہے۔لیکن اپنے معاملے میں ''خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ'' بننا پسند نہیں کرتا۔آپ خود انتخاب کریں تو مجھے خوشی ہوگی۔مشورے میں ضرور شریک ہوجاؤں گا،لیکن انتخاب کے معاملے میں آخری فیصلہ میرا نہیں ہوگا،آپ تو دوست ہیں،میں مخالفین کو بھی انتخاب کا حق دیتا ہوں.....

ہندستان کے دو بہت بڑے مصور میری اکیس نظموں کو اپنی مصوری کی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں،اس میں بعض وہ نظمیں ہیں جو مختلف محنت کشوں کے تخلیقی ہاتھوں اور محبت کے عمل پر ہیں،اس موضوع

کو مجھ سے پہلے کسی شاعر نے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔اس کتاب کے تیار ہونے اور چھپنے میں کم سے کم دو سال لگ جائیں گے۔اگر آپ اس میں سے کوئی تصویر استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں لیکن یہ ساری تصویریں رنگین ہیں،ان کے لائن بلاک نہیں بن سکتے۔نہ ہاف ٹون بلاک ہوں گے۔اور رنگین ہی چھپیں گے۔

امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ آپ کا،سردار جعفری

☆

بمبئی،۱۹/ جون ۷۵ء

برادرم،تسلیم! آج آپ کا لفافہ دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔اندر سے نئے کلاسیک پر آپ کا تبصرہ نکلا،خوشی ہوئی کہ چھ مہینے میں آپ نے گفتگو کے لئے اپنا وعدہ پورا کیا۔مجھے آپ کی مصروفیات کا اندازہ ہے لیکن مخالفوں کی یلغار کو روکنے کے لئے ہم کو اور آپ کو بہرحال مل کر کام کرنا ہے۔یہ معلوم کر کے اور بھی مسرت ہوگی کہ ایک اور مقالہ تیار ہے۔اس کو بھی جلد سے جلد نقل کرا کے بھیج دیجئے تا کہ ستمبر ۷۵ء کے شمارے میں شامل ہو جائے،اس کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔''نئے کلاسیک'' بھی ستمبر ۷۵ء ہی کے شمارے میں شامل ہو سکے گا کیوں کہ مارچ اور جون کا شمارہ چھپ چکا ہے اور اس کی جلد باندھی جا رہی ہے۔آپ کا تبصرہ تین چار دن پہلے بھی آ گیا ہوتا تو میں اسے جون ہی کے شمارے میں شامل کر لیتا۔اس میں ڈاکٹر قمر رئیس کا لکھا ہوا تبصرہ نئی علامت نگاری پر ہے۔

جدیدیت کے بیمار اور منحوس رجحانات بہت پھیلے ہوئے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے اردو ادب پر ایک آسیب کا سایہ ہے،لیکن یہ رجحانات اپنا مقام نہیں بنا سکے ہیں اور نہ بنا سکیں گے۔ترقی پسند تحریک کی طرف سے تخلیق کی لو ذرا زیادہ تیز کرنے کی ضرورت ہے۔اچھے تبصرے بہت کام کی چیز ہیں،ان پر خاص طور سے توجہ کرنی چاہیے،آپ،قمر رئیس اور محمد عقیل اگر صف باندھ کر اور کمر کس کر لکھیں تو سال بھر میں فضا بدل جائے گی۔

میں نے اپنے ایک خط میں آپ کو وارث علوی کے ایک مضمون ''ادب اور فاشزم'' کی طرف توجہ دلائی تھی، جو مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی اورنگ آباد کے رسالہ ''غبار خاطر'' کے جنوری کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔اس میں ترقی پسندوں کے خلاف بہیمانہ تشدد استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔اس مضمون کا ایک بھرپور جواب لکھنے کی ضرورت ہے،آپ اور قمر رئیس اس طرف توجہ کریں، میں نے گفتگو کے تازہ شمارے میں وارث کی خبر لی ہے۔

آپ کا تبصرہ نئے کلاسیک پر بہت اچھا ہے۔شکریہ اور مبارک باد قبول کیجئے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

آپ کا تبصرہ نئے کلاسیک نظر ثانی کا محتاج ہے، بعض مقامات ایسے ہیں جنہیں میں ٹھیک نہیں کرسکتا، میں جولائی میں دہلی آرہا ہوں تو کتابت شدہ اوراق ساتھ لے کر آؤں گا۔ آپ ٹھیک کر دیجئے گا۔

☆

بمبئی، ۴/ جولائی ۷۶ء

برادرم ڈاکٹر محمد حسن تسلیم! ۲۴/ جون کا پوسٹ کارڈ مل گیا تھا، عصری ادب کا شمارہ اس سے پہلے آ گیا تھا، اپنی مصروفیات کی وجہ سے جواب جلد نہ دے سکا۔ گفتگو تیار ہے۔ ایک ہفتے میں پوسٹ ہوجائے گا۔ افسانوی حصہ کمزور ہے۔ شعری حصہ قابل برداشت ہے۔ مضامین کے حصے میں دو اچھی چیزیں ہیں ایک وحید اختر کا مقالہ مخدوم پر اور ایک پاکستانی ادیب کا مضمون سجاد ظہیر پر، آئندہ شمارہ ستمبر میں شائع ہوجائے گا، اس کا تخلیقی حصہ کچھ بہتر ہوگا۔ عصری ادب کے لئے جلد کچھ لکھ کر بھیج دوں گا۔

آپ اپنی تحریروں میں ترقی پسند ادب اور تحریک کی کمزوریوں کی جو نشان دہی کر رہے ہیں وہ بہت مناسب ہے لیکن اس کے ساتھ دو کام اور ضروری ہیں، **ایک** جدیدیت کی آئڈیولاجکل بنیادوں کا جائزہ۔ میری مراد اس کے رجعت پرست پہلو سے ہے اور لایعنی فلسفہ سے اور مہمل تخلیقات سے۔ اس کے صحت منداور ترقی پسند پہلوؤں کو الگ کر لینا چاہیے۔ **دوسرے** چالیس سال کی ترقی پسند تخلیق کے جو کارنامے (Achievments) ہیں ان کو نمایاں کرنا۔ بارہ پندرہ افسانہ نگاروں، شاعروں اور نقادوں کے انتخاب کر کے ان پر الگ الگ مفصل اور سیر حاصل مضامین کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں کام ایسے ہیں جن کے لئے آپ تنہا وقت نہ نکال سکیں گے۔ سوچیے کہ اسے کس طرح انجام دیا جاسکتا ہے۔ کون کون اس میں شریک ہوسکتا ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

بمبئی، ۷/ جولائی ۷۶ء

برادرم تسلیم! آپ نے دسمبر ۷۴ء میں حیدرآباد کے اقبال سمینار میں جو مقالہ پڑھا تھا، اس کا عنوان مجھے یاد نہیں رہ گیا ہے، عابد علی خاں صاحب نے مجھے زبانی بتایا تھا کہ حیدرآباد کے سیمینار کے مقالات کی کتاب چھپ گئی ہے۔ شاید اب تیار ہو۔ وہ کتاب میں نے منگائی ہے، اس میں آپ کا مقالہ شامل ہوگا، اگر آپ اس پر نظر ثانی کرنا چاہتے ہوں، ضروری ترمیم کر کے میرے پاس بھیج دیجئے۔ یہ اور

دوسرے مقالات، باباجان غفوروف نے منگائے ہیں، سویت یونین میں بھی اقبال کا صد سالہ جشن منایا جائے گا اور اس موقع پر ایک کتاب شائع ہوگی جس میں سویت یونین، ہندستان اور پاکستان کے دانش وروں کے مقالات شائع ہوں گے، مقالات کا انتخاب سویت یونین میں کیا جائے گا۔

اقبال کی یادگار قائم کرنے کے سلسلے میں ایک تجویز یہ زیر غور ہے کہ ایک Iqbal centre of Indian and Iranian Languages and literatures دہلی میں قائم کیا جائے، آپ بھی اس کے بارے میں مشورہ دیجئے کہ کس قسم کا کام کیا جائے اور اس کی تنظیمی شکل کیا ہو، اس طرح کے متعدد مرکز ہندستان میں کام کر رہے ہیں، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں مغربی ایشیا سے متعلق مرکز کام کر رہا ہے، شانتی نیکیتن میں چین اور جاپان پر کام ہو رہا ہے، ہمارے مرکز کی نوعیت ذرا مختلف ہوگی کیوں کہ ہم اس میں ہندستان کی زبانوں اور ان کے ادب کو بھی شامل کر رہے ہیں، مختلف حلقوں سے مسودے حاصل کرنے کے بعد مسودہ تیار کیا جائے گا، اس سال کے آخر تک اسکیم مکمل ہو جائے تو عملی اقدامات کیے جائیں اور نومبر ۱۹۷۷ء میں جشن اقبال کی تکمیل کے بعد اقبال سنٹر کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

بمبئی، ۲۱/ جولائی ۷۶ء

برادرم تسلیم! ۱۷/ جولائی کا خط ملا، میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہوں کہ جدیدیت کی فکری بنیادوں کی تنقید منفی کام ہے۔ بہر حال آپ جس نہج پر کام کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں اس سے بھی مفید نتائج برآمد ہوں گے، لیکن میرا خیال تھا کہ اگر تینوں باتوں کو ملایا جاتا تو زیادہ بہتر نتیجہ نکلنے کا امکان تھا۔

عصری ادب کے لئے ضرور لکھوں گا لیکن اس وقت میرے پاس نثر اور نظم دونوں میں سے کوئی چیز نہیں ہے، آج کے بعد جو پہلی تخلیق ہوگی وہ عصری ادب کے صفحات کے لئے ہوگی۔ عصری ادب کا تازہ شمارہ کب تک نکلے گا؟

میں نے عالم خوندمیری کو خط لکھ دیا ہے، کیا آپ نے خود انہیں اب تک خط نہیں لکھا؟

گفتگو تیار ہے۔ دو تین دن میں پوسٹ ہو جائے گا۔ اس میں نئے کلاسیک پر آپ کا تبصرہ بہت اچھا ہے۔ دوستوں نے پسند کیا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا سردار جعفری

پس نوشت: میری ایک مدد کیجئے۔ انگریزی کا لفظ Data کے لئے اردو کا کوئی معقول لفظ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ اگر آپ کوئی تجویز کرسکیں تو اچھا ہے ورنہ اس عبارت کا ترجمہ میرے لئے کردیجئے۔

Reducible to an act of given data.

☆

بمبئی، ۱۵/ اگست ۷۸ء

برادرم تسلیم! آپ نے گزشتہ نومبر ۷۷ء کے بین الاقوامی سیمینار میں جو مقالہ پڑھا تھا Iqbal poet of tensions وہ اب تک موصول نہیں ہوا ہے۔ مقالات کی کتاب شائع ہورہی ہے۔ مزید تاخیر کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر آپ کا مقالہ اس کتاب میں شامل نہ ہوسکا تو کتاب نامکمل رہے گی۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ جواب کا انتظار ہے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

بمبئی ۱۹۷۹ء

برادرم تسلیم! آپ کا عنایت نامہ ملا، پندرہ اگست کا انتظار ابھی سے شروع کردیا ہے، مارکسی تنقید پر اس وقت تک آپ کا مقالہ ضرور مل جائے گا یقین بھی ہے اور مسرت بھی۔ اقبال پر آپ کا انگریزی مقالہ بھی مل جانا چاہیے۔ یوں تو اس کو شامل کرنے کی گنجائش آخر اگست تک ہے، لیکن کتاب ایڈیٹ ہوگئی ہے، اور ڈاکٹر ملک راج آنند اس پر دیباچہ لکھ رہے ہیں، آپ کا مقالہ بھی ان کے سامنے ہونا بہتر ہے، کتاب دہلی یا علی گڑھ کے پریس میں چھپے گی اور ۹/ نومبر کو اس کا جشنِ اجراء ہوگا جو ایک طرح سے جشنِ اقبال کی تکمیل کا اعلان ہوگا۔

ترقی پسند ادب نمبر کی حیثیت ایک طرح کی تاریخی ادبی دستاویز کی ہوگی، میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ اس موضوع پر مختلف حضرات کے انٹرویو شریک اشاعت کئے جائیں۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب پر کیا اثر چھوڑا، اور تحریک کس حد تک عہد حاضر میں Relevant ہے۔ آپ اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیے۔ میں تنہا سب کچھ نہیں کرسکتا۔ پہلے دس بارہ ادیبوں کی فہرست بنالیجئے، میں بھی اپنا مشورہ دے دوں گا، پھر یہ سوال ان کو لکھ کر بھیج دیجئے اور جوابات جلد سے جلد حاصل کرلیجئے، وہ ایک جگہ جمع ہوجائیں تو ہم اور آپ ایک ساتھ بیٹھ کر ان پر نظر ڈال لیں گے، لیکن یہ کام صرف اس صورت میں ممکن ہوگا جب آپ وقت دیں، یعنی سوال بھیج دینے کے بعد جواب کا تقاضا بار بار کریں۔ بسم اللہ کیجئے اور سب سے پہلے فہرست عنایت کیجئے، اس کے بعد دوسرا قدم۔

میرا خیال ہے کہ فیض، مجروح، اور مجاز پر ایک ایک ہزار الفاظ کے مضامین لکھنے کے لئے آپ چار پانچ شاعیں نکال لیں تو کام ہو جائے گا۔

میرا خیال تھا کہ آٹھ سو صفحات تک مختلف اصناف ادب کی نمائندگی کے لئے کافی ہوں گے، لیکن وہ کم پڑ رہے ہیں، اس لئے ترقی پسند ادب نمبر میں تاریخی دستاویزیں (خطبات وغیرہ) تنقیدی مضامین کا انتخاب، افسانے اور شعر کا انتخاب شامل کیا جا رہا ہے۔ ڈرامہ نمبر میں نے الگ کر دیا ہے جو اس نمبر کے بعد شائع ہوگا اور ۱۹۸۰ء میں شائع کیا جائے گا۔

آپ کا ڈرامہ ضحاک اس میں ضرور شامل کیا جائے گا۔ اس نمبر کا خاکہ تیار کرنے کے بعد آپ سے مشورہ کروں گا۔ میں غالباً وسط اگست تک دہلی کی طرف آؤں گا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆

بمبئی، ۳۱/ جنوری ۱۹۸۱ء

برادرم تسلیم! خط ملا، شکریہ۔ کبیر بانی کے سلسلے میں علی جواد زیدی کو کچھ لکھنا مناسب نہیں سمجھتا حالانکہ وہ میرے دوست ہیں لیکن میں ان سے یہ درخواست نہیں کرنا چاہتا کہ وہ اس کا نیا اڈیشن شائع کر دیں۔ میں ایسی باتوں سے گریز کرتا ہوں۔

آپ نے اپنے طور پر کتاب مجھ سے منگوائی تھی اور اس کو اتر پردیش اردو اکیڈمی سے شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، وہ کتاب وہاں سے شائع نہیں ہوئی اس کی کوئی شکایت نہیں ہے، مجھے صرف وہ نسخہ واپس چاہیے اس لئے کہ وہ کتاب اب نایاب ہے اور اس کی کوئی کاپی میرے پاس نہیں ہے۔ جب میں نے کتاب بھیجی تھی تو یہ لکھا تھا کہ آپ اسے واپس کر دیں گے اور یقین تھا کہ آپ اس خواہش کا احترام کریں گے۔

مناسب یہ ہوگا کہ آپ علی جواد زیدی کو خط لکھ کر وہ کتاب میرے پاس بھجوا دیجئے۔ بہت عنایت ہوگی۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کا، سردار جعفری

☆☆☆

آزادی کے بعد
اردو کے بڑے تبصرہ نگار

سُرور صاحب (آل احمد سرور) کے ''ہماری زبان'' میں اکابر کے تبصرے: ایک اشاریہ

(ش)

O

ہماری زبان کے تبصرے پیش نظر ہیں : اشاریہ سازی، وہ انڈکسنگ ہو یا بلیو گرافی، نیکی کا کام ہے جو دوسروں کے قیمتی وقت کو بچانے کی ایک راہ نکل آتی ہے، اچھا کام ہے اور اچھا کام اسکا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ اسے اچھے طور سے انجام دیا جائے۔ مگر لگتا ہے کہ یہ اچھے کام سے بھی بڑھ کر ہم کتابداروں پر تو یہ فرض کے طور سے عائد ہوتا ہے کہ اپنا وقت ایسے کاموں میں لگا دیں تا کہ دوسروں کا وقت بچ جائے، بلکہ ہماری نظر میں تو یہ فرض سے بڑھکر ایک فرض کفایہ ہے جسے ہم میں سے کسی نہ کسی کو انجام دینا ہی ہے۔ فرض کفایہ، تو آپ کو معلوم ہی ہے، کہ ایسا فرض ہوتا ہے جو اپنے اپنے حلقوں میں بٹی ہوئی سوسائٹی کے ہر حصہ پر، اسکے ہر فرد پر، عائد ہوتا ہے۔ اور سوسائٹی کا ہر فرد اس وقت تک گناہگار ٹھہرتا ہے جب تک ان سب کی طرف سے کوئی ایک، اس مخصوص فرض کو اپنے ذمہ لے کر انجام نہیں دے دیتا۔ اور کیسا دلچسپ ہے یہ فرض کہ جب کوئی ایک فرد اپنے اردگرد کی ساری کمیونٹی کی طرف سے (behalf پر) وہ فرض انجام دینے کی ذمہ داری سنبھال لیتا ہے تو پوری کمیونٹی کے اوپر سے وہ فرض ادا ہو جاتا ہے۔ مذہبی حلقوں میں یہ امر نجات کا تصور لے لیتا ہے اور کہیں مسیح کے مصلوب ہونے کو پوری قوم کی نجات کا باعث قرار دیدیتا ہے اور کہیں کربلا کے استعارہ میں ڈھل جاتا ہے۔ ہم اتنی بڑی سی کوئی بات تو نہیں سمجھتے تاہم وقت، توانائی، اور صلاحیتوں کی ایک بڑی قربانی تو یہ بھی ہے کہ برسوں تک کام کرتے رہ کر کیا جائے، ریزہ ریزہ حوالے جمع کئے جائیں اور انہیں ایسی رسانیت سے ضرورتمند یا متلاشی تک پہنچا دیا جائے کہ اسے پتا بھی نہ چلے کہ جو اسکی ضرورت کی اطلاعات تھیں، جنہیں تلاش کرنے میں اسے مہینے لگتے، وہ چند منٹ میں اسے کیسی آسانی سے مل گئیں۔

آزادی کے بعد جب **انجمن** علی گڑھ آ گئی اور ہماری زبان اردو ادب علی گڑھ سے نکلنے لگے تو اردو ادب کے ایڈیٹر سرور صاحب رہے اور ہماری زبان کے مدیر کے طور پر قاضی عبدالغفار صاحب کا نام آتا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد سرور صاحب نے انجمن کی ذمہ داری سنبھالی، اردو ادب کی بھی، ہماری زبان کی بھی۔ ہماری زبان قاضی عبدالغفار صاحب کے علی گڑھ آنے کے بعد سے اچھی خاصی پابندی سے نکلتا رہا تھا۔ سرور صاحب کے علی گڑھ آنے کے بعد اور زیادہ باضابطگی آ گئی۔

اردو رسالوں میں **تبصرے** عام طور سے تو چلتے ہوئے سے ہوتے ہیں لیکن بعض پرچوں میں مبصر دل لگا کے بلکہ دل جلا کے لکھتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ تبصرے ہمارے سامنے ہیں۔ ان تبصروں کا ایک

اشاریہ ملاحظہ میں لایا جارہا ہے۔ اہم تر بات یہ ہے کہ ان تبصروں کے لکھنے والے بھی اردو کے ممتاز مصنفوں میں ہیں اس لئے اس بہانے ان بھولے بسرے تبصرہ نگاروں کے نام اور تحریریں بھی آپ کے سامنے ہماری موجودہ ترتیب میں جھانکنے لگیں تو یہ حوالے پا کر آپ کو خوشی ہوگی۔

ہماری زبان (علی گڑھ) کے تبصرہ نگاروں میں اردو زبان وادب کے اہم اکابر شامل رہے ہیں۔ اس کا لحاظ رکھیں کہ یہ تبصرے محض تبصرے نہیں بلکہ ان اکابر کی تحریروں کی خود اپنی ایک اہمیت ہے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ ہماری زبان کے آغاز سے ۲۰۱۸ء تک، کے تبصروں کے حوالے ایک جگہ سمیٹ لیے جائیں۔ مگر سب کام کہاں ممکن ہوتے ہیں، بس جتنا کچھ بھی ممکن ہو سکے کر جائیں تو کچھ نہ کچھ سکون رہتا ہے۔ فی الحال عہد سرور کے ۱۹۸۵ تا ۱۹۶۰ء بطور حصہ اول، اور بطور حصہ دوم ۱۹۶۱ء تا اپریل ۱۹۷۴ء (جب سرور صاحب نے ڈاکٹر خلیق انجم کو ہماری زبان کی ادارت کی ذمہ داری سپرد کی) کے ہماری زبان کے تبصرے ملاحظہ میں لائے جارہے ہیں۔ ان تبصرہ نگاروں کی فہرست سے اندازہ ہوگا کہ ان مبصروں کی کیسی اہم مگر بھولی بسری تحریریں کہاں کہاں چھپی پڑی رہ گئی ہیں۔ تبصرہ نگاروں (اور مبصروں) کے نام ملاحظہ ہوں:

اسلوب احمد انصاری۔ اصغر عباس ۔ اطہر پرویز ۔ انصار اللہ نظر۔ انور معظم ۔ اولاد احمد صدیقی۔ آل احمد سرور۔ بشیر بدر۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ۔ رحم علی الہاشمی ۔ شمیم حنفی۔ شہریار۔ ضیاء احمد بدایونی۔ عبدالحق (اقبال والے)۔ عبدالغفار شکیل ۔ عتیق احمد صدیقی۔ قاضی عبدالستار۔ کبیر احمد جائسی۔ گیان چند جین۔ محمد رضا انصاری۔ محمد عتیق صدیقی (کمپنی کے عہد والے)۔ محمد یسین (انگریزی والے)۔ محمود الٰہی۔ مختار الدین احمد آرزو۔ منظر عباس نقوی۔ منیب الرحمٰن ۔ ناصر حسین نقوی۔ وارث کرمانی۔ وحید اختر۔ وحید مرزا۔ سید وقار حسین۔ انور معظم صاحبان۔

یہ تو صرف عہد آل احمد سرور کی بات ہوئی۔ آگے عہد خلیق انجم اور پھر عہد اطہر فاروقی کا سلسلہ، ہمارے بعد کے اس اشاریہ مہم میں حصہ لینے والے، امید ہے، آئندہ، ہم سے زیادہ سلیقے سے آپ کے سامنے لاتے رہیں گے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ پہلے مبصر کا نام ہو۔ ہم نے مبصر کا نام زیر تبصرہ کتاب کے عنوان اور زیر تبصرہ مصنف کے نام کے بعد دے دیا ہے جو ترجیحاً سب سے پہلے آنا تھا۔ تاہم اس کمی کو دور کرنے کے لئے ہم نے تبصرہ نگاروں کے ناموں کا انڈیکس آخر میں مہیا کر دیا ہے، امید ہے اس سے مذکورہ

کمی پوری ہو جائے گی۔

زیر تبصرہ کتابوں کی سنہ وار ترتیب ہے، یعنی پہلے ۱۹۵۸، پھر ۱۹۵۹، پھر ۱۹۶۰، (اسی طرح ۱۹۶۱ تا ۱۹۷۴ سلسلہ آگے بڑھتا ہے) یہ سنہ وار ترتیب ایک لحاظ سے کارآمد ہے۔ عنوانات پہلے دے دیے ہیں تاہم عنوانات کی ترتیب ابجدی نہیں ہے جو دی جا سکتی تھی۔

ہم نے آغاز تحریر میں آپ سے ذکر کیا تھا کہ تبصرہ نگاروں میں آج کی اردو کے کچھ اہم ترین نام ان میں شامل ہیں۔ زیر تبصرہ کتابیں ترتیب میں نہیں ہیں بلکہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۷۴ء کے عرصے میں جن کتابوں پر تبصرہ ہوا وہ سال وار درج ہیں۔ تبصرہ نگاروں کے نام بھی ترتیب وار نہیں ہیں۔ ہمارے خیال میں تبصرہ شدہ کتابوں کو بھی ترتیب میں لے آنا چاہیے تھا اور مصنفوں کو بھی۔ وہ ہم نے ابھی نہیں کیا؛ آپ کر لیں۔ ہم نے چونکہ تبصرہ نگاروں کو اہمیت دی ہے اس لئے، اور یہ تبصرہ نگار اردو کے اہم اکابر میں ہیں اس لئے بھی، ان کی ابجدی فہرست بنا دی ہے۔ اور ہر تبصرہ نگار کے نام کے تحت ان کی وہ تحریریں مل جائیں جو تبصرے کے تحت ہماری زبان میں لکھی گئی ہیں اس کے لئے ہر تبصرہ نگار کے نام کے تحت اندراج نمبر کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔ اس میں ہر اندراج پر سیریل نمبر ہونا ضروری تھا ورنہ حوالے دینا دشوار ہو جاتا۔ سیریل نمبر دینے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ اتنے ہی گھنٹے ان سیریل نمبروں کے حوالوں کے ساتھ تبصرہ نگاروں کے نام درج کرنے میں لگ گئے۔

چنانچہ پڑھنے والوں، ریسرچ کرنے والوں، اپنے مواد کو تلاش کرنے والوں کے لئے آسانیاں پیدا ہوتی چلی جائیں، یہ ہدف سامنے رکھ کے ہم نے ایک ریفرنس سروس شروع کر دی ہے۔ وقت کو دوسروں کی نذر کرنے کا **صلہ** کہاں ملتا ہے، اور ممکن بھی کیسے ہے۔ اصل صلہ تو مالک الملک کے ہاتھوں میں ہے۔ وباللہ التوفیق!

☆

اس سے پہلے کی سطریں تو آپ پڑھ چکے، اپنا احسان جتایا، اب احسان واپس لینے کی طرف آئیں:۔

گاڑی کا کتا محاورہ سنا ہوگا؛ مگر کہاں سنا ہوگا آپ نے : نہ گاؤں جائیں نہ وہ گاڑیاں دیکھیں جن کو اکثر دو بیل اور کبھی ایک ہی بیل کھینچتا ہوتا ہے (جسے ریلو کہتے ہیں)۔ اس کے نیچے کبھی کبھی جو کتا چلتا ہوتا ہے وہ سمجھتا ہوتا ہے کہ میں ہی اس گاڑی کو کھینچ رہا ہوں، حالانکہ گاڑی بان کوئی اور ہی ہوتا ہے، ہر گاڑی کا چلانے والا، ہمارا آپ کا مالک! **(ش)**

بڑے تبصرہ نگار-حصہ اول

عہد سُرور کے ''ہماری زبان'' میں اکابر کے تبصرے

1958-1960

تبصرہ نگار

آل احمد سرور	شہاب جعفری	عتیق صدیقی
اسلوب احمد انصاری	صفدر آہ	محمد حسن
تلوک چند محروم	شہاب سرمدی	عمر الدین، محمد
حکیم عبد اللطیف	ضیاء احمد بدایونی	نذیر احمد
خلیل الرحمٰن اعظمی	ضیاء الحسن	نصیر الدین ہاشمی
سعید احمد اکبر آبادی	ظ۔ انصاری	وارث کرمانی
سمپورنانند	عابد رضا بیدار	

۱۹۵۸ سے ۱۹۶۰ تک کے اندراجات کی ترتیب اس طرح ھے:

مبصر کا نام، پھر کتاب کا نام،پھر منصف / مرتب کا نام ، پھر بریکٹ میں ھماری زبان پھر تاریخ

1) وارث کرمانی مبصر:''مجاز کے لطیفے'' مرتبہ احمد جمال پاشا(یکم جنوری،۱۹۵۸)
2) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: انجمن (سہ ماہی) نہرونمبر ج اش۲(۱۵/جنوری،۱۹۵۸)
3) وارث کرمانی مبصر:لکھنواور جنگ آزادی (۲۲/جنوری،۱۹۵۸)
4) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: شرح رہنمائے فارسی مرتبہ سید منظورالحسن برکاتی (۱۵/فروری،۱۹۵۸)
5) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: آئینہ عملی قواعد حصہ اول دوم سوم مرتبہ سید منظورالحسن صاحب برکاتی (۱۵/ فروری،۱۹۵۸)
6) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: تذکرۂ نادر مرتبہ سید مسعود حسن رضوی، پروفیسر (۱۵/فروری،۱۹۵۸)
7) وارث کرمانی مبصر: ادبی تجزیے از مبشر علی صدیقی، پروفیسر ایم اے (۲۲/فروری،۱۹۵۸)
8) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: سوز وگداز از سوز لائل پوری (۸/مارچ،۱۹۵۸)
9) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: حیدرآباد کے بڑے لوگ از سید غلام پنجتن شمشاد (۸/مارچ،۱۹۵۸)
10) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: اردو کے بہترین انشا پرداز۔مولانا شبلی از سعید انصاری (۸/ مارچ،۱۹۵۸)
11) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: تنقیدی شعور از سید اختر علی تاہری (۲۲/مارچ،۱۹۵۸)
12) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: ارمغان امجد مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد (۲۲/مارچ،۱۹۵۸)
13) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: پن چکی اردو نگ آباد از سید مبارز الدین رفعت (۲۲/مارچ،۱۹۵۸)
14) وارث کرمانی مبصر:شعلۂ نے از حامد الہ آبادی (یکم و۸/اپریل،۱۹۵۸)
15) وارث کرمانی مبصر: نگہت گل از علیم اختر (یکم و۸/اپریل،۱۹۵۸)
16) نذیر احمد ڈاکٹر مبصر: چندر بدن مہیار از مقیمی (۲۲/اپریل،۱۹۵۸)
17) نذیر احمد، ڈاکٹر مبصر: قصہ رضوان شاہ وروح افزا از فایز پر تبصرہ بذیل تبصرہ (یکم مئی،۱۹۵۸)
18) سمپورنانند جی مبصر: اردو کے مطالبہ پر تبصرہ (۸مئی،۱۹۵۸)
19) ظ۔انصاری مبصر: ہندستانی اخبار نویسی، از محمد عتیق صدیقی (۱۵/مئی،۱۹۵۸)

20) ضیاء احمد بدایونی مبصر: بزم داغ از سید رفیق صاحب مارہروری (یکم جون، ۱۹۵۸)
21) وارث کرمانی مبصر: مئی ۱۹۵۸ء کا پی ای این نمبر (۸/جون، ۱۹۵۸)
22) آل احمد سرور مبصر: آشفتہ بیانی میری از رشید احمد صدیقی پر (۸ جولائی، ۱۹۵۸)
23) نصیر الدین ہاشمی مبصر: ''ہندستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'' پر ایک طائرانہ نظر (۱۵/جولائی، ۱۹۵۸)
24) ضیاء احمد بدایونی مبصر: گنج معانی از تلوک چند محروم (یکم ستمبر، ۱۹۵۸)
25) وارث کرمانی مبصر: مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میگزین نگراں اشتیاق محمد خاں (۸ستمبر، ۱۹۵۸)
26) وارث کرمانی مبصر: اسکالر پیروڈی نمبر مرتبہ احمد جمال پاشا (۸ستمبر، ۱۹۵۸)
27) ضیاء احمد بدایونی مبصر: محکمات از علامہ عبداللہ العمادی (۱۵/ستمبر، ۱۹۵۸)
28) ضیاء احمد بدایونی مبصر: دین الٰہیہ کے عناصر اربعہ از نواب سید محمد عباس صاحب طالب صفوی (۱۵/ستمبر، ۱۹۵۸)
29) محمد حسن مبصر: آجکل (دہلی) ابوالکلام نمبر (۲۲/ستمبر، ۱۹۵۸)
30) محمد حسن مبصر: راتوں کا شہر از شوکت صدیقی (۲۲/ستمبر، ۱۹۵۸)
31) ضیاء احمد بدایونی مبصر: نوبہ نواز ڈاکٹر صدر آہ سیتاپوری (یکم اکتوبر، ۱۹۵۸)
32) ضیاء احمد بدایونی مبصر: اسباب زوال امت، از..... (یکم اکتوبر، ۱۹۵۸)
33) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: جلوے از معین الدین دردائی (۲۲/اکتوبر، ۱۹۵۸)
34) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: نقوش فانی از کبیر احمد جائسی (۲۲/اکتوبر، ۱۹۵۸)
35) صفدر آہ مبصر: میری مثنوی نوبہ نو اور جناب ضیاء احمد کا تبصرہ (یکم نومبر، ۱۹۵۸)
36) ضیاء الحسن مبصر: پنڈت نہرو سے بات چیت مترجم سعادت علی خاں (۸نومبر، ۹۵۸)
37) ضیاء الحسن مبصر: بہتے آنسو از محمد علی افسر (۸نومبر، ۱۹۵۸)
83) ضیاء الحسن مبصر: قصیدہ آزادی اور آسمانی مشاعرہ از حضرت نوری (۸نومبر، ۱۹۵۸)
39) ضیاء الحسن مبصر: نسیم میسوری کے سو شعر مرتب عبدالقادر (۲۲نومبر، ۱۹۵۸)
40) ضیاء الحسن مبصر: وادی خیال از جوہر زاہری (۲۲نومبر، ۱۹۵۸)
41) ضیاء الحسن مبصر: آب و تاب از سعادت نظیر (۸/دسمبر، ۱۹۵۸)

42) ضیاءالحسن مبصر: غیر طرحی مشاعروں کا مجموعہ مرتب حافظ محمد ایوب خاں قمر (۸/دسمبر، ۱۹۵۸)
43) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: ادب میں ترقی پسندی از گوپال متل (۱۵/دسمبر، ۱۹۵۸)
44) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: **اسبابِ بغاوت ہند از سرسید احمد خاں** (۱۵/دسمبر، ۹۵۸)ا
45) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: ماں از گورکی (۱۵/دسمبر، ۱۹۵۸)
46) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: زندگی کے کھیل از صالحہ عابد حسین (یکم جنوری، ۱۹۵۹)
47) محمد حسن، ڈاکٹر مبصر: نئے ادبی رجحانات از سید اعجاز حسین (یکم جنوری، ۱۹۵۹)
48) آل احمد سرور مبصر: حیدرآباد کے شاعر (انتخاب کلام) مبصر: مرتب خواجہ حمید الدین شاہد (۱۵/فروری، ۱۹۵۹)
49) آل احمد سرور مبصر: حیدرآباد کے ادیب (انتخاب نثر) مرتبہ زینت ساجدہ (۱۵/فروری، ۱۹۵۹)
50) ضیا احمد بدایونی مبصر: درس اسلام از حفیظ الرحمٰن واصف (۸/مارچ، ۱۹۵۹)
51) عابد رضا بیدار مبصر: کاروانِ ادب ۵۹-۱۹۵۸ء (مجلّہ اردو لٹریری سوسائٹی بمبئی) از **عابد رضا بیدار** (۱۵/مارچ، ۱۹۵۹)
52) ضیاءالحسن مبصر: فن کتاب از سید کلب مصطفیٰ (۲۲/مارچ، ۱۹۵۹)
53) ضیاءالحسن مبصر: مولانا ابوالکلام آزاد (بچوں کے لئے) مرتب وقار خلیل مبصر: (۲۲/مارچ ،۱۹۵۹)
54) ضیاءالحسن مبصر: عالم برزخ کا ایک مشاعرہ۔ مرتب ڈاکٹر حسنین (۲۲/مارچ، ۱۹۵۹)
55) ضیاءالحسن مبصر: امتحان میں کامیابی کے راز۔ مرتب منظور الحسن برکاتی (۲۲/مارچ، ۱۹۵۹)
56) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: نذر خیام از راجہ مکھن لال (یکم اپریل، ۱۹۵۹)
57) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: خبر و نظر از سید حیدر علی (یکم اپریل، ۱۹۵۹)
58) ضیاء احمد بدایونی مبصر: تصویر از مولوی اسحاق سندیلوی، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (یکم اپریل، ۱۹۵۹)
59) ضیاءالحسن مبصر: طوفان و ساحل از قیصر امراؤتوی (۸/اپریل، ۱۹۵۹)
60) ضیاءالحسن مبصر: جہلم کے سینے پر از تیج بہادر (۸/اپریل، ۱۹۵۹)
61) ضیاءالحسن مبصر: نورنگ مرتب بلقیس اختر اور سیدہ وسیم انجم (۸/اپریل، ۱۹۵۹)

62) ضیاءالحسن مبصر: ابوالکلام آزاد (یہ کتابی شکل میں شائع ہوا ہے) (۸/اپریل، ۱۹۵۹)
63) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: شرح دیوان غالب از یوسف سلیم چشتی (۱۵/اپریل، ۱۹۵۹)
64) ضیاء احمد بدایونی مبصر: بستان المحدثین (اردو) ترجمہ از مولانا عبد السمیع صاحب (۱۵/اپریل، ۱۹۵۹)
65) ضیاءالحسن مبصر: سوغات (سہ ماہی) مدیر محمود ایاز (۲۲/اپریل، ۱۹۵۹)
66) ضیاءالحسن مبصر: صبا (ابوالکلام نمبر) (۲۲/اپریل، ۱۹۵۹)
67) ضیاءالحسن مبصر: آج کل (ڈرامہ) (۲۲/اپریل، ۱۹۵۹)
68) ضیاءالحسن مبصر: کائنات تبسم از شوکت تھانوی (۱۵/مئی، ۱۹۵۹)
69) ضیاءالحسن مبصر: مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول میگزین (نگراں اشتیاق احمد خاں) (۱۵/مئی، ۱۹۵۹)
70) ضیاءالحسن مبصر: صنم (بہار نمبر) (۱۵/مئی، ۱۹۵۹)
71) ضیاءالحسن مبصر: صنف انشائیہ اور چند انشائیے مرتب ڈاکٹر محمد حسنین (۲۲/مئی، ۱۹۵۹)
72) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: محبوب کبریا کی آمد از سید اشفاق حسین رضوی (۲۲/مئی، ۱۹۵۹)
73) نذیر احمد، ڈاکٹر مبصر: نوطرز مرصع از میر محمد حسین عطا خاں تحسین (۸/جون، ۱۹۵۹)
74) ضیاءالحسن مبصر: دینداری کیا ہے اور بے دینی کیا؟ از ظہیر ڈی چودھری (یکم جولائی، ۱۹۵۹)
75) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: پھول کلیاں از سعادت نظیر (۲۲/جولائی، ۱۹۵۹)
76) خلیل الرحمٰن اعظمی مبصر: شاخ زیتون از شفا گوالیاری (۲۲/جولائی، ۱۹۵۹)
77) وارث کرمانی مبصر: دی لائف آف محمدؐ از مرزا بشیر الدین محمود احمد (۸/اگست، ۱۹۵۹)
78) وارث کرمانی مبصر: انقلاب اسلام از عمران انصاری (۸/اگست، ۱۹۵۹)
79) وارث کرمانی مبصر: اسلام کا نظام حکومت از مولانا حامد الانصاری غازیؔ (۸/اگست، ۱۹۵۹)
80) وارث کرمانی مبصر: شفیق زار از پرکاش ناتھ پرویز (۸/اگست، ۱۹۵۹)
81) ضیاءاحمد بدایونی مبصر: تبصرہ سلک گہر از صالحہ عابد حسین (یکم ستمبر، ۱۹۵۹)
82) وارث کرمانی مبصر: سالنامہ اودھ پنچ لکھنو شمار (۲۲/ستمبر، ۱۹۵۹)
83) شہاب سرمدی مبصر: آج کل دہلی کا رقص نمبر (یکم اکتوبر، ۱۹۵۹)
84) عابد رضا بیدار مبصر: علی گڑھ میگزین مرتبہ سید حسن ثنی انور ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۹ (۸/اکتوبر، ۱۹۵۹)

85) اسلوب احمد انصاری مبصر: سرودرفتہ از عبدالعزیز خالد (۱۵/اکتوبر،۱۹۵۹)
86) وارث کرمانی مبصر: تلوک چند محروم از جگن ناتھ آزاد (۸/نومبر،۱۹۵۹)
87) تلوک چند محروم پر تبصرہ بذیل مراسلات (۸/دسمبر،۱۹۵۹)
88) اسلوب احمد انصاری مبصر: کیمیا گر از پروفیسر محمد مجیب (۲۲دسمبر،۱۹۵۹)
89) اسلوب احمد انصاری مبصر: خواجہ احمد عباس کی کتاب دیا جلے ساری رات (۲۲دسمبر،۱۹۵۹)
90) وارث کرمانی مبصر: سہ ماہی سوغات میسور (یکم جنوری،۱۹۶۰ء)
91) وارث کرمانی مبصر: پگڈنڈی امرتسر سالنامہ ۱۹۵۹ تبصرہ ۱۹۶۰ء میں (۸/مارچ،۱۹۶۰ء)
92) محمد عمر الدین مبصر: سرگذشت غزالی از محمد حنیف (۱۵/مارچ،۱۹۶۰)
93) شہاب جعفری مبصر: خدوخال از اختر رضوانی (یکم اپریل،۱۹۶۰)
94) سعید احمد اکبرآبادی مبصر: مسئلہ تعدد ازواج از محمد جعفر ندوی (یکم اپریل،۱۹۶۰)
95) عتیق صدیقی مبصر: تبرکات آزاد مرتبہ غلام رسول مہر (۱۵/اپریل،۱۹۶۰)
96) صبح امید بمبئی کا سلور جبلی نمبر۔ تبصرہ از شہاب جعفری (۲۲/اپریل،۱۹۶۰)
97) سالنامہ ۱۹۶۰ بیداغ دہلی۔ تبصرہ از شہاب جعفری (یکم جون،۱۹۶۰)
98) دیہاتی معالج از ہمدرد۔ تبصرہ از حکیم عبداللطیف (۱۵/جون،۱۹۶۰)
99) دہن اور انقلاب از حسن شہیر از محمد حسن (۱۵/اگست،۱۹۶۰)
100) ضیاء احمد بدایونی مبصر: گفتنی از مخمور سعیدی (۸/اکتوبر،۱۹۶۰)
101) ضیاء احمد بدایونی مبصر: انوار ابوالکلام آزاد مرتبہ علی جواد زیدی (۱۵/اکتوبر،۱۹۶۰)
102) ضیاء احمد بدایونی مبصر: مجلّہ علوم اسلامیہ (۱۵/نومبر،۱۹۶۰)
103) شہاب جعفری مبصر: لالۂ صحرا از رئیس امروہوی (۲۲دسمبر،۱۹۶۰)

☆☆☆

اکابر کے تبصرے-حصہ دوم

عہد سُرور کے ''ہماری زبان'' میں

1961-1974

تبصرہ نگار

آل احمد سرور	شمیم حنفی	محمد یسین
اسلوب احمد انصاری	شہریار	محمود الٰہی
اصغر عباس	ضیاء احمد بدایونی	مختار الدین احمد آرزو
اطہر پرویز	عبدالحق	منظر عباس نقوی
اعجاز حسین	عبدالغفار شکیل	منیب الرحمٰن
انصار اللہ نظر، محمد	عبدالقادر سروری	ناصر حسین نقوی
انور معظم	عتیق احمد صدیقی	نور الحسن نقوی
اولاد احمد صدیقی	قاضی عبدالستار	وارث کرمانی
بشیر بدر، پروفیسر	کبیر احمد جائسی	وحید اختر
خلیل الرحمٰن اعظمی	گیان چند	وقار حسین، سید
رحیم علی الہاشمی	محمد رضا انصاری	
ریاض الرحمٰن خاں شروانی	محمد عتیق صدیقی	

قبلاً ۱۹۵۸ سے ۱۹۶۰ تک کے ہماری زبان کا احاطہ ہوا،
اب یہ جنوری ۱۹۶۱ سے مارچ۔اپریل ۱۹۷۴ تک کے ہماری زبان کا احاطہ ہے۔
ترتیب سال وار ہے

ذیل کی ترتیب اس طرح ہے : پہلے تو زیر تبصرہ کتاب کا عنوان ؛ پھر مصنف کا نام ؛ پھر مبصر کا نام ؛ پھر ہماری زبان کے شمارے کی تاریخ اور سال

1) آمنہ کا لال مصنفہ محمد جلال۔مبصر: ضیاء احمد بدایونی (یکم جنوری ۱۹۶۱ء)
2) پاک کہانیاں از مولوی مقبول احمد سیوہاروی (مبصر: ضیاء احمد بدایونی) ہماری زبان یکم جنوری ۱۹۶۱ء)
3) حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط مولفہ خورشید احمد فارق ۔مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی) ہماری زبان ۱۵ جنوری ۱۹۶۱ء)
4) رنگ محل مصنفہ حمیدہ سلطان۔مبصر: انور معظم) (۲۲ جنوری ۱۹۶۱ء)
5) مکاتیب سرسید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین۔مبصر: انور معظم) (یکم فروری ۱۹۶۱ء)
6) ۱۹۵۸ء کے بہترین افسانے مرتبہ ایم حبیب خان پر تبصرہ۔مبصر: قاضی عبد الستار) (۸ فروری ۱۹۶۱ء)
7) نبض حیات مصنفہ شفا گوالیاری۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۸ مارچ ۱۹۶۱ء)
8) زمزمستان مصنفہ حسن عظیم آبادی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۸ مارچ ۱۹۶۱ء)
9) گنگ وچمن مصنفہ نذیر بنارسی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵ مارچ ۱۹۶۱ء)
10) تعلیمات اسلام مرتبہ عبدالسلام قدوائی (مبصر: ضیاء احمد بدایونی (۱۸ اپریل ۱۹۶۱ء)
11) سبع سیارہ مصنفہ ناطق گلاوٹھوی۔مبصر: ضیاء احمد بدایونی (۱۸ اپریل ۱۹۶۱ء)
12) کاکل صبح مصنفہ عشرت کرتپوری۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵/اپریل ۱۹۶۱ء)
13) اردو کے چاند تارے مرتبہ امیر حسن نورانی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵/اپریل ۱۹۶۱ء)
14) متاع کلیم مصنفہ کلیم احمد آبادی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۲۲ مئی ۱۹۶۱ء)

15) میخانہ مصنفہ برج موہن طوفان۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۲۲مئی ۱۹۶۱ء)
16) سوز وساز مصنفہ فاروق بانس پاری۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم جون ۱۹۶۱ء)
17) آج کل کا ٹیگور نمبر مرتبہ: عرش ملسیانی۔مبصر: شہریار (۱۵/جون ۱۹۶۱ء)
18) شہرت کی خاطر مصنفہ نظیر صدیقی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم جولائی ۱۹۶۱ء)
19) رئیس الاحرار مصنفہ عزیز الرحمٰن جامعی۔مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (۸ جولائی ۱۹۶۱ء)
20) ماہنامہ ''تحریک'' کا ''غالب نمبر'' مرتبین: گوپال متل، محمود سعیدی، تمکین کاظمی۔مبصر: شہریار (۸ جولائی ۱۹۶۱ء)
21) جیتا جاگتا مصنفہ ابن طفیل، مترجم پروفیسر ظفر احمد صدیقی۔مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (۱۵/ جولائی ۱۹۶۱ء)
22) مقام غالب، مصنفہ .....، مبصر: وحید اختر (۸/اگست ۱۹۶۱ء)
23) دھرتی کا کال مصنفہ .....، مبصر: وحید اختر (۸/اگست ۱۹۶۱ء)
24) مجلس مولوی عبدالحق نمبر مرتبہ: محمد منظور احمد۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵/اگست ۱۹۶۱ء)
25) جشن آزادی مصنفہ مسعود اختر جمال۔مبصر: شہریار (۱۵/اکتوبر ۱۹۶۱ء)
26) تذکرے اور تبصرے مصنف جلیل قدوائی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۲۲/اکتوبر ۱۹۶۱ء)
27) اسلامی کتب خانوں کی سیر مصنف حاجی محمد زبیر (مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم نومبر ۱۹۶۱ء)
28) دیوان درد، مرتبہ ظہیر احمد صدیقی۔مبصر: وحید اختر (۸ نومبر ۱۹۶۱ء)
29) زنجیر رم آہو مصنفہ عبدالعزیز خالد۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵/نومبر ۱۹۶۱ء)
30) اردو میں قصیدہ نگاری مصنفہ ابو محمد سحر۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۲۲/نومبر ۱۹۶۱ء)
31) اردو شاعری کا انتخاب مرتبہ: محی الدین قادری زور۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم دسمبر ۱۹۶۱ء)
32) ڈال ڈال پات پات مصنفہ برہم ناتھ دت۔مبصر: آل احمد سرور (۸ دسمبر ۱۹۶۱ء)
33) ادبی مقالات مصنفہ مبشر علی صدیقی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۸ دسمبر ۱۹۶۱ء)
34) شاعر خاص نمبر ۶۱ء۔مبصر: شہریار (۸ دسمبر ۱۹۶۱ء)

35) خدااور آدم کے گیت مصنفہ اثر بھارتی۔مبصر:وحیداختر (۱۵رمئی۱۹۶۲ء)
36) دیروحرم مصنفہ مسلم انصاری۔مبصر:وحیداختر (۱۵رمئی۱۹۶۲ء)
37) اردوانسائیکلو پیڈیا،از.....،مبصر:وحیداختر (یکم جولائی۱۹۶۲ء)
38) تماشائے اہل ہنر مصنفہ سید رشید الحسن۔مبصر:خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵رنومبر۱۹۶۲ء)
39) یادگار امجد مرتبہ:اکبرالدین صدیقی۔مبصر:خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵رنومبر۱۹۶۲ء)
40) پختونستان کا مطالعہ مصنفہ:شانتی رنجمن بھٹاچاریہ۔مبصر:عتیق صدیقی (یکم دسمبر۱۹۶۲ء)
41) اسلامی دینا چوتھی صدی میں مصنفہ:غلام مرتضی۔مبصر:ضیاءاحمد بدایونی (۸دسمبر۱۹۶۲ء)
42) سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات مصنفہ خلیق احمد نظامی۔مبصر:ضیاءاحمد بدایونی (۱۵رجنوری ۱۹۶۳ء)
43) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ، مرتبۂ خلیق احمد نظامی، مبصر: ضیاء احمد بدایونی (یکم فروری ۱۹۶۳ء)
44) تاثرات وتعصّبات مصنفہ نظیرصدیقی۔مبصر:آل احمد سرور (۱۵رفروری۱۹۶۳ء)
45) رسالہ جامعہ۔ابوالکلام آزادنمبر۔مبصر:عتیق صدیقی (۱۵رمارچ۱۹۶۳ء)
46) دل ناداں مصنفہ کرشن موہن۔مبصر:وحیداختر (یکم مئی۱۹۶۳ء)
47) زخم تمنا مصنفہ مظہرامام۔مبصر:وحیداختر (۲۲رمئی۱۹۶۳ء)
48) سرچشمۂ قرآن مصنفہ ابوالفد احمد عبدالقادر۔مبصر:ضیاءاحمد بدایونی (م جولائی۱۹۶۳ء)
49) آئینۂ سخن فہمی مصنفہ سید مسعود حسن رضوی ادیب۔مبصر:ضیاءاحمد بدایونی (یکم ستمبر۱۹۶۳ء)
50) آفتاب ہجویر مصنفہ پیام شاہجہاپوری۔مبصر:ضیاءاحمد بدایونی (یکم ستمبر۱۹۶۳ء)
تین کتابیں،از.....مبصر:وحیداختر (۸ستمبر۱۹۶۳ء)
51) المختار من شعرابن الدینہ مصنفہ مختار الدین احمد آرزو۔ مبصر: ضیاء احمد بدایونی (یکم اکتوبر۱۹۶۳ء)
52) میں کیوں سوچوں مصنفہ جوگندر پال شرما۔مبصر:وحیداختر (۲۲راکتوبر۱۹۶۳ء)
53) امام الہند (تعمیرافکار) مصنفہ ابوسلمان الہندی۔مبصر:عتیق صدیقی (۸نومبر۱۹۶۳ء)

54) تین شعری مجموعے (تمہاری باتیں، رنگ و بو، طلوع مہر) مصنفہ ع۔م۔سوز۔مبصر: وحید اختر)(۱۵/نومبر۱۹۶۳ء)

55) پیغمبر انسانیت مصنفہ شاہ محمد جعفر۔مبصر: ضیاء احمد بدایونی (۸ مارچ ۱۹۶۴ء)

56) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، از محمد عتیق صدیقی، مبصر: عبد القادر سروری (۸/اپریل ۱۹۶۴ء)

57) دلّی کالج میگزین کا میرؔ نمبر مرتبہ: نثار احمد فاروقی۔مبصر: وحید اختر (یکم مئی ۱۹۶۴ء)

58) اردوئے معلیٰ ''میر سوز نمبر'' مرتبہ: خواجہ احمد فاروقی۔مبصر: مجنوں گورکھپوری (۲۲ مئی ۱۹۶۴ء)

59) شعلۂ رقصاں مصنفہ بلالی شاہ چشتی قادری۔مبصر: ضیاء احمد بدایونی (۱۵ جولائی ۱۹۶۴ء)

60) نارسیدہ مصنفہ وارث کرمانی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۲۲ ستمبر ۱۹۶۴ء)

61) علم الانسان یا قاعدہ شروانی مرتبہ: مقتدیٰ خاں شروانی۔مبصر: ضیاء احمد بدایونی (یکم نومبر ۱۹۶۴ء)

62) نقش جاوداں۔مجموعہ کلام پرنس نقی علی خاں ثاقب۔مبصر: شہریار (یکم اپریل ۱۹۶۵ء)

63) سفینہ چاہیے مرتبہ: سلطان اشرف۔مبصر: شہریار (۱۵/اپریل ۱۹۶۵ء)

64) فردوس گوش مصنفہ جوش ملسیانی۔مبصر: وحید اختر (ص ۱۲، ۲۲/مئی ۱۹۶۵ء)

65) خالی مکان مصنفہ محمد علوی۔مبصر: وحید اختر (یکم جون ۱۹۶۵ء)

66) صلاح الدین نمبر۔مبصر: شہریار (۸ جون ۱۹۶۵ء)

67) تاجور نمبر مرتبہ نظر زیدی۔مبصر: شہریار (۸ جون ۱۹۶۵ء)

68) آغاز سحر ''مجموعہ کلام'' مصنفہ نادم بلخی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (ص ۱۲/ ۱۵/ جون ۱۹۶۵ء)

69) اجنبی ''مجموعہ کلام'' مصنفہ وشوانا تھ درد۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵/جون ۱۹۶۵ء)

70) راہ کا کانٹا مصنفہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (ص ۱۲/ ۱۵/ جون ۱۹۶۵ء)

71) اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں) مصنفہ سید محمد عقیل۔مبصر: اعجاز حسین (۲۲/جون ۱۹۶۵ء)

72) افکار فیض نمبر مرتبہ: صہبا لکھنوی۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (ص ۱۲/ یکم جولائی ۱۹۶۵ء)

73) پاس گریباں 'مجموعہ کلام'' سلیمان اریب۔مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم جولائی ۱۹۶۵ء)

74) نقش آذر مصنفہ راشد آذر۔ مبصر: وحید اختر (۲۲/جولائی ۱۹۶۵ء)
75) سیل اشک مجموعہ کلام اشک امرتسری۔ مبصر: شہریار (ص۱۲/ یکم اگست ۱۹۶۵ء)
76) فرش نظر مجموعہ کلام رتن پنڈوردی۔ مبصر: شہریار (ص۱۲/ یکم اگست ۱۹۶۵ء)
77) جامعہ کی کہانی مؤلفہ عبدالغفار۔ مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (۸/اگست ۱۹۶۵ء)
78) لہر لہر ندیا گہری مصنفہ زبیر رضوی۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم ستمبر ۱۹۶۵ء)
79) اردو شاعری کا مزاج مصنفہ وزیر آغا۔ مبصر: شہریار (۸ ستمبر ۱۹۶۵ء)
80) گلبانگ مجموعہ کلام سحر عشق آبادی۔ مبصر: شہریار (ص۱۲/ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء)
81) موج گل از ریحانی لکھنوی۔ مبصر: شہریار (ص۱۲/ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء)
82) مجلّہ سفینہ ایڈیٹر سید حیدر عباس رضوی۔ مبصر: شہریار (ص۲/ ۱۵ ستمبر ۱۹۶۵ء)
83) دیوان درد مرتبہ ظہیر احمد صدیقی۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم اکتوبر ۱۹۶۵ء)
84) آج کل ''دستکاری نمبر''۔ مبصر: اولاد احمد صدیقی (۲۲/اکتوبر ۱۹۶۵ء)
85) کربل کتھا مصنفہ فضل علی فضلی۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵ نومبر ۱۹۶۵ء)
86) میرے گذشتہ روز و شب مصنفہ جگن ناتھ آزاد۔ مبصر: شہریار (ص۱/ یکم دسمبر ۱۹۶۵ء)
87) ضرب آتشیں مصنفہ قمر ساحری۔ مبصر: شہریار (ص۱/ یکم دسمبر ۱۹۶۵ء)
88) مرحوم دلّی کی ایک جھلک مرتبہ شمیم احمد۔ مبصر: شہریار (ص۱/ یکم دسمبر ۱۹۶۵ء)
89) مطالعہ امیر مصنفہ ابو محمد سحر۔ مبصر: محمود الٰہی (۱۵ دسمبر ۱۹۶۵ء)
90) رگ جاں مصنفہ خورشید الاسلام۔ مبصر: منیب الرحمٰن (۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء)
91) من سمجھاون مصنفہ شاہ تراب (مبصر: وحید اختر (۲۲ جنوری ۱۹۶۶ء)
92) ماہنامہ ''کتاب'' سالنامہ ۱۹۶۶ء)ء۔ مبصر: شہریار (۲۲ فروری ۱۹۶۶ء)
93) گل و سنگ مجموعہ کلام خضر برنی۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (ص۱۲/ ۱۵ مارچ ۱۹۶۶ء)
94) انوار نظر مصنفہ نظر لکھنوی (مبصر: شہریار (۲۲ مارچ ۱۹۶۶ء)
95) سند باد مصنفہ عمیق حنفی۔ مبصر: وحید اختر (۸/اپریل ۱۹۶۶ء)
96) دیوان قائم مرتبہ ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ مبصر: وحید اختر (۱۵/اپریل ۱۹۶۶ء)

97) بہادر شاہ ظفر (ڈراما) مصنفہ منجو قمر یداللّٰہی۔ مبصر: اطہر پرویز (۸ مئی ۱۹۶۶ء)

98) ماہنامہ شب خون ایڈیٹر سید اعجاز حسین۔ مبصر: شہریار (۸ جون ۱۹۶۶ء)

99) گل تازہ مجموعہ کلام صلاح الدین نیر۔ مبصر: شہریار (۲۲ جون ۱۹۶۶ء)

100) پہلا وہ گھر خدا کا مصنفہ غلام سرور۔ مبصر: شہریار (۲۲ جون ۱۹۶۶ء)

101) یادگار جگر مرتبہ محمد اسلام۔ مبصر: شہریار (۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء)

102) نگارشات جگر مرتبہ محمد اسلام۔ مبصر: شہریار (۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء)

103) جگر کے خطوط مرتبہ محمد اسلام۔ مبصر: شہریار (۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء)

104) بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو مصنفہ محمد اسلام۔ مبصر: شہریار (۲۲ جولائی ۱۹۶۶ء)

105) سوامی درشن مصنفہ سوامی مارہروی۔ مبصر: شہریار (یکم اگست ۱۹۶۶ء)

106) خلش مصنفہ سیفی پریمی۔ مبصر: شہریار (یکم اگست ۱۹۶۶ء)

107) حرف حرف مصنفہ فیض احمد فیض۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم ستمبر ۱۹۶۶ء)

108) چھیڑ غالب سے چلی جائے مرتبہ اکبر علی خاں۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم ستمبر ۱۹۶۶ء)

109) لہو ترنگ مرتبہ نو بہار صابر۔ مبصر: شہریار (۱۵ ستمبر ۱۹۶۶ء)

110) وادی خیال مصنفہ شہاب اشرف۔ مبصر: شہریار (۸ دسمبر ۱۹۶۶ء)

111) ذوق جمال مجموعہ کلام عنوان چشتی۔ مبصر: شہریار (۸ دسمبر ۱۹۶۶ء)

112) بیالیس نظمیں، از کلیم الدین احمد، مبصر: وحید اختر (۲۲ دسمبر ۱۹۶۶ء)

113) تراشیدہ مجموعہ کلام شاذ تمکنت۔ مبصر: شہریار (۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء)

114) صنوبر کا شہر مصنفہ سہیل احمد زیدی۔ مبصر: شہریار (۱۵ جنوری ۱۹۶۷ء)

115) کلکتہ: اک رباب مصنفہ حرمت الاکرام۔ مبصر: شہریار (۸ فروری ۱۹۶۷ء)

116) مخدوم نمبر ''ماہنامہ صبا'' مرتبہ سلیمان اریب۔ مبصر: شہریار (یکم اپریل ۱۹۶۷ء)

117) دوماہی شیرازہ ''ثقافت نمبر'' ایڈیٹر محمد یوسف ٹینگ۔ مبصر: شہریار (۲۲/اپریل ۱۹۶۷ء)

118) چند ادبی مسائل مصنفہ شاہ مقبول احمد۔ مبصر: مختار الدین آرزو (یکم مئی ۱۹۶۷ء)

119) آداب اردو از حکیم گلچیں کرنالی۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸ مئی ۱۹۶۷ء)

120) مثنوی حیات و کائنات مصنفہ عبد المجید شمس عظیم آبادی۔ مبصر: مختار الدین احمد (۱۵ مئی ۱۹۶۷ء)

121) دیوان فائز مرتبہ خواجہ افضل امام۔ مبصر: مختار الدین احمد (یکم جون ۱۹۶۷ء)

122) اردو کی بہترین غزلیں مرتبہ پرکاش پنڈت۔ مبصر: شہریار (ص ۱۲/ ۸ جون ۱۹۶۷ء)

123) جوگیا مصنفہ راجندر سنگھ بیدی۔ مبصر: شہریار (ص ۱۲/ ۸ جون ۱۹۶۷ء)

124) لندن کی ایک رات مصنفہ سجاد ظہیر۔ مبصر: شہریار (ص ۱۲/ ۸ جون ۱۹۶۷ء)

125) تین مسافر مصنفہ قطب النساء ہاشمی۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵ جون ۱۹۶۷ء)

126) نئی تخلیق مصنفہ صائب عاصمی۔ مبصر: شہریار (۲۲ جون ۱۹۶۷ء)

127) راحت و جراحت مصنفہ مرزا حسن بیگ۔ مبصر: شہریار (۲۲ جون ۱۹۶۷ء)

128) آتشیں مصنفہ عبد الجبار نسیم۔ مبصر: شہریار (۲۲ جون ۱۹۶۷ء)

129) نگار فکر مصنفہ کریم اسعدی۔ مبصر: شہریار (یکم جولائی ۱۹۶۷ء)

130) علامہ اقبال بھوپال میں مصنفہ عبد القوی دسنوی۔ مبصر: شہریار (۱۵ جولائی ۱۹۶۷ء)

131) تبسم غم مجموعہ کلام وسیم بریلوی۔ مبصر: شہریار (۱۵ جولائی ۱۹۶۷ء)

132) مغز مرغوب و چہار شہادت مرتبہ محمد ہاشم علی۔ مبصر: مختار الدین احمد (۲۲ جولائی ۱۹۶۷ء)

133) تلخیص سراپا سخن مؤلفہ سید محسن علی موسوی مرتبہ: سید سلیمان حسین۔ مبصر: محمد انصار اللہ نظر (۱۵/ اگست ۱۹۶۷ء)

134) گل نو مجموعہ کلام واحد پریمی۔ مبصر: شہریار (۸ ستمبر ۱۹۶۷ء)

135) داد کی بیداد مصنفہ عبد المجید سہالوی۔ مبصر: شہریار (۲۲ ستمبر ۱۹۶۷ء)

136) آغوش خیال ''مجموعہ کلام'' مصنفہ آزاد گلاٹی۔ مبصر: شہریار (۲۲ ستمبر ۱۹۶۷ء)

137) مجلّہ عثمانیہ مقالہ نمبر۔ مبصر: اصغر عباس (۸/ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

138) ذاکر نمبر، ماہنامہ ''پیام تعلیم'' کا۔ مبصر: اصغر عباس (۸/ اکتوبر ۱۹۶۷ء)

139) ببلیو گرافی اردو ڈراما مرتبہ: عبد العلیم نامی (مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸ جنوری ۱۹۶۸ء)

140) تصرفات اردو مصنفہ میر احمد علی خاں ادیب۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵ فروری ۱۹۶۸ء)

141) اختر انصاری کی دو کتابیں ''پر طاؤس (قطعات)، مطالعہ و تنقید''۔ مبصر: وحید اختر (۱۵/اپریل ۱۹۶۸ء)

142) شاہکا وحید مرتبہ شبیب علی حسین۔ مبصر: وحید اختر (یکم مئی ۱۹۶۸ء)

143) رگ ساز مصنفہ شاہین غازی پوری۔ مبصر: وحید اختر (یکم مئی ۱۹۶۸ء)

144) گل صحرا مصنفہ طالب جے پوری۔ مبصر: وحید اختر (یکم مئی ۱۹۶۸ء)

145) تسہیل الاملا مرتبہ لالہ تیج رام۔ مبصر: محمد انصار اللہ (یکم جولائی ۱۹۶۸ء)

146) جواہر لال نہرو۔ رادھا کرشنن کی نظر میں ''شائع کردہ پبلیکیشنز ڈویژن دہلی''۔ مبصر: اصغر عباس) (۱۵ جولائی ۱۹۶۸ء)

147) سہ ماہی ''صبح''۔ جواہر لال نہرو نمبر مرتبہ عبداللطیف اعظمی۔ مبصر: شہریار (۱۵ ستمبر ۱۹۶۸ء)

148) سنہرے سپنے (افسانوں کا مجموعہ) مصنفہ رنبیر سنگھ امر۔ مبصر: شہریار (یکم اکتوبر ۱۹۶۸ء)

149) وسیلہ شرف و ذریعہ دولت مصنفہ سید شاہ فرزند علی صوفی ۔ مبصر: محمد انصار اللہ نظر (۲۲ نومبر ۱۹۶۸ء)

150) فروغ اردو غالب نمبر۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵ فروری ۱۹۶۹ء)

151) تاریخ مصر و عرب قومیت مصنفہ: ڈاکٹر اے کالیشور راؤ۔ مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (۸ مئی ۱۹۶۹ء)

152) لالہ زار مصنفہ عبدالرشید پیکاں چاندپوری۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵ مئی ۱۹۶۹ء)

153) عروج آدم مصنفہ رفعت سروش۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵ جولائی ۱۹۶۹ء)

154) خوابوں کا مسیحا مصنفہ اعجاز صدیقی۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵ جولائی ۱۹۶۹ء)

155) سفر مدام سفر (مجموعہ کلام) مصنفہ بلراج کومل۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲ جولائی ۱۹۶۹ء)

156) افکار میر مرتبہ ایم حبیب خاں۔ مبصر: شمیم حنفی (یکم اگست ۱۹۶۹ء)

157) فاصلے (مجموعہ کلام) مصنفہ مدہوش بلگرامی۔ مبصر: شمیم حنفی (یکم اگست ۱۹۶۹ء)

158) تحریر و تنقید مصنفہ طبیب انصاری۔ مبصر: شمیم حنفی (۸/اگست ۱۹۶۹ء)

159) صبوحی ''مجموعہ کلام'' مصنفہ مہر چند کوثر۔ مبصر: شمیم حنفی (۸/اگست ۱۹۶۹ء)

160) ہمارے نہرو مصنفہ صفدر حسین۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵/اگست ۱۹۶۹ء)
161) پرچھائیوں کا دیس (منظوم) مصنفہ قیصر عثمانی۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵/اگست ۱۹۶۹ء)
162) نئے معاشرے کا تنہا آدمی۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵/اگست ۱۹۶۹ء)
163) غالب نمبر علی گڑھ میگزین مرتبہ بشیر بدر۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/اگست ۱۹۶۹ء)
164) ذکر و فکر مصنفہ برہم ناتھ دت قاصر۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم ستمبر ۱۹۶۹ء)
165) یک چمن گل ''مجموعہ کلام'' از اختر اورینوی۔ مبصر: شمیم حنفی (۸ ستمبر ۱۹۶۹ء)
166) رسالہ آج کل ''جدید ہندستانی شاعری نمبر'' ایڈیٹر شہباز حسین ۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء)
167) صحرا صحرا ''مجموعہ کلام'' مصنفہ صبا جائسی علیگ (مبصر: شمیم حنفی (۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء)
168) نغمۂ شب ''نظم'' مصنفہ اختر بستوی۔ مبصر: شمیم حنفی (یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء)
169) اردو شاعری میں تاج محل مرتبہ شجاع خاور۔ مبصر: شمیم حنفی (۸/اکتوبر ۱۹۶۹ء)
170) غبار رنگ مصنفہ اندر سروپ دت۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵/اکتوبر ۱۹۶۹ء)
171) غالب زندہ ہے ''انگریزی ملیالم'' مرتبہ آمنہ خاتون۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/اکتوبر ۱۹۶۹ء)
172) انتخاب قصائد اردو مرتبہ ابو محمد سحر۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵ نومبر ۱۹۶۹ء)
173) روزمرہ و محاورۂ غالب مرتبہ پریم پال اشک۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲ نومبر ۱۹۶۹ء)
174) قیمت عرض ہنر مرتبہ محمود خاور، حسن فرخ۔ مبصر: شمیم حنفی (۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)
175) اردو اخباری زبان کی الفاظ شماری (از عتیق احمد صدیقی (۸ جنوری ۱۹۷۰ء)
176) سیہ بر سفید ''شعری مجموعہ'' مصنفہ مخمور سعیدی۔ مبصر: بشیر بدر (۱۵ جنوری ۱۹۷۰ء)
177) آتش نغمہ مرتبہ رشی پٹیالوی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲ جنوری ۱۹۷۰ء)
178) کارواں خیالوں کے ''شعری مجموعہ'' مصنفہ نو بہار صابر۔ مبصر: بشیر بدر (۸ فروری ۱۹۷۰ء)
179) ادب اور تنقید مصنفہ اسلوب احمد انصاری (مبصر: شمیم حنفی (۱۵ فروری ۱۹۷۰ء)
180) فسانہ عجائب ''مصنفہ رجب علی بیگ سرور'' مرتبہ اطہر پرویز۔ مبصر: شمیم حنفی (یکم مارچ ۱۹۷۰ء)
181) بھاگ متی کے دیس میں مصنفہ فاطمہ یزدانی۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (۸ مارچ ۱۹۷۰ء)

182) برگ آوارہ ''مجموعہ کلام'' مصنفہ خورشید احمد جامی۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵ مارچ ۱۹۷۰ء)

183) تین مغل شاعر، مصنفہ رالف رسل اور خورشید الاسلام، مبصر: اسلوب احمد انصاری (۲۲ مارچ ۱۹۷۰ء)

184) مقدمات و مقالات مصنفہ عبدالاحد خاں خلیل۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (یکم اپریل ۱۹۷۰ء)

185) جوئے کہکشاں ''شعری مجموعہ'' مصنفہ امجد نجمی۔ مبصر: بشیر بدر (یکم اپریل ۱۹۷۰ء)

186) دکنی زبان کے قواعد مصنفہ حبیب ضیاء۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸/اپریل ۱۹۷۰ء)

187) اردو میں وہابی ادب مصنفہ خواجہ احمد فاروقی۔ مبصر: عبدالحق، ڈاکٹر (۲۲/اپریل ۱۹۷۰ء)

188) عیار غالبؔ مرتبہ مالک رام۔ مبصر: اسلوب احمد انصاری (یکم مئی ۱۹۷۰ء)

189) رسالہ ''صہبا'' عصری شاعری نمبر مدیر محمد حفظ الکبیر قریشی۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵ مئی ۱۹۷۰ء)

190) انتخاب۔ سراج اورنگ آبادی مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (۲۲ مئی ۱۹۷۰ء)

191) شعر و حکمت مرتب: شہریار، مغنی تبسم۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (یکم جون ۱۹۷۰ء)

192) عیار غالب مرتبہ مالک رام۔ مبصر: آل احمد سرور (۸ جون ۱۹۷۰ء)

193) نغمۂ شعور مصنفہ عبدالمتین نیاز۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵ جون ۱۹۷۰ء)

194) موازنہ انیس و دبیر مصنفہ شبلی نعمانی۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (۲۲ جون ۱۹۷۰ء)

195) سوغات ''مجموعہ کلام'' مصنفہ شوق سالکی لکھنوی۔ مبصر: شمیم حنفی (یکم جولائی ۱۹۷۰ء)

196) انتخاب مراثی (انیس و دبیر)، مقدمہ شعر و شاعری۔ مبصر: شمیم حنفی (۸ جولائی ۱۹۷۰ء)

197) قطار شیشہ مصنفہ خلش دردی بڑودوی۔ مبصر: خلیل الرحمٰن اعظمی (۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء)

198) پریم چند: کہانی کار ہ نما، از.....، مبصر: شمیم حنفی (۲۲ جولائی ۱۹۷۰ء)

199) دکھنی لغات مصنفہ ابوتراب خطائی ضامن۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (یکم اگست ۱۹۷۰ء)

200) دنیا کہیں جسے مصنفہ عشرت انور۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (۸/اگست ۱۹۷۰ء)

201) متاع نظر مصنفہ سید نظر برنی۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (۱۵/اگست ۱۹۷۰ء)

202) میگھ دوت مترجمہ رانا گنوری۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵/اگست ۱۹۷۰ء)

203) آریہ ابھونے مترجمہ منور لکھنوی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/اگست ۱۹۷۰ء)

204) نوائے مضطر مصنفہ رام رتن مضطر۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/اگست ۱۹۷۰ء)

205) مثنوی جلوۂ صدرنگ مصنفہ عبدالمجید شمس عظیم آبادی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/اگست ۱۹۷۰ء)

206) غالبیات نو، انتخاب کلام غالب، وقت خدا ہے مصنفہ عابد رضا بیدار۔ مبصر: شمیم حنفی) (۱۵ستمبر ۱۹۷۰ء)

207) بھوپال اور غالب مولفہ عبدالقوی دسنوی۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۸نومبر ۱۹۷۰ء)

208) معراج العاشقین کا مصنف مولفہ: حفیظ قتیل (مبصر: محمد انصار اللہ (۱۵نومبر ۱۹۷۰ء)

209) کوئی درد آشنا بھی نہیں مصنفہ صغرا مہدی (مبصر: ناصر حسین نقوی (۲۲نومبر ۱۹۷۰ء)

210) ہفت رنگ مرتبہ سیف بجنوری۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (۲۲دسمبر ۱۹۷۰ء)

211) بڑی حویلی مصنفہ مرزا محمود بیگ۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی) (یکم جنوری ۱۹۷۱ء)

212) ویرانیاں مصنفہ دور آفریدی۔ مبصر: شمیم حنفی) (یکم جنوری ۱۹۷۱ء)

213) دکنی کی ابتدا تحقیق کے تناظر میں مصنفہ آمنہ خاتون۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء)

214) سیما کی تلاش مصنفہ عابد رضا بیدار۔ مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (یکم مارچ ۱۹۷۱ء)

215) غالب نمبر ۷۰۔۱۹۶۹ء مرتبہ محمد شکیل احمد صدیقی (مبصر: محمد انصار اللہ (۸مارچ ۱۹۷۱ء)

216) زہر حیات ''مجموعہ کلام'' مصنفہ زاہدہ زیدی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/اپریل ۱۹۷۱ء)

217) دیوان شاغل مصنفہ شاغل عثمانی مرحوم۔ مبصر: ناصر حسین نقوی (یکم مئی ۱۹۷۱ء)

218) بمبئی میں اردو ۱۹۱۴ء تک از میمونہ دلوی۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۸مئی ۱۹۷۱ء)

219) صحرا میں اذان مصنفہ گوپال متل۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵مئی ۱۹۷۱ء)

220) لامکاں ''مجموعہ کلام'' مصنفہ غلام مرتضی راہی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲جون ۱۹۷۱ء)

221) کربل کتھا کا لسانی مطالعہ از خلیق انجم و گوپی چند نارنگ۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۸جولائی ۱۹۷۱ء)

222) مشاہیر کے اولین صحیفے مرتبہ عابد رضا بیدار۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸جولائی ۱۹۷۱ء)

223) قادر نامۂ غالب مرتبہ عبدالقوی دسنوی۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۱۵/اگست ۱۹۷۱ء)

224) فارسی عہد بعہد اور نگ زیب منصفہ نورالحسن انصاری۔ مبصر: وارث کرمانی (۱۵ستمبر ۱۹۷۱ء)

225) صبح۔ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ مبصر: محمد رضا انصاری (۸/اکتوبر ۱۹۷۱ء)

226) ترتیل القرآن مؤلفہ خدیجہ بنت سیدنا ملا طاہر سیف الدین۔ مبصر: محمد رضا انصاری (۸/اکتوبر ۱۹۷۱ء)

227) قدر سخن مصنفہ قدر عریضی، مبصر: ناصر حسین نقوی (۱۵/اکتوبر ۱۹۷۱ء)

228) اردو ادب میں سکھوں کا حصہ مرتبین امام مرتضی نقوی، مدثر حسین رضوی۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵/اکتوبر ۱۹۷۱ء)

229) لاہور کا جو ذکر کیا (کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی) مصنفہ گوپال متل۔ مبصر: آل احمد سرور (یکم نومبر ۱۹۷۱ء)

230) روپ رس مرتبہ جاوید وششٹ۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۱۵فروری ۱۹۷۲ء)

231) اسباب بغاوت ہند ترتیب ومقدمہ: فوق کریمی۔ مبصر: نورالحسن نقوی (یکم اپریل ۱۹۷۲ء)

232) آبلے ''مجموعہ کلام'' مصنفہ مدہوش بلگرامی۔ مبصر: شمیم حنفی (یکم اپریل ۱۹۷۲ء)

233) ارتکاز مرتبہ عبدالرحیم نشتر۔ مبصر: شمیم حنفی (۸مئی ۱۹۷۲ء)

234) گنج رواں، آرزو پبلیکیشنز مالے گاؤں۔ مبصر: شمیم حنفی (۸مئی ۱۹۷۲ء)

235) تلمیحات واشارات اقبال از اکبر حسین قریشی (مبصر: گیان چند (۸جون ۱۹۷۲ء)

236) فغان درد، درد دل، کرنین مصنفہ جگدیش مہتہ درد۔ مبصر: کبیر احمد جائسی (۸جولائی ۱۹۷۲ء)

237) آنکھوں کے شہتیر مصنفہ رفیع الدین احمد۔ مبصر: منظر عباس نقوی (۸جولائی ۱۹۷۲ء)

238) حرف معتبر ''شعری مجموعہ'' مصنفہ بانی۔ مبصر: بشیر بدر (۸/اگست ۱۹۷۲ء)

239) آثار ''شعری مجموعہ'' مصنفہ سعادت نظیر۔ مبصر: کبیر احمد جائسی (۸/اگست ۱۹۷۲ء)

240) سوز اقبال مصنفہ منور لکھنوی (از ناصر حسین نقوی (۸ستمبر ۱۹۷۲ء)

241) شت دھارا ''میگزین گورنمنٹ کالج ٹونک'' ایڈیٹر ابوالفیض عثمانی۔ مبصر: اصغر عباس (۸ستمبر ۱۹۷۲ء)

242) فروغ اردو لکھنؤ ''مولانا عبدالماجد دریابادی نمبر''۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۲۲ستمبر ۱۹۷۲ء)

243) میکدرہ درد ''شعری مجموعہ'' شاعر جگدیش مہتہ درد۔ مبصر: بشیر بدر (۲۲ستمبر ۱۹۷۲ء)

244) دیوان درد مرتبہ ظہیر احمد صدیقی (مبصر: وحید اختر (۱۵/مئی ۱۹۷۲ء)

245) جدید عربی ادب کا ارتقاء، عربی شاعری کے جدید رجحانات مصنفہ سید احتشام احمد ندوی۔ مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (۲۲جون ۱۹۷۲ء)

246) منثورات مرتبہ گوپی چند نارنگ۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲جولائی ۱۹۷۲ء)

247) وحید الدین سلیم۔ حیات اور ادبی خدمات مصنفہ منظر عباس نقوی علیگ۔ مبصر: رحم علی

الہاشمی (۲۲ جولائی ۱۹۷۲ء)

248) انتخاب ناسخ تصحیح وترتیب رشید حسن خاں۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۲۲/ اگست ۱۹۷۲ء)

249) شخصیتیں مصنفہ دور آفریدی۔ مبصر: اصغر عباس (۸/ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

250) اس کو غزل کہتے ہیں مصنفہ سعادت نظیر۔ مبصر: کبیر احمد جائسی (۸/ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

251) چیری کا باغ مترجمہ زاہدہ زیدی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

252) سرابوں کے سفیر مرتبین عقیل شاداب ، ظفر غوری ،کرشن گوپال دوبیج۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲/ اکتوبر ۱۹۷۲ء)

253) آب حیات مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸ نومبر ۱۹۷۲ء)

254) خون جگر ''مجموعہ کلام'' عاقل لاہوری۔ مبصر: شمیم حنفی (۸ نومبر ۱۹۷۲ء)

255) کلیات جرأت مرتبہ نورالحسن نقوی۔ مبصر: شمیم حنفی (۲۲ نومبر ۱۹۷۲ء)

256) اردو کے حروف تہجی مصنفہ محمد انصار اللہ۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸ دسمبر ۱۹۷۲ء)

257) اردو میں قصیدہ نگاری مصنفہ ابو محمد سحر۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۸ دسمبر ۱۹۷۲ء)

258) اردو کے ہندو شعراء مصنفہ جگدیش مہتہ درد۔ مبصر: کبیر احمد جائسی (۸ جنوری ۱۹۷۳ء)

259) پری خالہ اور لینن مترجم مہدی عابدی۔ مبصر: اصغر عباس (۲۲ فروری ۱۹۷۳ء)

260) چنار کے پھول مصنفہ جگدیش مہتہ درد۔ مبصر: اصغر عباس (۸ مارچ ۱۹۷۳ء)

261) نوائے راز مصنفہ مہجور شمسی۔ مبصر: کبیر احمد جائسی (۸ مارچ ۱۹۷۳ء)

262) نسیم بہار مصنفہ: اے۔سی۔ بہار۔ مبصر: کبیر احمد جائسی (۲۲ مارچ ۱۹۷۳ء)

263) بیگانہ مصنفہ البرٹ کامو۔ مبصر: محمد یسین (۸/ اپریل ۱۹۷۳ء)

264) مغربی بنگال کے اردو شعراء مؤلفہ مشتاق احمد۔ مبصر: عتیق احمد صدیقی (۲۲/ اپریل ۱۹۷۳ء)

265) دکنی غالب۔ ملا وجہی مرتبہ قیوم صادق (مبصر: عبدالغفار شکیل (۸ مئی ۱۹۷۳ء)

266) آتش سیال ''مجموعہ کلام'' مصنفہ ساجدہ زیدی۔ مبصر: شمیم حنفی (۸ مئی ۱۹۷۳ء)

267) خطۂ گلاب مرتبین نصیر پرواز، صدیق نظر (مبصر: کبیر احمد جائسی (۸ مئی ۱۹۷۳ء)

268) پیارے لفظ مصنفہ راہی پرتا بگڈھی (مبصر: کبیر احمد جائسی (۸ مئی ۱۹۷۳ء)

269) میرا وطن ہندستان مصنفہ بدیع الزماں خاور۔مبصر: کبیر احمد جائسی (۸مئی ۱۹۷۳ء)

270) تیرہویں صدی کی فارسی نثر مرتبہ ممتاز احمد۔مبصر: ضیاء احمد بدایونی (۸جون ۱۹۷۳ء)

271) مغربی ادب کے معمار مصنفہ اے محمد ابراہیم (مبصر: محمد یسین (۸جون ۱۹۷۳ء)

272) تذکرۂ شعراء از حسرت موہانی۔مبصر: انصار اللہ (۱۵جولائی ۱۹۷۳ء)

273) پدماوت کی مختصر فرہنگ مرتبہ محمد انصار اللہ۔مبصر: نور الحسن (۲۲راگست ۱۹۷۳ء)

274) سماج واد کی آواز مصنفہ دلکش بدایونی۔مبصر: اصغر عباس (۲۲ستمبر ۱۹۷۳ء)

275) ہندی اردو سمنویہ (ہندی) مصنفہ ایم عزیز الحسن۔مبصر: عتیق احمد صدیقی (یکم نومبر ۱۹۷۳ء)

276) لاریب مصنفہ غلام مرتضی راہی۔مبصر: اصغر عباس (۸نومبر ۱۹۷۳ء)

277) پیغام حیات مرتبہ ریحانی لکھنوی۔مبصر: محمد انصار اللہ (۲۲نومبر ۱۹۷۳ء)

278) انیس نما مرتبہ عبد القوی دسنوی۔مبصر: محمد انصار اللہ (۲۲نومبر ۱۹۷۳ء)

279) ہمارے ذاکر صاحب مصنفہ رشید احمد صدیقی۔مبصر: اطہر پرویز (یکم دسمبر ۱۹۷۳ء)

280) نقش ہائے رنگ رنگ مصنفہ ظہیر احمد صدیقی۔مبصر: وحید اختر (۸دسمبر ۱۹۷۳ء)

281) شعاعوں کی صلیب مصنفہ کرامت علی کرامت۔مبصر: وحید اختر (۸دسمبر ۱۹۷۳ء)

282) نگارشات حمایت مصنفہ کرنل مرزا حمایت علی بیگ۔مبصر: وحید اختر (۸دسمبر ۱۹۷۳ء)

283) حرفِ شوق مصنفہ محمد منظور احمد۔مبصر: وحید اختر (۸دسمبر ۱۹۷۳ء)

284) رایگاں مصنفہ بشر نواز۔مبصر: وحید اختر (۱۵دسمبر ۱۹۷۳ء)

285) آئینہ اور پرچھائیں، مصنفہ بمل کرشن اشکؔ۔مبصر: وحید اختر (۱۵دسمبر ۱۹۷۳ء)

286) وقت کی صدیاں مصنفہ داؤد غازی۔مبصر: وحید اختر (۲۲دسمبر ۱۹۷۳ء)

287) صحرا کا سفر مصنفہ راہی قریشی۔مبصر: وحید اختر (۲۲دسمبر ۱۹۷۳ء)

288) صحیفہ بشارت مصنفہ مبشر علی صدیقی۔مبصر: محمد انصار اللہ (۲۲دسمبر ۱۹۷۳ء)

289) تذکرہ معاصرین مصنفہ مالک رام۔مبصر: کبیر احمد جائسی (۸جنوری ۱۹۷۴ء)

290) ہم عصروں پر غالب کا اثر مصنفہ ظفر ادیب (مبصر: عتیق احمد صدیقی (۲۲جنوری ۱۹۷۴ء)

291) اردو اور تاریخ کیسے پڑھائیں مصنفہ مبشر علی صدیقی۔مبصر: محمد انصار اللہ (۸فروری ۱۹۷۴ء)

292) ایک سوغزلیں ''مجموعہ کلام'' مصنفہ عتیق اللہ۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵فروری ۱۹۷۴ء)

293) آئینہ در آئینہ مصنفہ عزیز قیسی۔ مبصر: شمیم حنفی (۸ مارچ ۱۹۷۴ء)

294) شہر سے دور مترجمہ اختر بستوی۔ مبصر: سید وقار حسین (۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء)

295) جلوۂ خضر۔ تلخیص وتنقید مرتبہ ظفر اوگانوی۔ مبصر: محمد انصار اللہ (۸/اپریل ۱۹۷۴ء)

296) تمنا کا دوسرا قدم مصنفہ صہبا وحید۔ مبصر: شمیم حنفی (۱۵/اپریل ۱۹۷۴ء)

297) ہندستانی مفسرین اوران کی عربی تفسیریں مصنفہ محمد سالم قدوائی۔ مبصر: ریاض الرحمٰن شروانی (۱۵/اپریل ۱۹۷۴ء)

298) سفینہ زرگل مصنفہ فضا ابن فیضی (از وحید اختر (۲۲/اپریل ۱۹۷۴ء)

299) بیداری وطن مصنفہ کرشن گوپال مغموم۔ مبصر: اصغر عباس (۲۲/اپریل ۱۹۷۴ء)

☆☆☆

تبصرہ نگاروں کے اسمائے گرامی اور اندراج نمبر

(ابجدی ترتیب میں)

تبصرہ نگاروں کے اسمائے گرامی ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۰ء:

آل احمد سرور 22,48,49

اسلوب احمد انصاری 85,88,89

تلوک چند محروم 87

حکیم عبداللطیف 98

خلیل الرحمٰن اعظمی 8-10,33,34,75,76

سعید احمد اکبر آبادی 94

سمپورنانند 18

شہاب جعفری 93,96,97,103

شہاب سرمدی 83

صفدر آہ 35

ضیاء احمد بدایونی 2, 4, 5, 6, 20, 24, 27, 28, 31, 32, 50, 56-58, 63, 64, 72, 81, 100-102

ضیاء الحسن 36-42, 52-55, 59-62, 65-71, 74

ظ۔ انصاری 19

عابد رضا بیدار 51,84

عتیق صدیقی 95

محمد حسن 11-13, 29, 30, 43-47, 99

عمر الدین، محمد 92

نذیر احمد 16,17, 73

نصیرالدین ہاشمی23
وارث کرمانی 1, 3, 7, 14, 15, 21, 25, 26, 77-80, 82, 86, 91, 91

تبصرہ نگاروں کے اسمائے گرامی ۱۹۶۱ء تا ۱۹۷۴ء:

آل احمد سرور 32, 44, 192, 229
اسلوب احمد انصاری,183,188
اصغر عباس ,137, 138, 146, 149, 241, 249, 259, 260, 274, 276, 299
اطہر پرویز 97,279
اعجاز حسین 71
انصار اللہ نظر، محمد ,133, 145, 207, 208, 213, 215, 218, 248
272,277,278,288,291,295
انور معظم 4,5
اولاد احمد صدیقی 84
بشیر بدر 176, 178, 185, 238, 243
خلیل الرحمٰن اعظمی,7, 9, 12-16,18, 24, 26, 27, 29-31, 33, 38, 39, 60
164, 154, 153,108, 107, 93, 85, 83, 78, 73, 72, 68-70,
197, 192, 191,
رحم علی الہاشمی,247
ریاض الرحمٰن خاں شروانی 3, 19, 21, 77, 151, 214, 245, 297
شمیم حنفی ,55-163, 165-169, 171-174, 177, 179, 180, 182, 195
196, 198, 201-206, 212, 216, 220, 232-234, 246, 251,
252, 254, 255, 266, 292, 293, 296
شہریار ,17, 20, 25, 34, 62, 63, 66, 67, 75, 76, 79-82, 86-88
92, 94, 98-106, 109-111, 113-117, 122-124, 126-131,
134-136, 147, 148

ضیاءاحمد بدایونی 1, 2, 10, 11, 41-43, 48-51, 61, 270
عبدالحق 187
عبدالغفار شکیل 265
عبدالقادر سروری 56,59
عتیق احمد صدیقی 119, 125, 139, 140, 150, 152, 170, 175, 186,
199, 211, 219, 222, 223, 228, 230, 242, 253, 256,
257, 264, 275, 290
قاضی عبدالستار 6
کبیر احمد جائسی 236, 239, 250, 258, 261, 262, 267-269, 289,
گیان چند 235
محمد رضا انصاری 225,226
محمد عتیق صدیقی 40,45,53
محمد یسین 263,271
محمود الٰہی 89
مختار الدین احمد آرزو 118,120,121,132
منظر عباس نقوی 237,
منیب الرحمٰن 90
ناصر حسین نقوی 181, 184, 190, 194, 200, 201, 209, 210, 217
, 227, 240
نور الحسن نقوی 231,273
وارث کرمانی 224
وحید اختر 22, 23, 35-37, 46, 47, 52, 54, 57, 58, 64, 65, 74, 91,
95, 96, 112, 141-144, 244, 280-287, 298,
وقار حسین، سید 294

☆☆☆

الدكتورة عائشه رئيس كمال

كتاب الهند مصدر مهم للاندولوجية

يعتبر نزوح العرب الى الهند بداية تاريخ المسلمين فى شبه القارة الهندية فقد كان الشعب الهندى يتمتع بصلة و روابط حميمة مع العرب منذ القدم و من دلائل ذلك أن العرب كانوا يسمون بناتهم بـ "هند" و كان شعراء العرب يستخدمون بعض الاشياء الهندية نحو السيف الهندى و الصندل و العود و الكافور خلال قرض الابيات الشعرية، من جهة أخرى ذكر الكتاب العرب و المؤرخون و علما علم الجغرافيا و السياح الكبار عن أهمية الهند و أحوالها السياسية و الاجتماعية و الدينية و التاريخية. و عرضوا آراء و امتيازات ملوكها ايضا و ابرزهم سليمان التاجر، و اليعقوبى، و المقدسى، وابن النديم، و عبدالقاهر البغدادى، و الأصطخرى، و القاضى ساعد الاندلسى، و عبدالكريم الشهرستانى، و العمرى ،و المسعودى، و أبو ريحان محمد بن أحمد البيرونى و غيرهم.

و نظرا الى قيمة الثقافة الهندية اتجه كثير من الرحالة العرب الى الهند و مكثوا بها و تعلموا لغتها و أطلعوا على مللها و عقائدها و عاداتها و تقاليدها و علومها، منهم البيرونى و ابن بطوطة و المسعودى.

حياته :[١]

معرفة أحوال حياة البيرونى محدودة جدا فيها ما كتب هو نفسه فى "مسامير خوارزم" و الذى وصل بعضه من قلم ابى الفضل البيهقى.

و تاريخه لسلطان محمود و أبيه قد ضاع، هناك رسالة كتبها الى صديقه سنه ٤٢٧ه يخبره فيها عن مؤلفاته و مؤلفات أبى بكر الرازى، هذه

الرسالة و شرحها بيد ابراهيم التبريزى(ت ٦٩٢ه) محفوظة فى مكتبة لايدن، و هذه الرسالة طبعت فى باريس باهتمام M. Karasue سنة ١٩٣٦م.

و كـذلك له قصيدة فى مدح أبى الفتح البستى، اشار الى بعض جوانب حيـاتـه فيهـا و لـكـن كلامه دقيق مختصر لا يفهمه العلما بسهولة، ابن خلكان لم يذكره فى كتابه، و ما كتب عنه بعد وفاته بمأتين سنة فيه من الغلو ما فيه.

و فـى الـعهـد الـحـديـث الـعـالم الالمانى من العلما الغربين هو ايدوارد زخاؤ(E.SACHAU) الـذى حقق كتابين من كتبه العظيمة و الذى يستحق أن يـدين له العالم الحديث لما أنجز من أعمال جليلة بصدد البيرونى خاصة، و هو الـذى حـقـق "كتـاب الهـند" للبيرونى فى سنة ١٨٨٧م، و نقله الى الانجليزية و نشـره من لندن فى سنة ١٨٨٨م، و ان اجلال المستشرق سخاؤ لمآثر البيرونى الـعـالـم و الانسـان اجـلال يستـحـقـه البيـرونى كاملا ، و قد كان محسوبا على الأجيال العلمية فى العالم، و له من التأثير و الفاعلية لما فيه من تحفظ متكتم، و فـوق كـل شـئ لـلقيمة الخالصة التى تحملها أعماله، وكل ذلك كان دعما لتكوين مـكـانة البيـرونـى، والبيـرونـى لا بـد ان يعرف و يدرس فى الهند التى كان هو نفسه أول مَن فسَّرها علميا و ثقافيا.

الاوسـاط المتعلقة فى أوربا و فى الهند كذلك بعد أن مضى على وفاته مـا يـنيف عـلـى تسـعة قـرون، فـقد احتفلت ذكراه فرنسا فى المؤتمر الحادى و الـعشرين الدولى للمستشرقين فى باريس فى يوليو سنة ١٩٤٨م، كما أن الهند تشهـد احتـفـالات لـذكـراه التـى عـقدت فى كلكته، و ذلك تحت اشراف الجمعية الايرانية فى ديسمبر سنة ١٩٤٨م.[٢]

اسـمه الكامل برهان الحق ابو ريحان محمد بن احمد البيرونى هو ولد فـى كـاث عـاصمة خوارزم فى ٣ ذى الحجة سنة ٣٦٢ه/ ستمبر ٩٧٣م فى بيت مـغـمـور، و عـمـرت على مكانها الآن مدينة خيوا فى تركستان، و ذكر البيرونى استـاذا واحـدا لـه اسـمه ابو نصر منصور بن على بن عراق الذى كان قريبا من

الأسرة الحاكمة السابقة لخوارزم.

البيرونى خدم الأسرة الخوازمية لخمس و عشرين سنة، ثم انتقل البيرونى بسبب الحروب الدائرة بين الأسرة الحاكمة، و ذهب الى جرجان، ثم انتقل الى طبرستان و اقترب من حاكمها مرزبان بن رستم بن شيرين و عنون كتابه الاول "مقاليد علم الهيئة ما يحدث فى بسيط الكرة" باسمه ، بعد وفاة السلطان و الفتن ترك وطنه الجديد ايضا و وصل فى حالة رثة الى مدينة رى، و بعد مدة تمكن السلطان قابوس بن وشمكير بعد ان قضى ١٧ سنة فى المنفى من اعادة حكم طبرستان فرجع البيرونى الى وطنه الجديد، و عنون كتابه الثانى "الآثار الباقية عن القرون الخالية" بهذا السلطان العالم، و لم يسكن البيرونى هناك مدة طويلة و رجع الى وطنه الام بعد ان قضى ٧ سنوات فى المنفى و اقترب من بلاط على بن مأمون و لما قتل هذا الامير على يد جنده و أخذ محمود الغزنوى حكومة هذه المنطقة فى سنة ٤٠٧هـ/ ١٠١٧م .

البيرونى و افراد الأسرة الحاكمة و اصدقاء ه الثلاثة من العلما: ابو نصر منصور بن على بن عراق، ابو الخير خمار و عبد الصمد الاول، وصلوا الى غزنة و كان عمره اذ ذاك ٤٥ سنة و يبدأ من هنا عهده الذهبى.

ثقافة البيرونى :

أبو ريحان محمد بن أحمد البيرونى، الذى ولد فى سنة ٩٧٣م فى منطقة خيوة التى كانت تسمى آنذاك بالخوارزم (والخوارزمية فى القديم) و الذى مات فى الغالب فى غزنة فى سنة ١٠٤٨م، شخصية فذة من أبرز الشخصيات العلمية فى العصور الوسطى، و هو ذلك النابغة العبقرى الذى كان متضلعا من علوم الرياضة ، والديانة، والفلك، و الفلسفة، والكيمياء، والتاريخ، و النجوم، والطب، و الصيدلة، و الطبيعة، علم الانسان (الانثرروبولوجية) والذى يتميز بانه اول رجل قام بدراسة الاندولوجية (الدراسات الهندية) و هو من أعلم العلما فى كل العصور، والبيرونى لابد أن يعد من أبرز كوادر و

قادة الفكر الانسانى فى التاريخ، وذلك لما احتل من مكانة سامية فى العلم و الثقافة فى ناحية، والموضوعية و اللبرالية الفكرية الواسعة فى ناحية أخرى.

مهارته للغات:

ثقافته الواسعة و علمه الجم الدقيق و تحقيقاته العظيمة، والجرأة النادرة ، الروح النقدية و طريقة بيانه تدل على انه من المعاصرين و ليس من القدماء ، و مع ذلك كان ماهر اللغات الكثيرة، لغته الأم كانت سغدى او الخوارزمى التى هى فرع الايرانية و كان ماهرا للغتين العربية و الفارسية و كان يعلم التركية و السنسكرتية و السريانية و العبرانية جيدا.[٣]

و كان يعتقد ان لغته الأم ليست صالحة لكتابة العلوم و الفنون، و تمهر فى العربية و الفارسية، و هو يكتب فى كتابه الصيدنة ان علوم الدنيا كلها انتقلت الى العربية و تعمقنا فيها، و جمال هذه اللغة و خصائصها دخلت فى قلوبنا و عقولنا، و ان كانت جميع الاقوام تعتقد عن لغاتها نفس الاعتقاد، كل واحد يتعلم لغته الأم، و يتكلم بها و يتباحث فيها، وهى تظهر جميلة حبيبة الى النفوس.

و أرى هذه الاشياء فى نفسى و لكنى اعتقد انه اذا احتفظنا فى لغتنا اى علم يظهر كأن الجمل سقط فى الأخدود أو ان الزرافة تختلط مع الخيول العربية الاصلية، لهذا توجهت الى العربية و الفارسية و انا اجنبى عنهما ، و اتعب فى استعمالهما.

مؤلفات البيرونى :

الاستاذ زخاو نشر رسالة البيرونى التى كتبها الى صديقه و ذكر فيها تفصيل كتب الطبيب محمد بن ذكر الرازى فى سنة (٤٢٧هـ/١٠٣٥-١٠٣٦) و ذكر فيها البيرونى تفصيلات كتبه و فهرسها ايضا التى الفها الى ٦٥ من عمره الهجرى، و عدد كتبه فيها ١١٣، والكتب التى نسبها اليه ابو النصر منصور بن على بن عراق و عددها ١٢، ثم الكتب التى الفها له ابو سهل عيسى بن يحيى

المسيحى عددها ايضا ١٢، والكتاب الذى نسبه اليه ابو على الحسن بن على الجبلى عدده واحد، وهذه الكتب كلها اصبحت ١٣٨، ولكن لم يشتمل هذا الفهرس شرح كتاب "القرعة المثمنة لاستنباط الضمائر المخمنة" باسم" شرح مزامير القرعة المثمنة" هكذا اصبح العدد الكلى ١٣٩.

و فى هذا الفهرس لم تذكر الكتب التالية

١. الكتب التى ذكرت له فى الآثار الباقية و عددها ٥

٢. الكتب التى ذكرت له فى كتاب الهند و عددها ٧

٣. الكتب التى ذكرها له حاجى خليفة فى كشف الظنون و عددها ٨

فى كشف الظنون ذكرت ١٥ كتابا له و لكن زخاؤ وضح ان بعض الكتب نفسه او ببعض التغييرات فى عنوانها شاملة فى الفهرس المذكور اعلاه و كذلك الكتب التى نسبت اليه خطاءً فيبقى عدد الكتب فى كشف الظنون الثمانية فقط.

٤. غلام حسين بجنورى ذكر فى كتابه جامع بهادر خانى كتاب "اللمعات" الذى ألف البيرونى على علم المناظر و الانعكاس.

٦. تاريخ خوارزم: الذى ذكره ابو الفضل فى تاريخ البيهقى.

٧. و الكتب التى لم تذكر فى اى كتاب قديم، ولكنها موجودة فى مكتبات العالم.

(١) كتاب الدرر فى سطح الاكبر

(٢) نزهة النفوس و الافكار فى خواص المواليد الثلاثة، المعادن و الثبات و الاحجار هذان الكتابان محفوظان فى مكتبة بودلين.

٨. الكتب التى لم تحفظ مسوداته عند البيرونى و هى ٥، و هكذا يصل عدد كتب البيرونى الى ١٧٥.

علاوة على ذلك الكتب التى ذكرها D. J.Boilot فى كتاب الهند (Lxuvre de I Bruni)، و كذلك كتاب غرة الزيجات (كرن تلك) التى لم تذكر فى اى كتاب الى الآن.

بعد التحقيق و البحث الدقيق من العلما و الباحثين الشرقيين و الغربيين يعلم ان الكتب المصنفة و المترجمة للبيرونى وصل عددها الى ١٨١[٤] ٩. أشار ياقوت أن كتب البيرونى كثيرة جدا و أن الفهرس الذى يتضمن أسماء ها يقع فى ستين ورقة و أنه مكتوب بخط دقيق و لكن ضاعت معظمها بمرور الزمان و بعضها نادرة منها تأليف و رسائل و مقالات.[٥]

كتاب الهند :

اسم الكتاب الكامل "تحقيق ما للهند من مقولة مقبولة فى العقل أو مرزولة" فيه معلومات عامة عن الهنادك معقولة أو غير معقولة. عندما وصل البيرونى الى غزنة بدأ يهتم بعلوم الهند و الهنادك و ساح لمغرب الهند سياحة علمية.

علوم الهند كلها فى اللغة السنسكرتية و تعلمها فى هذا الزمان صعب فكيف كان ذلك صعبا فى بداية القرن الخامس الهجرى، وانه انفق من عمره العزيز ١٥ سنة فى تعلمها.

و كتابه عن الهند يكفى للاستدلال بجهده فى التحقيق و البحث فلا يوجد مثله شخص فى المسلمين بله غيرهم، و لا نحتاج بعد هذا الكتاب دليلا آخر لمهارته و تبحره و جهده و جده.

فكتاب الهند منقسم على ثمانين بابا، الموضوعات الشتى و الايجاز البليغ الشديد يدل على انه ايجاز لا مثيل له.

فى الباب الاول من الكتاب بحث المشكلات التى تعاصر فى حصول علوم الهنود و اثبت ان اهل الهند و المسلمين مختلفون كلية فى كل شئ: اللغة و المذهب و التقاليد و المعاشرة و الحضارة، و يوضح مشكلات تعلم السنسكرتية و يقول انها دقيقة مثل العربية و فيها مرادفات كثيرة و الفاظ لها معانى كثيرة، لا يستطيع الانسان ان يفهمها أو يترجمها ما لم يعرف محل استعمالها، و لا يستطيع المسلمون تلفظها صحيحا، و الهنادك يجتنبون من الفاتحين و

يبتعدون، وكان علماهم يبخلون باعطاء المعلومات خصوصا للمسلمين، و لكنه حلل جميع الصعاب و اصبح يفهم اللغة ثم اصبح يدرسهم و يعلمهم كما ذكر ذلك بنفسه، و كانوا يتعجبون من ان الاجنبى يدعى بمهارة علومهم و كانوا يعتقدون انه ساحرا و كانوا يدعونه بحرا فى العلوم.

ذكر البيرونى فى البداية سبب تأليف الكتاب: مرة فى درس استاذه ابو سهل عبد المنعم بن نوح الطفلى ذكر لصديقه ان فلسفة الهند و مذاهبها، المسلمون لا يعلمون عنها علما كاملا، فيه نقائص و أخطاء و اغلاط دخلت عن طريق الترجمات الناقصة، فلما طالع استاذه ابو سهل عن آداب الهند اتفق مع رأى البيرونى، فصنف البيرونى هذا الكتاب العظيم بطلب استاذه.

بعد ان علمنا موضوعات كتاب الهند يجب علينا معرفة طريقة تحريره، هو ذكر فى كتابه المذكور كل ما رأى بنفسه أو سمع من علما الهند او قرأ، و يذكر كل شئ بدون تعصب و سعة قلب، و الانسان يقرأ الصفحات تلو الصفحات و لا يحس ان الكاتب لا يتمذهب نفس المذهب، و كذلك لا يفهم ان كاتب هذا الكتاب الف قبل تسعمائة سنة بل يظهر من تحريره اننا نطالع كتابا لعالم معاصر.

و هو عالم مسلم و لكنه يتفق فى بعض الآراء للحكماء الهنود، و يقبل بعض المسائل العلمية برحابة الصدر و انه يحب الصدق و يتنفر من الكذب و التعصب، ولم يؤلف البيرونى هذا الكتاب لترديد خيالات الهنادك و آرائهم أو تفنيدها أو يذكر مساوى مذهبهم لابعادهم عن دينهم.

و الذى كتبه بقلمه فيه اظهاره لآرائهم و هى قصة حضارة الهنادك و عقولهم بأهل الهند انفسهم، و صور حضارة الهند بمصور الهنادك، و هو يعيد هذا القول كثيرا انه ليس مسئولا عن الصدق و الكذب فى هذا الكتاب.

قد زار جمستا نيزا السفير اليونانى الملك العظيم شندر جبت فى سنة ٣٩٥ قبل المسيح و زار شمال الهند كلها و كان عنده الامكانيات و الماليات ثم

زار فـی الـقرن الخامس المسیحی السیاح الصینی فاهین ثم زار السیاح الصینی الآخـر هـون فـی الـقـرن السـادس الـمسیحی و لکن البیرونی زار الهند بعد مدة مـدیـدة و رأی جـزء ا بسیـطـا مـن الهـنـد و لکن برأی المحقق الالمانی کتابات السواح الیونانی و الصینیین عن الهند فی مقابل تحریرات البیرونی کأنها کتب الاطـفال أو انها مؤلفات اصحاب التوهمات و التعصبات اللذین عندما رأوا دنیا الهند تحیروا و لم یفهموا شیئا من الحوادث و الوقائع و قلب البیرونی بعید عن التـوهـم و یـحـقق بطرق حکیمة کل الوقائع و الحوادث، و یجتهد اجتهادا مثالیا لاشیاء بسیطة و لم یهتم فی حصول ذلك من المصائب و الآلام. (٦)

المصادر و المراجع

١. دائرة المعارف ج٦، ص ٢٦١
٢. البیـرونـی و معرفته باللغة السنکرتیة مقالة طبعت بثقافة الهند عدد، ص ٦٢-٦٣
٣. دائرة المعارف ج٦، ص ٢٦٤
٤. دائرة المعارف، ج٦، ص ٢٦٧ و ٢٦٨
٥. مـقـالة الاستاذ مصطفی شریف التی القاها فی ندوة بجامعة برکة الله ببهوبال
٦. البیرونی سید حسن برنی، ص ١٢٥-١٤٠

☆☆☆

بیان ملکیت سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل

مطابق فارم نمبرا، قاعدہ نمبر۳

۱۔جرنل کا ٹائٹل	:	خدابخش لائبریری جرنل
۲۔وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳۔۴۔پرنٹر و پبلشر کا نام	:	محمد جاوید اشرف
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۵۔ایڈیٹر کا نام	:	ڈاکٹر شائستہ بیدار
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	ڈائریکٹر، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۶۔ملکیت	:	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

میں محمد جاوید اشرف اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: محمد جاوید اشرف

ادارہ

تازہ کتب ورسائل: تعارف

محمود حسن الہ آبادی کی کتابیں:

محمود حسن الہ آبادی بھیونڈی/ تھانہ میں رہتے تھے، مگر الہ آباد کو کبھی نہیں بھولے بلکہ اپنے نام کا حصہ بنالیا، ان کی پہلی کتاب ''دعوت دین کا انبیائی طریق کار'' (۲۰۰۹ء) کے عنوان سے اندازہ ہوتا ہے، بلکہ ناشر کا نام، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، بھی یہی اشارہ کرتا ہے کہ یہ جماعت اسلامی سے وابستہ رہے، مگر تعجب ہے کہ ان کے ادبی مضامین میں یا تبصروں میں جماعت کی کوئی پرچھائیں نہیں پڑی۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کام تو مشکل ہے کہ: ''برکفے جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق''۔ مگر ہمارے مصنف نے اس چیلنج کو قبول کرلیا ہے اور اپنی تحریروں میں یہ کہہ کر صاف نکل گئے کہ: ہر ہوسنا کے نہ داند جام و سنداں باختن۔

نجات اللہ صدیقی اور راشد شاز سے ناراض معلوم ہوتے ہیں، مگر کتابوں میں اور کہیں کسی سے کسی ناراضی کا نشان نہیں ملتا۔ بیشتر ان کی تحریروں میں توازن ہے، جس کی ایک مثال ''مکاتیب حبیب، از حبیب الرحمٰن الصدیقی'' ہے، یہ ہر دو قسم کی مثالیں ہم ان تبصروں میں محمود حسن الہ آبادی کی تحریروں کے نمونوں کے طور پر ہم شامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، تاکہ ان کی چار چھ کتابوں کی 'بے قاعدہ رسید' قارئین تک بھی پہنچ سکے۔ قارئین تک پہنچانے کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ کسی یونیورسٹی سے وابستگی نہ ہونے کے باوجود یہ تازہ اردو میں ایک نمونہ سامنے آیا ہے کہ کسی باذوق لکھنے والے قلم کی ایسی گوناگوں تحریریں، اس وسیع کینویس کے ساتھ ایک قلم سے مل جائیں!

یہ تو ہوا عمومی تعارف۔ اب پہلے تو ہم ان کی کتابوں میں شامل ایسی ویرائٹی (varity) رکھنے والے چند مجموعے جو آپ کے سامنے اب تک آئے ہوں گے، اگر محمود صاحب کی کتابوں پر آپ نے ایک نظر ڈال لی تو حیران ضرور رہ جائیں گے کہ اردو میں آج بھی ایسے زبردست قارئین موجود ہیں۔

ان کی جو کتابیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں وہ اس طرح ہیں: تنقیدات محمود حصہ اول دوم، ادبیات محمود حصہ اول، مقالات محمود حصہ سوم۔

ادبیات محمود (اول)، ادارۂ ادبِ اسلامی ہند، مہاراشٹر، ممبئی، ۲۰۱۱ء۔
پتہ: بی۱۰۴، بدرمنزل، ونجار پٹی، ناکہ، بھیونڈی، تھانہ، مہاراشٹر۔۴۲۱۳۰۲

• پیش لفظ، ڈاکٹر پروفیسر عبدالحق • احوال۔

مقالات: • ادب۔غیر ادب • اردو ادب پر مغربی فکر کے اثرات • اسلام اور تمثیل نگاری • ابر سفید اور شاعر • چراغ حرا • طفیل مدنی اور ان کی شاعری۔

تقدیمات اور تبصرے: • تقدیمِ فکر و آگہی • شیشہ وسنگ • ادراک زوال امت • اسلام۔مستقبل کی بازیافت • مقصد زندگی کا اسلامی تصور • الکلام البلیغ فی احکام التبلیغ • مکاتیب حبیب • جہات نظر • عکس در عکس • سہ ماہی بزم ادب سری نگر (کشمیر) • میں چپ رہی • چاندنی تخیل کی • سفر مدام سفر۔ثنائے جلیل • شعرائے پونہ۔ایک تحقیق • رباب رشیدی۔ایک سخنور پیارا سا • ایک مطالعہ۔شفیق جونپوری • فکر اور فن • اردو تنقید کا سفر۔جامعہ ملیہ کے تناظر میں • اردو میں نفسیاتی تنقید • نظریاتی ادب • بمبئی کے اردو اخبارات • تہذیبی نقوش • دیوان حاتم: انتخاب دیوانِ قدیم • منظومات کے منفرد مترجم • اسطوری فکر وفلسفہ۔

شخصیات: • ڈاکٹر جلیل الدین شجاع الدین تماندار • ابوالاہرام ڈاکٹر پیر محمد رحمانی • بیاد قاری عبدالرشید خان جہانپوری • مولانا مختار احمد ندوی • بیاد اکبر رحمانی جلگانوی۔

تنقیدات محمود (اول) از ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی، اردو بک ریویو۔۲۰۱۵ء

• عرض حال • تقدیم • کثیر الجہات شخصیت • شاہ پیر محمد لائبریری • مذہب مختار ترجمہ و حواشی معانی الاخبار • گیارہویں صدی ہجری کی ایک اہم تصنیف • مرقات الوصول الی اللہ والرسول • روضۃ الاولیائے بیجاپور • تذکرۃ الوجیہ • تذکرہ اقدس • تاریخ اولیائے گجرات • مرأۃ سکندری (اردو ترجمہ) • تاریخ گجرات (فارسی) • آئینہ گجرات • گجرات میں عربی زبان اور ادب مصنف: ڈاکٹر باقر علی ترمذی مرحوم • گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت: جرنل۔۴ • تاریخ گجرات کا تحقیقی مطالعہ۔جرنل ۵ • سابرنامہ ترتیب وتہذیب: وفا جونپوری، رسول احمد شیخ • سابرنامہ ۲۰۰۶۔ ۲۰۰۷ء • مغل فرمان۔مرتب: پروفیسر محی الدین بمبئی والا • منتخبات رباعیات رضا • کلام اشرف اور چند گجری شعراء مدحیہ قصائد • ولی گجراتی مصنف: قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی • کارنامۂ ولی گجراتی ترتیب: پروفیسر محی الدین بمبئی والا • آزادی کے بعد گجرات میں اردو ادب کی پیش رفت • ابھی زندہ ہوں میں۔شاعر: عقیل شاطر انصاری • بکھری یادیں، از عظمت اللہ بیگ عظمت

• Triumphal Sun-Desai • تعارف کتاب۔ کتب سابقہ میں سید المرسلین سے متعلق بشارتیں • احوال ڈاکٹر عبدالستار صدیقی • عربی میں ڈرامہ نگاری • جدید عربی ادب • علم حدیث میں گجرات کا حصہ • تصوف کی حقیقت • تحقیقی تنقیدی اور تعارفی مقالات • قرآنی مقالات۔

تنقیدات محمود (دوم)، ۲۰۱۴ء

• تقدیم • صحافتی ذمہ داری اور ہمارے صحافی • کچھ باتیں: جناب عبدالغنی سرگروہ • صحت نامہ (از ڈاکٹر ریحان انصاری) • مقدمہ ''اجالے ماضی کے'' (از ڈاکٹر ابوطالب انصاری) • چراغِ منزول (از ڈاکٹر ابوطالب انصاری) • تقدیم ''تذکرہ شعرائے بھیونڈی'' (از جناب عبدالرحمٰن رونق افروز) • مقدمہ ''بین السطور'' (از عبدالرحمٰن رونق افروز) • تحفۂ دل۔ رونق افروز • سایۂ افکار (از قمر پرتاپ گڑھی) • راز پرتاپ گڑھی کی ''شاخ اَنا'' • ناؤ بھیگے کاغذ کی'' (مجموعہ کلام ایوب صابر) • معصوم انصاری • تقدیم ''سمتِ سفر'' (از محسن امیدی برہانپوری) • ''گلدستۂ سخن'' از اقبال محسن) • راشد الہ آبادی کا پہلا مجموعہ کلام ''مٹھی میں آفتاب'' تقدیم • تحریر (شاکر ادیبی) • اسباق۔ سہ ماہی • دیوان نذیر فتحپوری • پس نوشت۔ اشفاق انجم مالیگانوی • سبزنم (مجموعہ غزلیات اظہار سلیم) • شیشہ وسنگ (از خوشتر فنکار) • ''شہر بے فصیل'' (از امان افسر ایولوی) • ''ورق ورق صدف'' (از ہمایوں فانوس) • عتیق احمد عتیق صاحب مرحوم مکتوب بنام مدیر توازن، مالیگاؤں) • نور السعید اختر • طنز ومزاح کے تین ستون • رباعیات میں ہندوستانی عناصر • سلسلۂ روز وشب • گردش ایام • عصری لغت • ادبیات امروز ایران • شعاع نوا • سرمۂ اعتبار • مئو۔ شہر ہنروراں • بیسویں صدی کا اردو کا منظر نامہ • اگاتھا کرسٹی • نارنگ ساقی • مقالات نجیب اشرف ندوی • تصوف کی حقیقت • کیا برصغیر کی آبادی عذاب مسلسل کا شکار ہے • اکیسویں صدی کا چیلنج اور ملی ایجنڈا • جنوبی ہند کا سفر • مقدمہ عجائبات عالم • تقدیم یادایام • ادب العرب (اول) از ڈاکٹر زبید احمد

مقالاتِ محمود (سوم)، اردو بک ریویو۔ ۲۰۱۵ء

• قرآن اور طب • صہیونی سازش اور عالم اسلام • ابن خلدون اور جغرافیہ • بشارتیں • اقلیتی حقوق اور دستوری قوانین • مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ • نفقۂ مطلقہ اور سپریم کورٹ کا فیصلہ • ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل • مہاراشٹر کے اردو دہائی اسکولوں میں دینی تعلیم • مسلمانوں کے لئے ایک نئے نصابِ تعلیم کی ضرورت • علم العلاج میں ابن سینا کے کچھ جدید افادات • فردوس الحکمۃ میں فن آیورویدکے ابواب۔

احوال واقعی:

آبائی وطن قصبہ لال گوپال گنج (ضلع الہ آباد) کا ایک محلّہ خانجہانپور اور تاریخ پیدائش اسکول کے ریکارڈ کے مطابق ۱۷/ستمبر۱۹۳۲ء ہے۔ ایک دینی مدرسہ میں پندرہ دن تعلیم حاصل کی۔ یونانی میڈیکل کالج الہ آباد میں بی آئی ایم ایس کے پہلے دوسالہ کورس کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کے دو سال الہ آباد یونیورسٹی میں گزارے۔ پڑھنے کا شوق بچپن سے تھا۔ مڈل اور ہائی اسکول کی لائبریریوں میں اردو کی کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو نظر سے گزری ہو۔ ادیب کامل اور یوپی بورڈ (الٰہ آباد) کے اعلیٰ امتحان قابل (ہر دو حصہ) کے امتحانات ہائی اسکول (۱۹۴۹ء) کے دوران ہی پرائیویٹ پاس کئے اور ۱۹۵۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بدقسمت تھا کہ نہ دینی تعلیم مکمل ہوئی نہ طبی اور نہ ہی عصری تعلیم۔ ہنوز طفل مکتب ہوں۔ سات سال تک دو جگہ سرکاری ملازمتوں میں خوار ہوتا رہا۔ ایک سے میں نے استعفیٰ دیا، دوسرے نے مجھے مستعفی کیا۔ معاش کی فکر ہوئی تو ۱۹۶۱ء میں عالم (عربی) اور ۱۹۶۳ء میں فاضل طب کی تکمیل کی اور الحمدللہ رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر ہوں۔

۱۹۶۶ء سے بھیونڈی میں مقیم ہوں۔ کچھ دوستوں کی ہمت افزائی کی وجہ سے ۱۹۷۹ء میں ممبئی یونیورسٹی سے ایم۔اے (انگریزی) کی بھی سند لے لی ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہی چار زبانیں مجھے نہیں آتیں یعنی اردو، فارسی، عربی اور انگریزی۔ رہیں دوسری زبانیں تو وہ بالکل ہی نہیں جانتا۔

میرا پہلا طویل مضمون 'روس میں اسلام' جو ۱۹۵۴ء میں سوویٹ لٹریچر اور گوپال متل کی شائع کی ہوئی کتاب کی اسناد سے تیار ہوا تھا ''دعوت' (دہلی) میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اس موضوع پر اردو زبان میں اس مضمون کو اولیت حاصل ہے کیوں کہ آباد شاہ پوری کی ضخیم کتاب روس میں مسلم قومیتیں اس کے چودہ سال بعد پاکستان میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد صحافتی معیار کے مضامین کا ایک سلسلہ ''دعوت' (دہلی)، انقلاب (ممبئی) اور اردو ٹائمز (ممبئی) میں جاری رہا۔ افسوس کہ بار بار کی نقل مکانی سے یہ مضامین محفوظ نہ رکھے جا سکے۔ سب سے زیادہ افسوس اولین مقالہ کے ضائع ہونے کا ہے۔

اگر میرے تمام مطبوعہ مضامین کو جمع کیا جائے تو ان کی ضخامت دو ہزار صفحات سے زائد ٹھہرے گی۔

☆☆☆

Khuda Bakhsh Library

Journal

No. 183-186 **January – December 2016**

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Reg. No. 33424/77
Issue : 183-186
Quarterly Journal

Subscription
Individuals ₹ 400/-
Institutions ₹ 500/-
Foreign Individuals 30$
Foreign Institutions 60$

Editor
Dr. Shayesta Bedar
Director

ख़ुदा बख़्श लाइब्रेरी जरनल

अंक 183–186 जनवरी–दिसम्बर 2016

Opinions expressed by contributors are not necessarily those of the editor.

Printed by Md. Jawaid Ashraf at Pakiza Offset, Shahganj, Patna & published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna-800 004.

CONTENTS
Journal No. 183-186

English/Hindi Section

▪ Ghulam Husain Tabataba'i as Historian	*by* Dr. Manish Kumar	1-6
▪ Maulana Azad; Why he was Great?	*by* S.K.	1-51

Urdu Section

▪ Editorial	-	v
▪ Islam and Muslims in Medieval India	*by* Munazir Ahsan Gilani	1
▪ Khalilur Rahman Azami's : Forgotten poem	*by* S. K.	69
▪ Nawab Syed Ameer Ali Khan Bahadur	*by* Dr. Manzar Aijaz	93
▪ The Pioneer Library of Bihar: Al-Falah Asthawan	*by* Dr. Tal'ha Ni'mat Nadvi	107
▪ Basic Characteristics of Prose writing	*by* Dr. Mumtaz Ahmad Khan	121
▪ Sardar Jafri's Unpublished Letters to Dr. Mohd. Hasan	*Comp. by* Dr. Fardul Hasan	130
▪ Index of Reviews Published in *Hamari Zaban :* 1958-74	*by* S.K.	165
▪ Kitabul Hind : Important Source for Indology	*by* Dr. A'isha Raees Kamaal	194
▪ New Arrivals: Books/Periodicals	*by* Ed.	203

Our Contributors

- *Dr. Ayesha Rais Kamal, HOD, Deptt. Of Arabic, Barkatullah University, Bhopal-462026*
- *Dr. Fardul Hasan, Iram Publishing House, Daryapur, Sabzi Bagh, Patna*
- *Maulana Manazir Ahsan Gilani, Ex-Professor of Theology Osmania University Hyderabad*
- *Dr. Manish Kumar, D. A. V. Public School, Transport Nagar, Kankar Bagh, Patna*
- *Dr. Manzar Aijaz, Former Prof., Deptt. Of Urdu, Patliputra University, Patna*
- *Dr. Mumtaz Ahmad Khan, Former Asso. Prof., Bihar University, Muzaffarpur*
- *Dr. Talha Nemat Nadvi, Asthanwa, Bihar Sharif*

Ghulam Hussain Tabataba'i As Historian

— Dr. Manish Kumar

Ghulam Hussain Tabatabai was born in an aristocratic family in 1727-28 in Delhi. His father, Sayyid Hidayat Ali had a remarkable career as a civil and military officer. He served in the Mughal Court at Delhi and in most of the provincial courts from Lucknow to Murshidabad. Ghulam Hussain's family connection with Alivardi Khan and his own succession of official posts at district, provincial and imperial levels gave him an unusually good vantage point for observing and evaluating important political developments in north during his generation. The work *Siyar al-Muta'akhkhirin* was begun on 6th March, 1780 and completed on 30th August 1781.[1]

Although, his *Siyar al-Muta'akhkhirin* shows that he freely borrowed from other histories, it is apparent that the important section on contemporary Bengal is based on Ghulam Husain's own experience. His comments and remarks, especially on the people and events he knew at first hand, were remarkably perceptive.[2]

An important element of Ghulam Hussain's thought was his belief in predestination, in the intervention of God in history. Hussain Believed, in general, that the course of events is cyclical, that each man, dynasty or movement moves to a peak of success and then declines.[3]

Many times, Hussain referred to the revolution in Bengal as a Divine punishment upon Alivardi and his family, a punishment that also fell upon all the inhabitants of Bengal and Bihar.[4]

He had a belief in astrology. It is impossible to overlook

innumerable reference to astrology in his work.[5]

A more serious shortcoming was Hussain's occasional lapses into racial prejudices.

He appears to have borne the greatest antipathy for men of Afghan descent. Perhaps his feelings about Afghan arose from his own adherence to Shia interpretation of Islam.

Hussain recorded several examples of Sunni hatred for Shias and persecution of them.[6]

On the broader question of Hindu-Muslim relations, Ghulam Hussain was ambivalent. On the one hand he called the Hindus "Loyal submissive people" and strongly asserted the ruler's duty to be impartial.[7]

He recorded occasions when Muslim Governors and Nawab, celebrated Hindu festivals. He praised the chivalrous attitude of Rajputs.[8] But he also spoke of the "absurd tenets and ridiculous practices" of the Hindus.[9] His emotions were not always controlled by reason.

The Merit of Ghulam Hussain's work *Siyar al-Muta'akhkhirin* lies in the penetrating political analysis, contained within a rather traditional historical frame-work. Like most of his predecessors, Hussain saw historical events as a series of contests between his own community and outsiders. Under different circumstances, the group with which he identified himself varied greatly. Sometimes he linked himself with the Shias, sometimes with all Muslims; sometimes with all Hindustanis, by which he meant all inhabitants of North India.[10]

Another part of his traditional frame of analysis was his deeply, held belief that all the turmoil of man's history is ultimately in the hands of God.

In his opinion, Alivardi Khan was the ideal ruler.

For the Marathas, he reserved special scorn. In Bengal, the

Marathas, far from being hailed as champions of resurgent Hinduism, were cursed as vicious foreigners.[11]

Ghulam Hussain held this view. Maratha "scorched earth" tactics brought new levels of destructiveness to warfare in Bengal, which Hussain did not welcome.[12]

He strongly condemned Mir Habib, the Maratha's Afghan general, for ruining countries he could not conquer.[13]

Ghulam Hussain did not believe that peasants were without a place in warfare. More than that, he even admitted the peasantry to a limited role in warfare.[14]

His sympathies were all with Mir Qasim, although he did not himself trust that Nawab.[15]

In his view, Mir Qasim had proved to be a man who governed for the satisfaction of his subjects. Mir Qasim was defending his own country against foreign intruders, whereas the Marathas had themselves been foreign adventurers in Bengal.[16]

So, in the special case of Mir Qasim, he advocated the use of Maratha type tactics.

It is anomalous that Ghulam Husssain himself served the company, as did many prominent men of his time, and yet almost invariably he used the term "English" refer to the company. He himself was a Hindustani, who identified himself as a part of the Mughal Imperium, although of course as a man of Iranian stock he could not think of himself as a "Mughal".

Despite the company's role in restoring stability for Bengal, he naturally regretted the passing of the old government.[17]

To Ghulam Hussain, the Bengal Nawabs, however corrupt and inefficient, were the legitimate government.[18]

In his views, "the English were a greedy covetous people who came to India to make quick fortunes and then to return home."[19]

Thus, they were inclined to neglect their newly acquired

responsibilities as the governors of Bengal. Greed made them susceptible to flatterers and self-seeking adventurers, who were able to divert them from the pursuit of justice and sound administration.[20]

He admired the British system of government, especially parliament and, through that the representative body was a key to efficient administration, combined with a high level of civil order.[21]

Ghulam Hussain saw the beginning of Mughal decay in Aurangzeb's intolerance towards large number of his subjects and in his attempts to cloak unscrupulous actions by what Hussain characterized as hypocritical religiosity.[22] The emperors who followed, varied only in the degree of their incompetence. Farrukh Siyar began the foolish sale of offices and titles which soon left the empire ungoverned and the court in chaos.[23]

Hussain plainly believed that the Mughal emperors had forfeited any claims to legitimacy by their failures to protect their subjects from either internal abuse or external attack.[24]

Yet the Mughals had been the creators and the only possible sustainers of the way of life the historian had known and valued.

His history gives the impression that he understood that the old system was coming to an end.[25]

He complained that the company was making a mistake in not employing the old Hindustani heavy cavalry, men like his uncles and brother, which might after all be of some use against the Marathas and Sikhs.[26]

Ghulam Hussain represented some of the best thinking of the old order that was passing away in the mid 18th century.

In his history of his times, Ghulam Hussain gives us a spirited defence of his society. He presents the ideal of a good society: the peasant prosperous and secure, the gentry controlled by a disciplined bureaucracy recruited from among themselves on a basis of family connections or ability, the administration in turn under viceroys and

other officials appointed by the crown, the emperor at the top by virtue of his descent from the house of Timur; Government officials at all levels were to be accessible to all of their subjects, and ever ready to correct their grievances.

But against this idyllic picture of Hindustan as it ought to be, or may be even might have been, Ghulam Hussain can only give us a tragic picture of things as he actually saw them not only had the whole system broken down, but it was tottering on the verge of destruction — a destruction which he believed to have been largely self-induced.

The deterioration in the personal morality of the rulers and grandees of the empire was one cause of this ruin. Another, in his opinion, was the acceleration of divisions and mutual jealousies among elements of a hitherto precariously unified Indian body politic. He believed that Hindus and Muslims had been gradually reconciled until Aurangzeb had begun to emphasis communal differences, first by attacks on the Shias and then by discrimination against Hindus.[27]

Aurangzeb's motive has been to obscure the unsavoury methods by which he reached the throne; but in the end he had set in motion the very forces which ultimately overwhelmed this dynasty.

A pious but tolerant Muslim, a gentlemen and a scholar, Ghulam Hussain was almost an ideal type of Mughal Official. He demonstrated by his self-awareness, the political sophistication of the society he represented.

End notes:

1. *Historical Contents of three Scrap Books*, S. H. Askari, IHRC, 1946.
2. *Historians of India, Pakistan and Ceylon*, C. H. Philips, London, 1961, pp.150-51.

3. *Ibid*., p.152.
4. *The Siyar al-Mutakhkharin*, Ghulam Hussain Khan, tr. Nota Manus, Calcutta, vol.1-4, 1902, vol. II, p.525.
5. *Siyar*, II, p.231.
6. *Siyar*, II, p.432.
7. *Siyar*, IV, p.143.
8. *Siyar*, IV, p.140.
9. *Siyar*, III, p.180.
10. *Siyar*, III, p.38.
11. *Marathas in Bengal, the History of Bengal*, Jadunath Sarkar, Dacca, 1948, p.450.
12. *Studies in the History of the Bengal Subah*, K. K. Dutta, Calcutta, 1936, p.18.
13. *Siyar*, II, pp.86.
14. *Siyar*, II, pp.527.
15. *Siyar*, II, p.155.
16. *Siyar*, II, p.125.
17. *Siyar*, II, p.189.
18. *Siyar*, II, p.190.
19. *Siyar*, II, p.341.
20. *Siyar*, II, p.229.
21. *Siyar*, III, p.154.
22. *Siyar*, I, p.342.
23. *Siyar*, III, p.281.
24. *Siyar*, III, pp.203-04.
25. *Siyar*, III, p.190.
26. *Siyar*, III, p.526.
27. *Siyar*, III, pp.188-89.

***

मौलाना आज़ाद क्यों बड़े थे

मौलाना आज़ाद के लेखों से कुछ अंश

खुदा बख़्श ओरियन्टल पब्लिक लाइब्रेरी
पटना

11 नवम्बर 2019 राष्ट्रीय शिक्षा दिवस पर
मौलाना आजाद को खुदा बख़्श लाइब्रेरी का नज़राना

दो शब्द

मौलाना आजाद का जन्म मक्का (सऊदी अरब) में सन् 1888 ई० (जिलहिज्जा 1305 हिजरी) में हुआ था जहाँ उनके पिता हिन्दुस्तान से जाकर बस गये थे और वहीं विवाह कर लिया था। मौलाना आजाद के जन्म के कुछ ही वर्ष पश्चात् उनके पिता भारत वापस आ गये और कलकत्ता में बस गये। आजाद की बचपन से विद्या और साहित्य में अभिरुचि थी। यही अन्वेषक प्रवृत्ति उनको इराक, मिस्र और दूसरे देशों के सफर पर ले गई। स्वाधीनता-संग्राम में वह लड़कपन से ही रुचि लेने लगे थे जिसके परिणाम स्वरूप 1916 ई० में उन्हें राँची में लम्बी अवधि तक नजरबंदी मिली, जिससे वह 1920 ई में मुक्त हुए। 1923 ई० में वह पहली बार कांग्रेस के अध्यक्ष निर्वाचित हुए और 1940 ई० में एक बार फिर राष्ट्र ने यह प्रतिष्ठा प्रदान की। इस बार वह छह वर्षों तक निरन्तर अध्यक्ष के पद को सुशोभित करते रहे। कांग्रेस के इतिहास में इतनी लम्बी अवधि तक कोई दूसरे नेता अध्यक्ष नहीं रहे थे। इसी लम्बी अवधि में स्वतंत्रता संबंधी समझौते की सभी कार्रवाइयाँ उन्हीं के नेतृत्व में सम्पन्न हुई।

उन्होंने अनेक समाचार-पत्र और पत्रिकाओं का प्रकाशन और सम्पादन किया जिनमें 1903-1904 ई० का "लेसानुस सिद्क" और 1912-1916 ई० के "अल-हिलाल" तथा "अल-बलाग" सुप्रसिद्ध हैं। कुरान की उनकी सुविख्यात टीका "तर्जुमानुल कुरान" और उनके पत्रों का संग्रह 'गुबारे खातिर" इस्लामी विद्या और साहित्य के प्राण हैं। जीवन के अंतिम दिनों में मौलाना आजाद ने "इण्डिया विन्स फ्रीडम" (India's Wins Freedom) नामक स्वतंत्रता-प्राप्ति संबंधी महत्त्वपूर्ण दस्तावेजी पुस्तक यादगार स्वरूप लिख छोड़ी।

मौलाना आजाद का देहान्त 22 फरवरी, 1958 ई० को दिल्ली में हुआ।

उनके क़लम से जो यादगार चीजें निकली हैं उनके थोड़े थोड़े अंश आपके सामने रख दें।

अपनी अन्तिम बात कहते कहते ख्याल आया ये तो कुछ न हुआ, हम अपनी ही कहते रहे, जिसका सारा जहूरा है उसकी बात तो उसके किसी खास कहन पर खत्म होनी चाहिए। 1940 ई0 के आल इन्डिया कांग्रेस के रामगढ़ सेशन को एड्रेस करते हुए सभापति मौलाना आजाद ने कहा था, उस समय कांग्रेस का अध्यक्ष राष्ट्रपति का दर्जा रखता था कि उस समय कांग्रेस ही कांग्रेस थी और क़ौम बटी हुई न थी तब राष्ट्रपति आज़ाद ने कहा था :

"हिन्दुस्तान के लिए प्रकृति का यह निर्णय हो चुका था कि उसकी भूमि मनुष्य की विभिन्न नस्लों, विभिन्न संस्कृतियों और विभिन्न धर्मों के काफिलों की मंजिल बने। अभी इतिहास का प्रभात पूर्णरूपेण प्रकट भी नहीं हुआ था कि उन काफिलों का आगमन आरम्भ हो गया और फिर एक के बाद दूसरे के आने का क्रम जारी रहा। इसकी विशाल भूमि सबका स्वागत करती रही और इसकी उदार गोद ने सबके लिए जगह निकाली। उन्हीं काफिलों में एक अन्तिम काफिला हम इस्लाम धर्मावलम्बियों का भी था। यह भी पिछले काफिलों के पद-चिन्हों पर चलता हुआ यहाँ पहुँचा और सदा के लिए बस गया। यह संसार के दो भिन्न धर्मों और संस्कृतियों की धाराओं का संगम बना। यह पहले गंगा और यमुना की धाराओं की तरह एक दूसरे से अलग बहते रहे, फिर जैसा कि प्रकृति का अटल नियम है, दोनों को एक संगम में मिल जाना पड़ा। इन दोनों का मेल इतिहास की एक महत्वपूर्ण घटना थी। जिस दिन यह घटना घटी उसी दिन से प्रकृति के परोक्ष हाथों ने पुराने हिन्दुस्तान की जगह एक नये हिन्दुस्तान के ढालने का काम शुरू कर दिया। हम अपने साथ अपना भंडार लाये थे और यह भूमि भी अपने भंडारों से भरपूर थी। हमने अपनी सम्पत्ति इसके हवाले कर दी और इसके खजानों के दरवाजे हमारे लिए खोल दिये गये। हमने इसे इस्लाम के भंडार की वह सबसे कीमती चीज दे दी जिसकी इसे सबसे

अधिक आवश्यकता थी। हमने इसे जनतंत्र और मानवीय समता का संदेश पहुँचाया।

इतिहास की पूरी ग्यारह शताब्दियाँ इस घटना पर बीत चुकी हैं। अब इस्लाम भी इस भूमि पर वैसा ही दावा रखता है जैसा दावा हिन्दू धर्म का है। यदि हिन्दू धर्म कई हजार वर्षों से इसके निवासियों का धर्म रहा है तो इस्लाम भी एक हजार वर्ष से यहाँ के लोगों का धर्म रहा है। जिस प्रकार आज एक हिन्दू गर्व के साथ कह सकता है कि वह हिन्दुस्तानी है और हिन्दू धर्मावलम्बी है, ठीक इसी तरह हम भी गर्व से कह सकते हैं कि हम हिन्दुस्तानी हैं और इस्लाम धर्मावलम्बी हैं। मैं इस वृत्त को इससे ज्यादा फैलाऊँगा, मैं हिन्दुस्तानी ईसाई का भी यह हक स्वीकार करूँगा कि वह आज सिर उठाकर कह सकता है कि मैं हिन्दुस्तानी हूँ और हिन्दुस्तान के निवासियों के एक धर्म यानी ईसाई धर्म का अनुयायी हूँ।

ग्यारह शताब्दियों के सम्मिलित इतिहास ने हमारे हिन्दुस्तानी जीवन के सभी कोनों को रचनात्मक सामग्रियों से भर दिया है। हमारी भाषाएँ, हमारा काव्य, हमारा साहित्य, हमारा समाज, हमारी रुचि, हमारी पोशाक, हमारे रस्मो-रिवाज (प्रथाएँ), हमारे दैनिक जीवन की अगणित वास्तविकताएँ— कोई भी कोना ऐसा नहीं है जिसपर इस सामाजिक जीवन की छाप न लग सकी हो। हमारी बोलियाँ अलग-अलग थी, मगर हम एक ही भाषा बोलने लगे। हमारे रस्मो-रिवाज एक दूसरे से भिन्न थे, मगर उन्होंने मिलजुल कर एक नया साँचा पैदा कर दिया। हमारी पुरानी पोशाक इतिहास की पुरानी तस्वीरों में देखी जा सकती है, मगर अब वह हमारे शरीरों पर नहीं मिल सकती। ये सभी मिश्रित पूँजी हमारी संयुक्त राष्ट्रीयता की एक सम्पत्ति है और हम इसे छोड़कर उस युग की ओर लौटना नहीं चाहते जब हमारी यह मिली-जुली जिन्दगी शुरू नहीं हुई थी। हममें यदि ऐसे हिन्दू मस्तिष्क हैं, जो चाहते हैं कि एक हजार वर्ष पहले का हिन्दू जीवन वापस लाएँ तो उन्हें मालूम होना चाहिए कि वे एक स्वप्न देख रहे हैं और वह कभी पूरा होने वाला नहीं। इसी तरह अगर ऐसे मुसलमान दिमाग मौजूद हैं जो चाहते हैं कि अपनी उस गुजरी हुई संस्कृति और समाज को फिर ताजा करें जो वे एक हजार वर्ष पूर्व ईरान और मध्य एशिया से लाए थे, तो मैं उनसे भी कहूँगा कि वे इस सपने से जितना जल्द जाग्रित हो जाएँ

उत्तम है, क्योंकि यह एक अप्राकृतिक विचार है। और वास्तविकता की धरती पर ऐसे विचार उग नहीं सकते।

हमारी इस एक सहस्त्र वर्ष की सामाजिक संस्कृति और जीवन ने एक संयुक्त राष्ट्रीयता का साँचा ढाल दिया है। ऐसे साँचे बनाये नहीं जा सकते, वे प्रकृति के परोक्ष हाथों से शताब्दियों में अपने आप बना करते हैं। अब यह साँचा ढल चुका और भाग्य की मुहर इसपर लग चुकी, हम पसंद करें। या न करें मगर अब हम एक हिन्दुस्तानी राष्ट्र और अविभाज्य हिन्दुस्तानी राष्ट्र बन चुके हैं। पृथकता या विभाजन का कोई कृत्रिम विचार हमारे इस एक होने को दो नहीं बना सकता, अद्धैत को द्वैत में परिवर्तित नहीं कर सकता। हमें प्रकृति का निर्णय स्वीकार्य होना चाहिए और अपने भाग्य निर्माण में लग जाना चाहिए।"

यह थे मौलाना आजाद और उनका राष्ट्रीपति सिंहासन से दिया गया गया इतिहासिक खुत्बा (address), जो आज भी हिन्दुस्तान में बसी भिन्न भिन्न क़ौमों के दिलों को जोड़ता है और गरमाता है।

डाइरेक्टर
खुदा बख़्श ओरियन्टल पब्लिक लाइब्रेरी, पटना
11 नवम्बर 2019

मौलाना आज़ाद
के
लेखों से कुछ अंश

सैयद

यूसुफ

हुसैन

‘रंजूर’

अजीमाबादी

के

नाम

मौलाना

आजाद

के

दो

पत्र

1

भाई रंजूर !

मैं यह खत तुम्हें ऐसे अवसर पर लिख रहा हूँ कि तुम और तुम्हारे घरवाले शोक के सागर में डुबकियाँ खा रहे हैं और किनारे की तलाश में इसके रक्तिम थपेड़ों की कुछ परवाह नहीं करते। तुम्हारे मेरे स्नेहपूर्ण सम्बन्ध ऐसे प्रगाढ़ हो गए हैं कि यह कहने की कोई आवश्यकता नहीं कि तुम्हारे इस दुःख और संताप ने मुझे कितना शोकाकुल किया है। इसमें संदेह नहीं कि मेरा दार्शनिक रूझान मुझे हमेशा इस बात पर उभारता है कि मैं अपना स्वभाव ऐसा बना लूँ जिसे किसी प्रकार के दुःख और चिंता की अनुभूति न हो और दुःखों के पहाड़ से कमर झुक जाए परन्तु धैर्य हाथ से न छूटे। इसमें कोई संदेह नहीं कि यदि स्वभाव ऐसा हो जाए और यह केवल सैद्धांतिक रूप से न हो बल्कि वस्तुतः ऐसा हो, तो फिर इंसान दुनिया में बहुत आनन्द और राहत से जीवन व्यतीत कर सकता है। उसके सभी अवसाद उत्साह हो जाएँ और सभी असफलताएँ सफलता, देखने योग्य बात यह हो कि यदि कोई मर जाए तो उसे दो आँसू बहाने का कष्ट न हो और यदि कोई बिछड़ जाए तो वियोग की पीड़ा न झेलनी पड़े। परन्तु अफसोस कि इंसान ने यह प्रवृति पाई ही नहीं कि वह अपना स्वभाव ऐसा बना ले और अपना दिल मोम से पत्थर कर ले। इन्सान के सीने में प्रकृति ने एक ऐसी वस्तु रख दी है कि वह पीड़ा से दुःखी और आनन्द से सुखी होती है और इसी का प्रभाव इन्सान के स्वभाव पर होता है। नीतिशास्त्र का आधार ही इस मानवीय संवेदना पर रखा गया है और यह हो नहीं सकता कि इन्सान स्वयं चाहकर अपनी मर्जी से यह

संवेदना खो दे। बस मेरा भी यही हाल है। आजकल मेरा प्रिय समय अधिकतर इसी प्रयास में बीतता है कि मैं अपना स्वभाव ऐसा बना लूँ जिसे किसी प्रकार की परिणाम जनक संवेदना न हो। परन्तु साथ ही यह विचार मुझे अपने प्रयासों से रोक रखता है कि यह एक अन्होनी बात है और यह प्रयास निरर्थक और निष्फल है।

दिल ही तो है न संगो-खिश्त दर्द से भर न आए क्यों ?
रोएंगें हम हजार बार कोई हमें रुलाए क्यों ?

परन्तु देखा तुमको हमको 'खुदा' ही ने रुला दिया ! प्रकृति ही ने शोकाकुल बना दिया ! अब कैसी शिकायत और कहाँ का शिकवा ?

तो खैर मैं तुम्हें एक उपदेशक के रूप में नहीं बल्कि एक मित्र के रूप में परामर्श देता हूँ कि अब तुम भी इस बात की कोशिश करो कि यह दुःख की अनुभूति दिल से जाती रहे। हालांकि इसका परिणाम असफलता है, परन्तु यह निश्चित है (जैसा कि मुझे अनुभव हो चुका है) कि इस कोशिश से दुःख के अवसर पर कर्म की ओर अग्रसर होने का विचार आ जाता है और अगरचे कर्म न किया जाए तो भी इस विचार से एक ऐसी शान्ति और एक ऐसा धैर्य मन में पैदा हो जाता है जो संभवतः तकदीर के सम्बन्ध में किसी एक धर्म-निष्ठ मन में न पैदा होता होगा।

बहरहाल ! मैं तुम्हारे दुःख में शरीक हूँ परन्तु साथ ही उपदेश भी देता जाता हूँ कि अनुभूति की समाप्ति की कोशिश करो। भौतिकवादी दर्शन की पहली सीढ़ी यही है अगरचे नीतिशास्त्र इसके विरुद्ध हो।

—सैयद यूसुफ हुसैन 'रंजूर' अजीमाबादी
के नाम मौलाना आजाद के एक पत्र से
1903 ई०

2

लार्ड टेनिसन का कथन है कि मित्र का पत्र रोग से मुक्ति का वह नुस्खा है जिसके प्रयोग से रोगी रोग से पूर्णतः मुक्त हो जाता है हालांकि पहली दृष्टि में यह पश्चिमी अत्युक्ति प्रतीत होती है, परन्तु वस्तुतः इस बात की पुष्टि वही कर सकता है जो सचमुच प्रेम रोगी है और उसका रोग इस बात पर बाध्य है कि प्रेम का मसीहा कोई परीक्षित नुस्खा लिख कर प्रदान करे। बेशक आपके नुस्खे मुझ रोगग्रस्त के लिए बहुत उपयोगी हैं।

मुझे इस छोटे से वक्तव्य से अपना प्रेम नहीं जताना है, क्योंकि आपका दिल स्वयं मेरी दशा का अनुमान लगाता होगा। इसमें कोई संदेह नहीं कि अपने सगे-सम्बन्धियों का प्रेम उच्च कोटि का प्रेम होता है, परन्तु जैसा कि स्वर्गीय सर सैयद अहमद खाँ ने अपने एक पत्र में लिखा है, यथार्थतः एक सच्चे प्रेम के आगे इस प्रेम का कोई महत्त्व नहीं है। हाँ ! बेशक आपका सच्चा प्रेम सगे-सम्बन्धियों के प्रेम से श्रेष्ठता रखता है।

आप जानते हैं कि मेरे विचार अपने पूरे वर्ग में एक भिन्न दिशा लिए रहते हैं। विशेषतः कुछ सुधारवादी विचार जिनको मैंने सर सैयद के लेखों से ग्रहण किया है, बिल्कुल भिन्न हैं और इसीलिए सोसायटी के भय से आज तक मैं इनको जबान पर नहीं लाया करता। हाँ आप पर मैंने कुछ व्यक्त किए हैं और व्यक्त करूँगा, जैसे पर्दा और स्त्री-शिक्षा, कुर्आन के विवादास्पद वक्तव्यों में स्पष्टीकरण की आवश्यकता, आधुनिक दर्शन की गुणात्मकता, प्राचीन दर्शन की त्रुटियाँ इत्यादि जिनके व्यक्त करने पर मुझे आशा है कि 'नेचरीयत' का 'फतवा' जारी किया जाएगा।

परसों एक साहब ने विवाह की संख्या के निर्धारण का मामला छेड़ दिया। मैंने कहा कि कुर्आन शरीफ से कभी प्रमाणित नहीं होता कि बिना आवश्यकता एक से अधिक शादी की जाए। चूँकि यह (यूरोपवासियों की आपत्तियों जैसा) एक नवीन विचार था, भाई साहब इस पर चौंक उठे और कहने लगे पिछले व्याख्याताओं ने यह कहीं नहीं लिखा है। मैंने कहा वह भी आदमी थे हम भी आदमी हैं, उन्होंने इस पर गौर नहीं किया, चलिए गलती ही सही क्या हरज है, परन्तु विवाह की इस संख्या निर्धारण से आधुनिक यूरोप-वासियों की जो आपत्ति कुर्आन पर उठाई जाती है, उसका जवाब देना आवश्यक है। इस पर उन्होंने स्पष्टतः लोगों के बीच कह दिया कि यह विचार 'नेचरी' और विधर्मी हैं, अर्थात् तू 'नेचरी' है !! मुझे इस बात की कोई परवाह नहीं कि दस आदमी मेरा हाथ न चूमेंगे या मेरी पूजा न करेंगे, मुझ को नेचरी कहेंगे, बल्कि इस बात का अफसोस हुआ कि कहीं इस बात की खबर 'वालिद साहब' को न हो जाए और वह भी मुझे 'नेचरी' न समझने लगें। परन्तु खैर !! मुझे अब इस को भी परवाह नहीं ! सत्य का छुपाना असंभव है, सत्य के उद्घोष से कभी न रूकूँगा !!!

—सैयद यूसुफ जाफरी रंजूर अजीमाबादी के नाम

मौलाक आजाद के एक पत्र से

1903 ई.

3

सन् **1906** के शरद ऋतु की अंतिम रातें थीं जब अमृतसर में मेरी जागती आंखों ने एक सपना देखा। मानवीय संकल्पों और योजनाओं को, जब तक वह मस्तिस्क और कल्पना में हैं, जागती आँखों का सपना ही समझना चाहिए। पूरे छह वर्ष इसके स्वप्नफल की अनुरागपूर्ण खोज में लग गए। आशा की चुभन और उत्साह की जलन ने हरदम बेचैन रखा और दुख व निराश की भीड़ बार-बार उमंगों और संकल्पों पर हावी हो गई। लेकिन संकल्प की दृढ़ता और भगवान की कृपा का भरोसा हर हाल में संतोषप्रद था। यहाँ तक कि आज इस प्यारे स्वप्न का स्वप्नफल अपने पूर्ण अस्तित्व में आंखों के सामने है।

× × ×

यद्यपि एक साप्ताहिक अखबार का छापना उर्दू प्रेस की वर्तमान स्थिति को देखते हुए इतना सस्ता और सुलभ काम है जिसके लिए छह सप्ताह की प्रतीक्षा भी अनावश्यक है। एक तेज गति से लिखने वाले 'कातिब' का सस्ता समय, चार पत्थर (लिथो की छपाई में प्रयुक्त होनेवाला) और एक काठ का हस्तचालित प्रेस, ये तीन आवश्यक तत्व हैं जिसके जमा कर लेने के बाद उर्दू अखबार का दफ्तर बिल्कुल संपूर्ण हो जाता है। लेकिन कल्पना के आरम्भ से ही जो ऊँचा मानदंड सामने था, मानसिकता ने सहन नहीं किया कि कठिनाइयों से हारकर उसे भुला दिया।—एक साप्ताहिक उर्दू पत्रिका के लिए विद्युत से चलने वाली मशीनों की आवश्यकता न थी

और न किसी बड़े प्रेस से सम्बन्धित साज समान की, और न एक उर्दू का अखबार देश की वर्तमान स्थिति में इतना सामर्थ्य पैदा कर सकता है कि किसी बड़े प्रेस को अपने भरोसे पर जीवित रख सके। बस यह जो कुछ किया जा रहा है यर्थाथतः कुछ महान संकल्प हैं जिनकी ओर क्रमशः ध्यान देना है।

अल-हिलाल

—प्रथम सम्पादकीय लेख

1912 ई०

4

वह हाथ बहुत पावन है जिसमें संधि का श्वेत ध्वज लहरा रहा हो, परन्तु जीवित वही हाथ रह सकता है जिसमें रक्त रंजित तलवार की मूठ हो। यही राष्ट्रों के जीवन का आधार, न्याय व शान्ति की स्थापना का माध्यम, मनुष्य की पशुवृति और बर्बरता से बचाव और पीड़ितों के हाथ में उसका एकमात्र सुरक्षा कवच है— "हमने अपने दूतों को स्पष्ट निशानियों के साथ भेजा और उनको किताब दी और न्याय दिया, ताकि लोग न्यायमार्ग और इन्साफ पर कायम हों, और लोहा पैदा किया जो हथियारों के रूप में अत्यन्त भयंकर भी है और लाभप्रद भी।" (कुर्आन)

कलकत्ता में दिये गये एक भाषण से

27 अक्टूबर, 1914 ई०

5

इस आन्दोलन की सफलता के लिए इस बात की आवश्यकता थी कि यह आन्दोलन किसी समुदाय विशेष का आन्दोलन न हो बल्कि यह इस देश के लिए देशव्यापी आन्दोलन बन जाए। यह दूसरा चरण था जो खिलाफत आन्दोलन के सामने आया। आवश्यकता थी कि यह सात करोड़ दिलों को अपना घर न बनाये बल्कि बत्तीस करोड़ दिलों में अपना घर बनाती। यह हिन्दु भाई हमारे कंधे से कंधा जोड़ कर खड़े हो जाते और उनकी सहानुभूति भी इस आंदोलन में शामिल हो जाती। इसलिए नहीं कि वस्तुतः मुसलमानों के माँगों की सफलता इस बात पर निर्भर थी कि हम अपने भाइयों को इस सहयोग के लिए कष्ट देते। हम में से प्रत्येक व्यक्ति, जिसके दिल में 'ईमान' मौजूद है, उसको विश्वास होना चाहिए कि इस संसार में किसी उद्देश्य की सफलता केवल लोगों की संख्या पर आधारित नहीं है बल्कि प्रत्येक आन्दोलन की सफलता ईमान और कर्म की शक्ति पर निर्भर है। इससे पहले बार-बार मैं घोषणा कर चुका हूँ। आज भी घोषणा करता हूँ कि यथार्थतः इस उद्देश्य की सफलता के लिए हिन्दुस्तान के किसी क्षेत्र से, किसी एक भाई को भी, इस सम्बन्ध में कष्ट देने के लिए हम विवश न थे कि वह हमारी सहायता करता। यदि मुसलमान सफलता प्राप्त कर सकते थे तो 'अल्लाह' पर भरोसा करके, अल्लाह की मदद पर, अपने ईमान पर भरोसा करके। परन्तु निःसन्देह जबकि समस्या का रूप यह था तो इसके साथ ही इस बात की आवश्यकता थी कि खिलाफत आन्दोलग के अन्तर्गत स्वयं हिन्दुस्तान की समस्या हल नहीं हो सकती थी, जब तक देश में कोई सामूहिक आन्दोलन पैदा न होता और वस्तुतः खिलाफत आन्दोलन की सफलता में एक विशेषता यह है कि इसने ऐसे शक्ति-

शाली हंगामे के साथ पूरे हिन्दुस्तान के विषय को जीवित कर दिया जो चालीस वर्षों के प्रयास से हिन्दुस्तान को न मिला था।

इस सफलता के बाद हम देखते हैं कि हिन्दुस्तान में न केवल खिलाफत आन्दोलन मौजूद है, बल्कि हिन्दुस्तान का मामला भी पूरे आवेग के साथ जीवित हो गया है।

मेरे दोस्तो ! आज हमारा पहला कर्त्तव्य यह होना चाहिए कि हम अपनी पिछली सफलताओं की कहानी न दुहराएँ बल्कि हर आदमी अपने कर्मों की आत्म-विवेचना करे और अपने दिल से पूछे कि क्या वास्तव में उसके दिल के भीतर ईमान का बुझा हुआ दीप प्रकाशमान हो गया ? क्या वास्तव में उसके मन में सुकर्म की प्रवृति पैदा हो गई ? क्या वास्तव में उसके भीतर सत्य जाग्रत हो गया ? अब इस कार्यक्रम में अंतिम चरण बलिदान का है। यदि इसके लिए तैयार हो तो 'अल्लाह' की सहायता तुम्हारी अगवानी के लिए तैयार है। यदि ईमान हमारे भीतर पैदा नहीं हुआ है, यदि अब तक हमारा दिल शंका से मुक्त नहीं है, यदि हमारे दिल में सत्य की प्रथम अनुभूति पैदा नहीं हुई है, तो जो कुछ हम कर रहे हैं, यदि यह सत्य है तो निश्चित है कि सफलता न हो, और संसार की सभी शक्तियों को उसके सामने विजय प्राप्त हो। यदि 'अल्लाह' की चौखट से भागे हुए सर उसके आगे फिर न झुके हों, तो फिर कौन सी रात है जो तुम्हारी चौखट पर आएगी और तुम्हारी कुंडी खटखटाएगी। यदि अब भी तुम 'ईमान', 'सत्यवादिता', 'सुकर्म' और 'बलिदान' के लिए तैयार नहीं हो तो तुमको इसका अधिकार नहीं कि ईश्वर की धरती पर सफलता प्राप्त करो।

मैं अब यह बता देना चाहता हूँ कि यह जो मैंने कहा ये वो शर्तें हैं कि जिन्हें न प्रथम कह सकते हैं न अन्तिम। जब तक कि यह चार चीजें हमारे भीतर पैदा न होंगी। यही चार चीजें थीं जो हमारी सभी सफलताओं का कारण थीं जिन्हें पूरे भूमण्डल में दश्मन किसी प्रकार परास्त न कर सके। जिस प्रकार यह इस्लामी शर्तें आपके

लिए आवश्यक हैं उसी प्रकार आपको सचेत होना चाहिए कि आपने जो असहयोग का कार्यक्रम प्रारम्भ किया था उस सम्बन्ध में कुछ उपलब्धियाँ सामने आई थीं। जब तक इस कार्यक्रम को आप पूर्ण ईमान, कर्मनिष्ठा और सम्पूर्ण त्याग के साथ पूरा न करेंगे बाकी उपलब्धियाँ आपके सामने नहीं आ सकतीं। जब कोई उद्देश्य किसी के सामने रखा जाता है तो वह पूछता है कि इसका प्रतिफल कब मिलेगा। वह कर्तव्य पालन के मामले को दूकानदारी बताते हैं। वह पूछते हैं कि निष्कर्ष कब निकलेगा। कर्म को इससे मतलब नहीं कि फल क्या और कैसा होगा। यदि कर्तव्य कर्तव्य है तो हमें चाहिए कि हम पूरा करें निष्कर्ष की चिन्ता करना हमारा काम नहीं। संसार में बीज है, जमीन है, मनुष्य है और इस पर ईश्वर भी है। क्या तुम ईश्वर का काम ईश्वर की धरती पर कर सकते हो ? तुम तो यह कर सकते हो कि तुम्हारी झोली में जो दाना है जमीन को सौंप दो फिर वह ईश्वर है जो अपनी कृपा और करूणा भेजता है, और अपने बादल को बरसाता है, और जो बीज तुमने जमीन को सौंप दिया था उसको अंकुरित करता है। तुम्हारा कर्तव्य है कि जमीन अच्छी हो और दाना सही हो। यदि तुम्हारे ईमान का बीज सच्चा है और अपने दिल की जिस जमीन में तुमने डाला है वह खारी नहीं है तो निश्चित है कि वह जमीन के पर्दे को चीर अपनी सफलता का सिर बाहर निकालेगा। यदि इस समय मैं आपके सामने यह लाऊँ कि ईमान और कर्मनिष्ठा के विश्वव्यापी सिद्धान्त के अतिरिक्त, असहयोग और खिलाफत आन्दोलन के सिलसिले में जो काम सामने हैं वह कौन से हैं तो मेरे दोस्तो ! जल्दबाजी से काम न लेना कि वह काम आज खिलाफत आन्दोलन के लिए कितने लाभकारी हो सकते हैं ? तुम्हारा कर्तव्य यह नहीं है कि तुम उन कामों को अपनाओ जो खिलाफत आन्दोलन के लिए लाभकारी हैं, बल्कि तुम्हें चाहिए कि तुम वह काम करो कि जो तुम्हारा कर्तव्य है। यह बलिदानों की पहली मंजिल है जब तक इस मंजिल से आगे कदम न बढ़ जाए बलिदान का दावा नहीं माना जा सकता।

मैं कहता हूँ कि मेरी ओर न देखो, अपनी गर्दन नीचे झुका कर देखो। वह कपड़ा जो तुम्हारे तन पर है, और वह झीनी मलमलें

जो तुम्हारी देह से लिपटी हैं इनसे कितनी बड़ी सेवा तुम अपने दुश्मनों को कर रहे हो। तुम्हारे देश से नब्बे करोड़ रुपया हर वर्ष इन कपड़ों के माध्यम से उन खजानों में जाता है जो पाँच वर्षों से इस्लाम को मिटाने में खर्च किया जा रहा है। असहयोग के सम्बन्ध में इससे बढ़कर क्या समस्या हो सकती थी। तुम्हें कर्म की ओर अग्रसर करने के लिए यह कारण नहीं हो सकता कि तुम दूसरों को कितनी हानि पहुँचा सकते हो, तुम्हारे लिए सच्चा सिद्धान्त यह है कि तुम अपने दिल को कितना लाभ पहुँचा सकते हो। तुम्हारा पहला कर्तव्य यह है कि यह देखो कि अपने को कितना लाभान्वित कर सकते हो और तुम्हारी सफलता के लिए, खिलाफत के लिए, स्वराज्य के लिए पहली बात यह थी कि देश के भीतर अपने बलिदान की उमंग पैदा हो। लक्ष्य के लिए, देश के लिए, सत्य के लिए कठिनाइयाँ झेलने का उत्साह पैदा हो। इस समय आवश्यकता थी कि बलिदान का पाठ सामने आए। जो पाठ तुम्हारे सामने आया वह प्राण या गर्दन के बलिदान का न था केवल इन कपड़ों के त्याग का था। यदि इसको तुम सफलता के साथ नहीं कर सकते, यदि तुम्हारे दिल में इतना प्रेम नहीं है कि तुम इन महीन कपड़ों को छोड़कर मोटे कपड़े पहन सको, तो क्या तुम ईश्वर की धरती पर बसने की हिम्मत कर सकोगे। जब तक विदेशी कपड़ों के बायकाट की इस मंजिल को तय न करो बलिदान की कोई मंजिल सामने नहीं आ सकती। तीस सितम्बर का समय खिलाफत कमीटी ने इसके लिए निर्धारित किया था, परन्तु हमारी सफलताओं पर इससे बढ़कर धब्बा नहीं हो सकता कि तीस सितम्बर की सुबह आई और हमारी अकर्मण्यता पर रो कर चली गई। अब तक वह कपड़ा मौजूद है जिसके कारण हिन्दुस्तान गुलाम बनाया गया। जिसके द्वारा उनके महत्त्वपूर्ण उद्देश्य रौंद दिए गए। हमें क्या अधिकार है कि हम कहें कि अपने प्राणों को कुर्बान करने के लिए तैयार हैं। यदि तुम अपने प्राणों का बलिदान कर सकते हो तो तुमको क्या हो गया है कि अपने वस्त्र का बलिदान नहीं दे सकते। हम में से प्रत्येक मुसलमान और हिन्दु का सबसे बड़ा, पवित्र और उत्तम कर्तव्य है कि जितना जल्द संभव हो इस उद्देश्य को सफल बनाएँ जब तक यह मंजिल तय न

होगी और कोई मंजिल हमारे सामने नहीं आ सकती। विशेषकर मुसलमानों के लिए एक बड़ा काम जो उनके शारीरिक त्याग से सम्बन्ध रखता है, वो यह है कि वह इन महीन कपड़ों को, जो मांचेस्टर और लंकाशायर से आते हैं और इनके देश को तबाह कर रहे हैं, उतार दें और उनको अपने लिए उचित न समझें।

केन्द्रीय खिलाफत कमिटी ने आज मुसलमानों को दावत दी है दी है कि उनका कर्तव्य है कि वह अंगोरा (तुर्की) के लिए अपने धन को कुर्बान करें और अंगोरा तथा खिलाफत के लिए अपने शरीर को थोड़ा कष्ट दें विदेशी कपड़े को त्याग दें और अपने घर के संदूकों को केवल देशी कपड़े से भरें।

प्रान्तीय खिलफात अधिवेशन, आगरा

के अध्यक्षीय भाषण से।

25 अगस्त, 1921 ई०

6

गवर्नमेन्ट ने मुहम्मद अली, शौकत अली, सैफुद्दीन किचलू, हुसैन अहमद, शंकराचार्य को गिरफ्तार नहीं किया है बल्कि गवर्नमेंट ने अन्तिम घोषणा कर दी है कि वह इस्लाम को और संसार के शाश्वत सत्य को गिरफ्तार करना चाहती है। लेकिन गवर्नमेन्ट को मालूम होना चाहिए कि इसका घमंड लाख ऊँचा सही, इसके घमंड से भी ऊँची एक शक्ति मौजूद है। गवर्नमेन्ट समझती है कि हम से बढ़कर संसार में कौन है, परन्तु वह आस्मानों और जमीनों की सृष्टि करने वाला बताता है कि वास्तविक शक्तिशाली "अल्लाह" है।

चूँकि गवर्नमेन्ट ने अपने कृत्य से इस्लाम को, इस्लाम की धारणाओं को, संसार के विश्वव्यापी सत्य को, शाश्वत सच्चाई को चुनौती दी है, इसलिए हममें से हर व्यक्ति का कर्तव्य होगा कि जब सत्य को मिटाया जाए, सच्चाई को अपराध कह दिया जाए तो चाहे वह कितनी ही छोटी वस्तु हो उस समय मनुष्य के लिए बड़ी से बड़ी 'इबादत' यह बन जाती है कि अत्याचार का सामना करे।

अन्तिम 'हज' के अवसर पर एक आदमी ने हजरत मोहम्मद साहब से पूछा, "सबसे बड़ा और सबसे अच्छा 'जिहाद' (धर्मयुद्ध) क्या है?" हजरत ने थोड़ी देर ठहर कर कहा--"सबसे उत्तम 'जिहाद' है, अत्याचारी शासक के सामने सत्य वचन की घोषणा कर देना!"

हिन्दुस्तान के अन्दर अंग्रेजो फौज का हिन्दुस्तान का सिपाही क्या करता है? हिन्दुस्तान को गुलाम बनाता है और हिन्दुस्तानियों का खून बहता है। क्या तुम जानते हो कि हिन्दुस्तान का शासन

और हिन्दुस्तान की शक्ति किसने बर्बाद की ? तो मैं बताना चाहता हूँ कि दो सौ वर्ष पहले, जो अंग्रेजी राज के आने का समय है तुम्हारे देश को गुलाम बनाने के लिए संसार की संपत्ति आई थी न ब्रिटेन के ढले हुए हथियार आए थे। इतिहास बताता है कि कोई ब्रितानवी सोना चाँदी नहीं आया हिन्दुस्तान में बिखेरने के लिए। ईस्ट इंडिया कम्पनी के काल से आज तक, बताओ कि हिन्दुस्तान के इतिहास में एक घटना भी मौजूद है कि हिन्दुस्तान को अंग्रेजी राज का गुलाम बनाने के लिए कोई फौज भी ब्रिटेन के द्वीप से आई और कोई लदा हुआ खजाना समुद्र के किनारे लगा ? जिस स्वराज्य के लिए तुम्हारे दिलों में छेद हो गए हैं, अभागे हिन्दुस्तान के बसने वालों, सुन लो कि इस स्वराज्य को स्वयं हिन्दुस्तान की फौजों ने नष्ट किया है। वह हिन्दुस्तान की ही फौज थी जिसने मुट्ठी भर गेहूँ के लिए अपने 'दीन' को, धर्म को बेचा, जिसने अपनी 'रूह' को, आत्मा को अंग्रेजों के हवाले कर दिया, ताकि हिन्दुस्तान को, उनके वतन को, देश को, अंग्रेज गुलाम बना लें ! वह हिन्दुस्तान ही का खजाना था, जो उनके आगे डाल दिया गया कि वह जी भर कर चूस ले हिन्दुस्तान के खून को। वह तुम्हारी अकर्मण्यता, तुम्हारी फूट थी जिसने तुम्हें गुलाम बनाया।

प्रांतीय खिलाफत अधिवेशन, आगरा
के समापन भाषण से
26 अगस्त. 1921 ई०

7

10 दिसम्बर **1921** ई० को कलकत्ता में गिरफ्तारी के बाद विद्रोह के आरोप में, चीफ प्रेसिडेंसी मजिस्ट्रेट, कलकत्ता की अदालत में चलाए गए मुकदमे में मौलाना के लिखित बयान की अंतिम पंक्तियाँ।

"मिस्टर मजिस्ट्रेट मैं अब और अधिक समय कोर्ट का न लूंगा। यह इतिहास का एक रोचक और शिक्षाप्रद अध्याय है, जिसकी रचना में हम दोनों समान रूप से व्यस्त हैं। हमारे हिस्से में यह मुजरिमों का कटहरा है तुम्हारे हिस्से में वह मजिस्ट्रेट की कुर्सी। मैं स्वीकार करता हूँ कि इस काम के लिए वह कुर्सी भी उतनी ही आवश्यक चीज है जितना यह कटहरा। आओ इस यादगार और कहानी बनने वाले काम को जल्द समाप्त करें। इतिहासकार हमारी प्रतीक्षा में है और भविष्य कब से हमारी राह तक रहा है। हमें जल्द-जल्द यहाँ आने दो और तुम भी जल्द-जल्द फैसला लिखते रहो। अभी कुछ दिनों तक यह क्रम जारी रहेगा यहां तक कि एक दूसरी अदालत का दरवाजा खुल जाएगा। यह खुदा के कानून की अदालत है, समय इसका जज है। वह फैसला लिखेगा और उसी का फैसला अंतिम फैसला होगा।"

कौले फैसल

प्रेसीडेंसी जेल, अलीपुर, कलकत्ता
11 जनवरी, **1922** ई०

8

सुदूर अतीत के उस क्षण की कल्पना करो ! जब हमारी पृथ्वी सूर्य के प्रज्वलित पिंड से पृथक हुई थी, नहीं मालूम कितनी अवधि इसके ढंडे और सामान्य होने में बीत गई और यह इस योग्य हुई कि जीवन-तत्त्व इसमें विकसित हो सकें। इसके बाद वह युग आया जब इस धरातल पर विकास के अंकुर फूटे, फिर पता नहीं कितने समय बाद जीवन का वह पहला बीज अस्तित्व में आ सका जिसे जीव द्रव्य (Protoplasm) का नाम दिया जाता है। फिर शरीर धारी जीवन के विकास का युग आया और नहीं मालूम कितना बड़ा कालखंड इसमें बीता कि इस युग ने एककोशीय से बहुकोशीय तक और निम्न से उच्च श्रेणी तक क्रमिक विकास के चरण पूरे किए, यहाँ तक कि जीवधारियों की आरंभिक शृंखलाएँ अस्तित्व में आईं। फिर लाखों वर्ष इसमें बीत गए कि विकास का यह क्रम मानव रूप में अपने उत्कर्ष पर पहुँचे। फिर मनुष्य की शारीरिक उत्पत्ति के बाद मानसिक उत्थान का क्रम प्रारंभ हुआ और एक सुदीर्घ अवधि इस पर बीत गई। अंततः सहस्रों वर्ष की सामूहिक और मानसिक प्रगति के बाद वह मानव अस्तित्व में आ सका जो इस भूमंडल के ऐतिहासिक युग का सभ्य और प्रबुद्ध मानव है।

अर्थात् पृथ्वी के जन्म से लेकर आधुनिक मानव के उत्कर्ष तक जो कुछ बीत चुका है और जो कुछ बनता संवरता रहा वह पूर्णरूपेण मानव मात्र के जन्म और उत्कर्ष का ही वृतांत हैं।

प्रश्न यह है कि जिस अस्तित्व के पदार्पण के लिए प्रकृति ने

इतना अधिक प्रयोजन किया है क्या यह सब कुछ केवल इसलिए था कि वह पैदा हो, खाये, पिये और मर कर अस्तित्व हीन हो जाये ?

तर्जुमानुल कुअनि

मौलाना आजाद कृत कुर्आन की व्याख्या से एक उद्धरण

1932 ई०

9

मैं चाहता हूँ उन तमाम लोगों को, जो वस्तुस्थिति में एक अनापेक्षित परिणाम देख रहे हैं, स्थिति के वास्तविक अध्ययन की दावत दूँ। मैं उनसे कहना चाहता हूँ कि इधर कुछ महीनों के अन्दर हिन्दुस्तान में कोई नई स्थिति उत्पन्न नहीं हो गई है और न कुछ महीनों के अन्दर हिन्दुस्तान की धरती व आकाश बदल सकते हैं। जो कुछ हो रहा है यह पिछली आधी शताब्दी के घटनाक्रम का प्राकृतिक परिणाम है और इसमें विचारवान लोगों के लिए अचम्भे की कोई बात नहीं। परन्तु यदि वह चाहें तो एक नई बात अस्तित्व में आ सकती है, लेकिन इसके लिए उन्हें किसी दूसरी ओर नहीं देखना चाहिए स्वंय अपनी ओर देखना चाहिए। यदि उन्होंने अपनी पुरानी संज्ञाहीनता को नई चेतना से बदल लिया तो निश्चित रूप से हिन्दुस्तान के धरती आकाश भी उनके लिए तुरंत बदल जाएँगे। यहाँ जीवन और कर्म के हर क्षेत्र में यही विधि का विधान काम कर रहा है। दुनिया बहुत पुरानी है और वह कभी ऐसा नहीं करती कि हमारे लिए अपना रूप बदल दे। लेकिन जब कभी हम बदल जाते हैं तो उसे भी बदल जाने पर मजबूर हो जाना पड़ता है।

मौलाना आजाद के

पैगाम से एक अंश

1937 ई०

10

हमें यहाँ रहकर हिन्दुस्तानियत और इस्लाम दोनों रिश्तों को बाकी रखना है और यूरोपीय जातियों की तरह, हम एक क्षण के लिए भी इस्लाम के इस विस्तृत रिश्ते को, जो हमें संसार के करोड़ों मुसलमानों से संबद्ध करता है, हिन्दुस्तानी राष्ट्रीयता के अन्दर मिटा नहीं सकते।

यदि सम्पूर्णानन्द जी ने यू० पी० असम्बली में भाषण करते हुए यह कहा कि वह शिक्षा के क्षेत्र में हिन्दु-मुस्लिम का भेद नहीं देखना चाहते और न सभ्यता व संस्कृति के मामले में हिन्दु-मुस्लिम भेद-भाव देखना पसन्द करते हैं तो निश्चित ही उन्होंने ऐसा सिद्धान्त प्रस्तुत किया है जो मुसलमानों के लिए स्वीकार्य नहीं हो सकता। न ही कांग्रेस का यह उद्देश्य है और न मुसलमान इस उद्देश्य से कभी सहमत हो सकते हैं कि हिन्दुतान से मुस्लिम शिक्षा, मुस्लिम सभ्यता, मुस्लिम संस्कृति और मुस्लिम विशिष्टताओं के मुख्य गुण अपना अस्तित्व खो दें और वह हिन्दुस्तान की एकीकृत राष्ट्रीयता में लीन होकर जर्मन या अंग्रेजों की तरह हिन्दुस्तानी "कौम" के सिवा और कुछ न रहें।

कांग्रेस ने अल्पसंख्यकों की सुरक्षा के सम्बन्ध में जो धारा 1931 ई० के करॉची अधिवेशण में पारित की है उसमें मुसलमानों की विशिष्टता को बाकी रखने का विश्वास दिलाया गया है। .....कराची के इस प्रस्ताव की पुष्टि के लिए पिछले साल ऑल इंडिया कांग्रेस कमिटि के कलकत्ता अधिवेषण में जो प्रस्ताव पारित हुआ था वह मैंने ही लिखा था, बाद में जवाहर लाल ने इसमें कुछ संशोधन किया। इसमें एक कदम और आगे बढ़कर यह कहा गया है कि हम न केवल अल्पसंख्यकों की लिपि, भाषा और कल्चर इत्यादि को सुरक्षित रखना चाहते हैं, बल्कि उनको और विकसित भी करेंगे। इस प्रस्ताव का उद्देश्य स्पष्ट रूप यह है कि मुसलमानों की विशिष्ट मर्यादा को हिन्तुस्तान

की एकीकृत राष्ट्रीयता में विलीन कर देना कांग्रेस का उद्देश्य हरगिज नहीं·····

यह विदित है कि हिन्दु या तो आधुनिक अर्थात् 'मॉडर्न' और 'नेशनल' है या पुरातनवादी अर्थात 'कंजर्वेटिव' और 'कम्युनल'। परन्तु हमें देखना यह चाहिए कि हमारे लिए 'माडर्न' हिन्दु ज्यादा अच्छा है या 'कंजर्वेटिव' हमें जवाहरलाल और सावरकर में से चुनाव करना है।

मुसलमान को स्पष्टत: चिल्लाकर और पुकार कर यह घोषणा कर देनी चाहिये और इस घोषणा को हरेक स्थान पर अंकित कर देना चाहिये कि वह हिन्दुवाद में विलीन होने के लिए एक पल को भी तैयार नहीं। मुसलमान के रूप में उनकी जो जातीय विशेषताएँ हैं उसको वह न केवल बाकी रखेंगे बल्कि उन्नत करेंगे। कांग्रेस में सम्मिलित होने और देश की आजादी के संघर्ष में अपने हिन्दू भाइयों के साथ कंधे से कंधा मिलाकर चलने का यह अर्थ हरगिज नहीं है कि मुसलमान अपनी विशिष्ट जातीय पहचान को तिलांजलि दे दें और हिन्दुस्तान की एकीकृत राष्ट्रीयता के सागर में अपने पृथक जातीय अस्तित्व को मिटा कर रख दें। ऐसा हरगिज नहीं होना चाहिये, और न 'इंशा अल्लाह' ऐसा होगा·····

हमको हिन्दुस्तान में एक विशिष्ट तत्त्व बनकर तो अवश्य रहना चाहिये परन्तु एक विरोधी और लड़ाका तत्त्व न बनना चाहिये, बल्कि हिन्दुस्तान के सामूहिक जीवन में एक विशिष्ट परन्तु समन्वित अंग की तरह रहने की कोशिश करनी चाहिये। अर्थात् राष्ट्रीयता के दृष्टिकोण को इस सीमा तक स्वीकार करना चाहिये जहाँ तक हमारे जातीय वैशिष्ट्य को सुरक्षित रखकर इसे स्वीकार किया जा सकता है।

—नेशनल तहरीक

(अप्रकाशित) से

1939 ई०

II

मुझे नहीं मालूम आपलोगों में कितने आदमी ऐसे हैं जिनकी दृष्टि से मेरे वे लेख गुजर चुके हैं जो आज से अठाइस वर्ष पहले मैं "अल-हिलाल" के पृष्ठों पर लिखता रहा हूँ। यदि चंद व्यक्ति भी ऐसे मौजूद हैं तो मैं उनसे निवेदन करूँगा कि अपनी स्मरणशक्ति ताजा कर लें। मैंने उस जमाने में भी अपने इस आस्था को व्यक्त किया था और उसी तरह आज भी करना चाहता हूँ कि हिन्दुस्तान की राजनीतिक समस्याओं में कोई बात भी इस दर्जा गलत नहीं समझी गई है जिस दर्जा यह बात कि हिन्दुस्तान के मुसलमानों की हैसियत एक राजनीतिक अल्पसंख्यक की है। और इसलिए उन्हें एक जनतांत्रिक हिन्दुस्तान में अपने हकों और लाभों के संबंध में सशंकित रहना चाहिए। इस एक बुनियादी गलती ने अगणित गलतफहमियों की पैदाइश का दरवाजा खोल दिया। गलत बुनियादों पर गलत दीवारें खड़ी की जाने लगीं। उसने एक तरफ तो खुद मुसलमानों पर उनका वास्तविक रूप संदेहास्पद कर दिया। दूसरी ओर संसार को एक ऐसी गलतफहमी से ग्रस्त कर दिया जिसके बाद वह हिन्दुस्तान को इसकी सही हालत में नहीं देख सकता।

यदि समय होता तो मैं आपको विस्तारपूर्वक बतलाता कि मामले का यह गलत बनावटी रूप गत साठ वर्ष के भीतर क्यों कर ढाला गया और किन हाथों से ढला, वास्तव में यह भी उसी फूट डालने वाली नीति की उपज है जिसका नक्शा इंडियन नेशनल कांग्रेस के आन्दोलन के आरम्भ होने के पश्चात् हिन्दुस्तान के सरकारी दिमागों में बनना शुरू हो गया था और जिसका उद्देश्य यह था कि मुसलमानों को उस राजनीतिक जागृति के विरोध में इस्तेमाल करने के लिए तैयार किया जाए। उस नक्शे में विशेषकर दो बातें उभारी गई थीं। एक बात यह कि हिन्दुस्तान में दो भिन्न कौमें आबाद हैं। एक हिन्दू कौम है और एक मुसलमान कौम है। इसलिए संयुक्त कौमियत

(राष्ट्रीयता) के नाम पर यहाँ कोई माँग नहीं की जा सकती। दूसरी बात यह कि मुसलमानों की संख्या हिन्दुओं की तुलना में बहुत कम है। इसलिए यहाँ जनतांत्रिक प्रणाली कायम करने का अनिवार्य परिणाम यह होगा कि हिन्दू बहुसंख्यक की हुकूमत कायम हो जाएगी और मुसलमानों का अस्तित्व खतरे में पड़ जाएगा। मैं इस समय अधिक विस्तार में नहीं जाऊँगा। सिर्फ इतनी बात आपको याद दिलाऊंगा कि अगर इस मामले की प्रारम्भिक तिथि मालूम करना चाहते हैं तो आपको हिन्दुस्तान के एक भूतपूर्व वाइसराय लार्ड डफरिन और पश्चिमोत्तर प्रदेश (अब संयुक्त प्रान्त) के भूतपूर्व गवर्नर सर आकलैंड कालोन के जमाने की तरफ लौटना चाहिए।

ब्रिटिश साम्राज्य ने भारत-भूमि पर यदा-कदा जो बीज डाले उनमें से एक बीज यह था। उससे जल्द ही फूल-पत्ते पैदा किये और यद्यपि पचास वर्ष व्यतीत हो चुके हैं तथापि उसकी जड़े शुष्क नहीं हुई।

राजनीतिक बोलचाल में जब कभी अल्पसंख्यक शब्द का व्यवहार होता है तो उसका उद्देश्य यह नहीं होता कि "गणित" के आम हिसाबी कायदे के अनुसार आदमियों की हर ऐसी संख्या जो दूसरी संख्या से कम हो अनिवार्य रूप से "अल्पसंख्यक" होती है और उसे अपनी सुरक्षा की दृष्टि से बेचैन होना या घबराना चाहिए, बल्कि उसका उद्देश्य एक ऐसा कमजोर वर्ग होता है जो जनसंख्या और योग्यता दोनो दृष्टियों से अपने को इस काबिल नहीं पाता कि एक बड़े और शक्तिशाली गिरोह के साथ रहकर अपनी सुरक्षा के लिए खुद अपने ऊपर विश्वास कर सके। इस रूप की कल्पना या विचार के लिए सिर्फ यही काफी नहीं कि एक गिरोह की संख्या दूसरे गिरोह से कम हो, बल्कि यह भी जरूरी है कि बजाए खुद कम हो और इतनी कम हो कि इससे अपनी सुरक्षा की आशा न की जा सके। साथ ही इसमें संख्या (Number) के साथ प्रकार (Kind) का सवाल भी काम करता है। कल्पना कीजिए कि एक देश में दो गिरोह वर्तमान हैं। एक की संख्या एक करोड़ है, दूसरे की दो करोड़ है। अब यद्यपि एक करोड़ दो करोड़ का आधा होगा और इसलिए दो करोड़ से कम होगा। मगर राजनीतिक दृष्टिकोण से आवश्यक न होगा कि इस सम्बन्धित अन्तर के आधार पर उसे एक अल्पसंख्यक मान लिया जाए। कमजोर वर्ग को स्वीकार कर लें तो इस

प्रकार के अल्पसंख्यक होने के लिए संख्या के आनुपातिक अन्तर के साथ दूसरे कारकों की मौजूदगी भी जरूरी है।

अब जरा ध्यान दीजिए कि इस दृष्टि से हिन्दुस्तान में मुसलमानों की वास्तविक स्थिति क्या है? आपको देर तक गौर करने की जरूरत न होगी। आप केवल एक ही दृष्टि में मालूम कर लेंगे कि आप के सामने एक बड़ा गिरोह अपनी इतनी बड़ी और फैली हुई संख्या के साथ सिर उठाये खड़ा है कि इसके सम्बन्ध में अल्पसंख्यक की कमजोरियों का सन्देह करना अपनी दृष्टि को प्रकटतः धोखा देना है। इसकी संख्या कुल मिलाकर देश में आठ नौ करोड़ के भीतर है। वह देश के दूसरे वर्गों की तरह सामाजिक और जातीय विभाजनों में बँटी हुई नहीं है। इस्लामी जीवन के समाजवाद और बन्धुत्व की एकता के दृढ़ सम्बन्ध ने उसे सामाजिक भेदभाव की कमजोरियों से बहुत हद तक सुरक्षित रखा है। निसंदेह यह संख्या देश की पूरी जनसंख्या में एक चौथाई से अधिक का अनुपात नहीं रखती। लेकिन सवाल संख्या के सम्बन्ध का नहीं है, खुद अपनी संख्या और उसके प्रकार का है। क्या इन्सानों की इतनी बड़ी संख्या के लिए इस प्रकार की शंकाओं का कोई उचित कारण हो सकता है कि वह एक आजाद और जनतांत्रिक हिन्दुस्तान में अपने हकों और लाभों की निगरानी नहीं कर सकेगी।

यह संख्या किसी एक ही क्षेत्र में सिमटी नहीं हैं, बल्कि एक विशेष विभाजन के साथ देश के विभिन्न हिस्सों में फैल गई है। हिन्दुस्तान के ग्यारह प्रान्तों में चार प्रान्त ऐसे हैं जहाँ मुसलमान बहुसंख्यक हैं और दूसरे धार्मिक समुदाय अल्पसंख्यक के रूप में है। यदि ब्रिटिश बलूचिस्तान को भी इसमें सम्मिलित कर दिया जाए तो पाँच प्रान्त हो जाएँगे। यदि हम अभी मजबूर हैं कि धार्मिक भेद के आधार पर ही मुस्लिम "बहुसंख्यक" और "अल्पसंख्यक" की कल्पना करते हैं, तो भी इस कल्पना में मुसलमानों की जगह केवल एक अल्पसंख्यक की दिखाई नहीं देती। वे अगर सात प्रान्तों में अल्पसंख्यक की हैसियत रखते हैं तो पाँच प्रान्तों के उन्हें बहुसंख्यक का स्थान प्राप्त है। ऐसी दशा में कोई कारण नहीं कि इन्हीं को एक अल्पसंख्यक गिरोह होने की अनुभूति व्याकुल कर सके।

हिन्दुस्तान का आइन्दा बुनियादी संविधान अपने विश्लेषण में चाहे किसी प्रकार का हो, लेकिन वह ऐसा संविधान होगा जिसके कुल क्षेत्र अपने-

अपने आन्तरिक मामलो में खुदमुख्तार (स्वतंत्र) होंगे और संघीय केन्द्र के हिस्से में सिर्फ वही मामले रहेंगे जिनका सम्बन्ध देश की सामान्य और सार्वजनिक तथा समग्र समस्याओं से होगा, उदाहरणार्थ विदेशी सम्बन्ध, सुरक्षा, कस्टम वगैरह। ऐसी हालत में क्या सम्भव है कि कोई दिमाग जो एक जनतांत्रिक संविधान के पूरी तरह कार्यान्वित होने और संवैधानिक रूप में चलने का नक्शा थोड़ी देर के लिए भी अपने सामने ला सकता है, उन शंकाओं के स्वीकार करने के लिए तैयार हो जाए जिन्हें बहुसंख्यक और अल्पसंख्यक के उस कपटपूर्ण सवाल ने पैदा करने की कोशिश की है। मैं एक क्षण के लिए यह विश्वास नहीं कर सकता कि हिन्दुस्तान के भविष्य के नक्शों में इन शंकाओं के लिए कोई जगह निकल सकती है। वास्तव में ये सभी शंकाएँ इसलिए पैदा हो रही हैं कि एक ब्रिटिश सम्पादक के सुविख्यात शब्दों में जो उसने आयरलैंड के बारे में कहे थे—"हम अभी तक नदी के किनारे खड़े हैं और यद्यपि तैरना चाहते हैं मगर नदी में कूदते नहीं। इन शंकाओं का केवल एक ही इलाज है। हमें नदी में निर्भय और निडर होकर कूद जाना चाहिए। ज्योंही हमने ऐसा किया, हम मालूम कर लेंगे कि हमारी ये सभी शंकाएँ निर्मूल थीं।"

लगभग तीस वर्ष हुए जब मैं ने एक हिन्दुस्तानी मुसलमान की हैसियत से इस समस्या पर पहली बार गौर करने की कोशिश की थी। यह वह जमाना था कि मुसलमान बड़ी संख्या में राजनीतिक बहुसंघर्ष के मैदान से बिल्कुल अलग थे और आम तौर पर वही मानसिकता हर तरफ छाई हुई थी जो 1888 ई० में कांग्रेस से पृथकता और विरोध का रूप धारण कर गई थी। उस समय की यह आबोहवा मेरे चिन्तन-मनन की राह न रोक सकी। मैं बहुत जल्द एक अन्तिम परिणाम तक पहुंच गया और उसने मेरे सामने विश्वास और कियात्मकता की राह खोल दी। मैंने गौर किया कि हिन्दुस्तान अपनी सभी समस्याओं और स्थितियों के साथ हमारे सामने मौजूद है और अपने भविष्य की ओर बढ़ रहा है। हम भी इसी नौका पर सवार हैं और इसकी गति से बेपरवाह नहीं रह सकते। इसलिए आवश्यक है कि अपनी कार्य-प्रणाली का स्पष्ट और अन्तिम निर्णय कर लें। हम यह निर्णय किस तरह कर सकते हैं? सिर्फ इस तरह कि मामले की सतह पर न रहें, इसकी बुनियादों तक उतरें और फिर देखें कि हम अपने आपको किस हालत में पाते हैं। मैंने ऐसा किया और देखा कि सारे मामले का निर्णय केवल एक सवाल के जवाब पर निर्भर है। हम

हिन्दुस्तानी मुसलमान हिन्दुस्तान के आजाद भविष्य को शंका और अविश्वास की दृष्टि से देखते हैं या आत्मविश्वास और साहस की नजर से; अगर पहला रूप है तो निःसंदेह हमारा मार्ग दूसरा हो जाता है। समय की कोई घोषणा, भविष्य का कोई वादा, बुनियादी संविधान की कोई सुरक्षा, हमारे सन्देह और भय का वास्तविक इलाज नहीं हो सकता। हम मजबूर हो जाते हैं कि तीसरी शक्ति की उपस्थिति सहन करें। यह तीसरी शक्ति मौजूद है और अपनी जगह छोड़ने के लिए तैयार नहीं, और क्या हमें भी यह इच्छा रखनी चाहिए कि वह अपनी जगह नहीं छोड़ सकें? लेकिन हम अगर महसूस करते हैं कि हमारे लिए सन्देह और भय का कोई कारण नहीं। हमें आत्म-विश्वास और हिम्मत की नजर से भविष्य को देखना चाहिए, तो हमारा कार्य-मार्ग बिल्कुल स्पष्ट हो जाता है। हम अपने आप को बिल्कुल एक दूसरी दुनिया में पाने लगते हैं। शक, शंका, निष्क्रियता और उथल-पुथल आदि की यहाँ छाया भी नहीं पड़ सकती। क्रियाशीलता में विश्वास और गतिशीलता का सूरज यहाँ कभी नहीं डुब सकता। समय का कोई उलझाव, परिस्थितियों का कोई उतार-चढ़ाव, मामलों की कोई चुभन, हमारे कदमों का रूख नहीं बदल सकती। हमारा कर्त्तव्य हो जाता है कि हिन्दुस्तान के राष्ट्रीय उद्देश्य की राह में कदम उठाए बढ़े जाएँ।

मुझे इस सवाल का जवाब मालुम करने में जरा भी देर नहीं लगी। मेरे दिल के एक-एक रेशे ने पहले रूप से इन्कार किया। मेरे लिए सम्भव नहीं था कि इसकी कल्पना भी कर सकूँ। मैं किसी मुसलमान के लिए, बशर्ते कि उसने इस्लाम की आत्मा अपने हृदय के एक-एक कोने से ढूँढ कर निकाल न फेंकी हो, संभव नहीं समझता अपने को पहली स्थिति में देखना सहन कर सके।

मैंने 1912 ई० में "अल-हिलाल" जारी किया और अपना यह निर्णय मुसलमानों के सामने रखा। आपको याद दिलाने की आवश्यकता नहीं कि मेरी आवाजें प्रभावहीन नहीं रहीं। 1912 ई० से 1916 ई० तक का जमाना हिन्दुस्तान के मुसलमानों की नई राजनीतिक करवट का जमाना था। 1920 ई० के अन्त में जब चार वर्ष की नजरबंदी के बाद मैं मुक्त हुआ तो मैंने देखा कि मुसलमानों की राजनीतिक मानसिकता अपना पिछला साँचा तोड़ चुकी है और नया साँचा ढल रहा है। इस घटना को घटे बीस वर्ष

बीत गये। इस अवधि में तरह-तरह के उतार-चढ़ाव होते रहे। यद्यपि परिस्थितियों की नई बाढ़ें आई, विचारों की नई-नई लहरें उठी, तथापि एक वास्तविकता बिना किसी परिवर्तन के अब तक कायम है, मुसलमानों की आम राय पीछे लौटने के लिए तैयार नहीं।

हाँ, वह अब पीछे लौटने के लिए तैयार नहीं। लेकिन आगे बढ़ने का मार्ग उस पर फिर संदिग्ध हो रहा है। मैं इस समय इसके कारण में नहीं जाऊँगा। मैं केवल प्रभाव देखने की कोशिश करूँगा। मैं अपने धर्मवालों को याद दिलाऊँगा कि मैंने 1912 ई० में जिस जगह से उन्हें सम्बोधित किया था, आज भी मैं उसी जगह खड़ा हूँ। इस पूरी अवधि ने परिस्थितियों का जो अंबार हमारे सामने खड़ा कर दिया है, उनमें कोई ऐसी परिस्थिति नहीं जो मेरे रास्ते से न गुजरी हों। मेरी आँखों ने देखने में और मेरे दिमाग ने सोचने में कभी कमी नहीं की। परिस्थितयाँ मेरे सामने से गुजरती ही न रही, मैं इनके अन्दर खड़ा रहा और मैंने एक-एक अवस्था की जाँच पड़ताल की। मैं लाचार हूँ कि मैं अपने अवलोकन को न झुठलाऊँ। मेरे लिए सम्भव नहीं कि अपनी आस्था से लड़े। मैं अपने अंतःकरण की आवाज को नहीं दबा सकता। मैं इस पूरी अवधि मैं उनसे कहता रहा हूँ और आज भी उनसे कहता हूँ कि हिन्दुस्तान के नौ करोड़ मुसलमानों के लिए सिर्फ वही एक कार्य मार्ग हो सकता है जिसका मैंने 1910 ई० में उन्हें निमंत्रण दिया था।

मेरे जिन समान धार्मियों ने 1910 ई० में मेरी आवाजों को स्वीकार किया था, मगर आज मुझसे मतभेद रखते हैं। मैं उन्हें इस मतभेद के लिए निन्दित नहीं करूँगा, मैं उनसे मुहब्बत और संजीदगी से अपील करूँगा, यह कौम और देश के भाग्य का मामला है। हम इसे भावनाओं के वेग में बहाकर तै नहीं कर सकते। हमें जीवन की ठोस वास्तविकताओं के धरातल पर अपने निर्णयों की दीवारें निर्मित करनी है। ऐसी दीवारें जो रोज बनाई और ढाई नहीं जा सकतीं। मैं स्वीकार करता हूँ कि दुर्भाग्यवश वक्त की फिजा धूलधुसरित (अंधकारमय) हो रही है, मगर उन्हें वास्तविकता के प्रकाश में आना चाहिए। वे आज भी हर पहलू से मामले पर गौर कर लें। वे इसके सिवा अग्रसर होने का कोई मार्ग नहीं पायेंगे। मैं मुसलमान हूँ और गर्व के साथ महसूस करता हूँ कि मुसलमान हूँ। इस्लाम को तेरह सौ

वर्षों की परम्पराएँ मुझे विरासत में मिली हैं। मैं तैयार नहीं कि इसका छोटे-से-छोटे हिस्सा भी नष्ट होने दूँ। इस्लामी शिक्षा, इस्लामी इतिहास, इस्लामी विद्याएँ और कलाएँ, इस्लामी संस्कृति मेरी संपत्ति की पूँजी हैं। और यह मेरा कर्त्तव्य है कि मैं इसकी रक्षा करूँ। एक मुसलमान के रूप में मैं धार्मिक और सांस्कृतिक क्षेत्र में अपना एक विशेष अस्तित्व रखता हूँ, और मैं यह बर्दाश्त नहीं कर सकता कि कोई इसमें हस्तक्षेप करे। लेकिन इन सभी अनुभूतियों के साथ मैं एक और अनुभूति रखता हूँ मेरे जीवन की वास्तविकताओं ने पैदा किया है। इस्लाम की आत्मा मुझे इससे नहीं रोकती वह इस राह में मेरा नेतृत्व करती है। मैं गर्व के साथ महसूस करता हूँ कि मैं हिन्दुस्तानी हूँ। मैं हिन्दुस्तान की अविभाज्य समग्र राष्ट्रीयता का तत्व हूँ। मैं समग्र राष्ट्रीयता का एक ऐसा महत्वपूर्ण तत्व हूँ जिसके बिना उसकी महानता अपूर्ण रह जाती है। मैं उसकी बनावट का एक अनिवार्य कारक हूँ। मैं अपने इस दावे को कदापि नहीं छोड़ सकता।

हिन्दुस्तान के लिए प्रकृति का यह निर्णय हो चुका था कि उसकी भूमि मनुष्य की विभिन्न नस्लों, विभिन्न संस्कृतियों और विभिन्न धर्मों के काफिलों की मंजिल बने। अभी इतिहास का प्रभात पूर्णरूपेण प्रकट भी नहीं हुआ था कि उन काफिलों का आगमन आरम्भ हो गया और फिर एक के बाद दूसरे के आने का क्रम जारी रहा। इसकी विशाल भूमि सबका स्वागत करती रही और इसकी उदार गोद ने सबके लिए जगह निकाली। उन्हीं काफिलों में एक अन्तिम काफिला हम इस्लाम धर्मावलम्बियों का भी था। यह भी पिछले काफिलों के पद-चिन्हों पर चलता हुआ यहाँ पहुँचा और सदा के लिए बस गया। यह संसार के दो भिन्न धर्मों और संस्कृतियों की धाराओं का संगम बना। यह पहले गंगा और यमुना की धाराओं की तरह एक दूसरे से अलग बहते रहे, फिर जैसा कि प्रकृति का अटल नियम है, दोनों को एक संगम में मिल जाना पड़ा। इन दोनों का मेल इतिहास की एक महत्वपूर्ण घटना थी। जिस दिन यह घटना घटी उसी दिन से प्रकृति के परोक्ष हाथों ने पुराने हिन्दुस्तान की जगह एक नये हिन्दुस्तान के ढालने का काम शुरू कर दिया। हम अपने साथ अपना भंडार लाये थे और यह भूमि भी अपने भंडारों से भरपूर थी। हमने अपनी सम्पत्ति इसके हवाले कर दी और इसके खजानों के दरवाजे हमारे लिए खोल दिये गये। हमने इसे इस्लाम के भंडार की वह सबसे कीमती चीज दे दी जिसकी इसे सबसे

अधिक आवश्यकता थी। हमने इसे जनतंत्र और मानवीय समता का संदेश पहुँचाया।

इतिहास की पूरी ग्यारह शताब्दियाँ इस घटना पर बीत चुकी हैं। अब इस्लाम भी इस भूमि पर वैसा ही दावा रखता है जैसा दावा हिन्दू धर्म का है। यदि हिन्दू धर्म कई हजार वर्षों से इसके निवासियों का धर्म रहा है तो इस्लाम भी एक हजार वर्ष से यहाँ के लोगों का धर्म रहा है। जिस प्रकार आज एक हिन्दू गर्व के साथ कह सकता है कि वह हिन्दुस्तानी है और हिन्दू धर्मावलम्बी है, ठीक इसी तरह हम भी गर्व से कह सकते हैं कि हम हिन्दुस्तानी हैं और इस्लाम धर्मावलम्बी हैं। मैं इस वृत्त को इससे ज्यादा फैलाऊँगा, मैं हिन्दुस्तानी ईसाई का भी यह हक स्वीकार करूँगा कि वह आज सिर उठाकर कह सकता है कि मैं हिन्दुस्तानी हूँ और हिन्दुस्तान के निवासियों के एक धर्म यानी ईसाई धर्म का अनुयायी हूँ।

ग्यारह शताब्दियों के सम्मिलित इतिहास ने हमारे हिन्दुस्तानी जीवन के सभी कोनों को रचनात्मक सामग्रियों से भर दिया है। हमारी भाषाएँ, हमारा काव्य, हमारा साहित्य, हमारा समाज, हमारी रूचि, हमारी पोशाक, हमारे रस्मो-रिवाज (प्रथाएँ), हमारे दैनिक जीवन की अगणित वास्तविकताएँ— कोई भी कोना ऐसा नहीं है जिसपर इस सामाजिक जीवन की छाप न लग सकी हो। हमारी बोलियाँ अलग-अलग थी, मगर हम एक ही भाषा बोलने लगे। हमारे रस्मो-रिवाज एक दूसरे से भिन्न थे, मगर उन्होंने मिलजुल कर एक नया साँचा पैदा कर दिया। हमारी पुरानी पोशाक इतिहास की पुरानी तस्वीरों में देखी जा सकती है, मगर अब वह हमारे शरीरों पर नहीं मिल सकती। ये सभी मिश्रित पूँजी हमारी संयुक्त राष्ट्रीयता की एक सम्पत्ति है और हम इसे छोड़कर उस युग की ओर लौटना नहीं चाहते जब हमारी यह मिली-जुली जिन्दगी शुरू नहीं हुई थी। हममें यदि ऐसे हिन्दू मस्तिष्क हैं, जो चाहते हैं कि एक हजार वर्ष पहले का हिन्दू जीवन वापस लाएँ तो उन्हें मालूम होना चाहिए कि वे एक स्वप्न देख रहे हैं और वह कभी पूरा होने वाला नहीं। इसी तरह अगर ऐसे मुसलमान दिमाग मौजूद हैं जो चाहते हैं कि अपनी उस गुजरी हुई संस्कृति और समाज को फिर ताजा करें जो वे एक हज़ार वर्ष पूर्व ईरान और मध्य एशिया से लाये थे, तो मैं उनसे भी कहूँगा कि वे इस सपने से जितना जल्द जाग्रत हो जाएँ

उत्तम है, क्योंकि यह एक अप्राकृतिक विचार है। और वास्तविकता की धरती पर ऐसे विचार उग नहीं सकते।

हमारी इस एक सहस्त्र वर्ष की सामाजिक संस्कृति और जीवन ने एक संयुक्त राष्ट्रीयता का साँचा ढाल दिया है। ऐसे साँचे बनाये नहीं जा सकते, वे प्रकृति के परोक्ष हाथों से शताब्दियों में अपने आप बना करते हैं। अब यह साँचा ढल चुका और भाग्य की मुहर इसपर लग चुकी, हम पसंद करें। या न करें मगर अब हम एक हिन्दुस्तानी राष्ट्र और अविभाज्य हिन्दुस्तानी राष्ट्र बन चुके हैं। पृथकता या विभाजन का कोई कृत्रिम विचार हमारे इस एक होने को दो नहीं बना सकता, अद्वैत को द्वैत में परिवर्तित नहीं कर सकता। हमें प्रकृति का निर्णय स्वीकार्य होना चाहिए और अपने भाग्य निर्माण में लग जाना चाहिए।

रामगढ़ कांग्रेस अधिवेशन

के भाषण से

मार्च, 1940 ई०

12

अहंवादी साहित्य के सम्बन्ध में कुछ वर्नमान आलोचकों ने यह मत व्यक्त किया है कि वह या तो बहुत अधिक रोचक होगा या बहुत ही नीरस। मध्यमार्ग का यहां कोई स्थान नहीं। अहंवादी साहित्य का तात्पर्य इस प्रकार का सभी लेखन है, जिस में एक लेखक का इगो (Ego) अर्थात "मैं" स्पष्ट रूप में सर उठाता है। उदाहरण स्वरूप आत्मकथाएँ, निजि घटनाएं व विचार, अनुभव तथा अनुभुतियां, वैयक्तिक विचार व चिंतन। मैंने 'स्पष्ट रूम से' की शर्त इसलिए लगाई है कि यदि न लगाई जाए तो यह घेरा बहुत ही विस्तृत हो जाएगा। क्योंकि अव्यक्त रूप में तो हर प्रकार के लेखन में लेखक का अहं उभर सकता है और उभरता रहता है। यदि इस परिप्रेक्ष्य में स्थिति पर दृष्टि डालिए तो हमारी विवशता दर्शनीय है। हम अपने मानसिक धरोहर को हर चीज से बचा ले जा सकते हैं परन्तु स्वंय अपने आप से नहीं बचा सकते। हम कितना ही अन्य पुरुष और द्वितीय पुरुष सर्वनाम के पर्दों में छिप कर चलें लेकिन प्रथम पुरुष की परछाईं पड़ती ही रहेगी। हम जहाँ जाते हैं हमारी छाया हमारे साथ जाती है। हमारी कितनी ही अन्य विस्मृतियां हैं जो वस्तुतः हमारी आत्मोपासना ही से पैदा होती हैं।

एक लेखक, एक कवि, एक चित्रकार एक साहित्यकार का अहंवाद (Egoism) क्या है ?—केवल एक विश्लेषनात्मक दृष्टि से मामले को देखिए यह अहंभाव वस्तुतः इसके अतिरिक्त कुछ नहीं है कि उसकी वैचारिक विशिष्टता का एक प्राकृतिक उफान है जिसे वह दबा नहीं सकता यदि दबाना चाहता है तो और अधिक उभरने लगती है तथा अपने अस्तित्व का प्रमाण देती है।

लेकिन साथ ही हम देखते हैं, अहं का यह ज्ञान कुछ इस प्रकार का है कि हर व्यक्तिगत अहं अपने आंतरिक दर्पण में जो बिम्ब डालता है बाहरी दर्पणों में उससे बिल्कुल उल्टा प्रतिबिम्ब पड़ने लगता है। भीतर के दर्पण में एक बड़ा अस्तित्व दिखाई देता है, बाहर के सभी दर्पणों में एक छोटी से छोटी आकृति उभरने लगती है।

यही स्थिति है जहाँ से हर लेखक की, जो स्वंय अपने सम्बन्ध में कुछ कहना चाहता है, सारी कठिनाइयां उभरने लगती हैं। वह स्वंय अपने प्रतिबिम्ब को, जो उसके आंतरिक दर्पण में प्रतिबिम्बित हो रहा है, नहीं झुठला सकता तो अचानक क्या देखता है कि बाहर के सभी दर्पण उसे झुठला रहे हैं। जो "मैं" स्वयं उसके लिए बहुत महत्व रखता है वही दूसरों की दृष्टि में सर्वथा महत्वहीन हो रहा है। वह अपने आप को ऐसी स्थिति में अनुभव करता है जैसे एक चित्रकार किसी कल्पना को साकार करने के लिए ब्रश उठाए परन्तु उसे विश्वास हो कि—मैं कितनी ही चित्रात्मक कल्पनाशीलता का प्रयोग करूँ मेरी आंख के सिवा कोई आँख इस कृति की सुन्दरता नहीं देख सकेगी।

इस कठिनाई से कुछ गिने चुने लेखक ही उबर सकने थे और उबरे हैं। ये वो लोग हैं जो अपने 'अहं' को बिना किसी प्रदर्शन और सजावट के दूसरों के सामने ले आने की क्षमता रखते थे। संसार के सामने उनका 'अहं' आया परन्तु इस प्रकार जैसे एक सहज आदमी बिना सजधज बनाए सामने आ खड़ा हो। यह बात कि एक आदमी बिना किसी बनावट के अपने वास्तविक रूप में सामने आ खड़ा हो, यथार्थ की प्रस्तुति का एक विशेष आकर्षण रखता है और इसीलिए संसार की दृष्टि सहसा अपनी ओर खींच लेता है। जो विशिष्ट लेखक ऐसा कर सके उनका "मैं" स्वयं उनके लिए कितना ही बड़ा और दूसरों के लिए कितना ही छोटा क्यों न हो, परन्तु उसकी मोहकता को नकारा न जा सका। संसार को उनके 'अहं' की मात्रा नापने का अवसर ही नहीं मिला वो उसका सहज यथार्थ देख कर मुग्ध हो गया।

ऐसे लोग अपने "मैं" का आवेग किसी तरह नहीं दबा सकते। उनकी निःशब्दता भी चीखने वाली और उनकी निस्तब्धता भी तड़पने वाली होती है। उनकी विशिष्टता दबाने से और अधिक उभरने लगती है। ऐसे लोग जब कभी "मैं" बोलते हैं तो उसमें इच्छा, बनावट और प्रदर्शन का कोई हस्तक्षेप नहीं होता। वह पुर्णतः वास्तविकता की एक सहज पुकार होती है।

किन्तु प्रत्येक सिद्धांत की तरह यहाँ भी अपवाद हैं। हमें स्वीकार करना पड़ता है कि कभी-कभी ऐसे व्यक्तित्व भी संसार के स्टेज पर प्रकट होते हैं जिनके अहं की मात्रा परिवर्द्धित नहीं होती बल्कि निरपेक्ष होती है, अर्थात स्वयं उन्हें उनका 'अहं' जितना बड़ा दिखाई देता है उतना ही बड़ा दूसरे भी देखने लगते हैं। उनके अहं की परछाई जब कभी पड़ेगी, तो चाहे भीतर का दर्पण हो या बाहर का, उसके आयाम सर्वदा समान रूप से सामने आएंगे।

ऐसे अतिविशिष्ट लोगों को सामान्य बौद्धिक स्तर से अलग रखना पड़ेगा। ऐसे लोग विचार एवं दृष्टि के साधारण तराजुओं से नहीं तौले जा सकते साहित्य एवं लेखन के साधारण नियम उन्हें अपने बन्धन में नहीं ले सकते। संसार को उनका यह अधिकार स्वीकार कर लेना पड़ता है कि वह जितनी बार चाहें मैं बोलते रहें। उनका प्रत्येक "मैं" उनके प्रत्येक "वह" और "तुम" से कहीं अधिक लुभावना होता है।

संभवतः टॉलस्टाय उन विशष्ट व्यक्तियों में से था जिनके 'अहं' को मात्रा परिवर्द्धित न होकर एक प्रकार की पुर्णता रखतो है। उसका अहं स्वयं उसे जितना बड़ा दिखाई दिया संसार ने भी उसे उतना ही बड़ा देखा। पिछली शताब्दी के अंतिम और वर्तमान शताब्दी के प्रारम्भिक युग मे शायद ही कोई समकालीन लेखक इस आत्मविश्वास के साथ "मैं" बोल सका जैसे यह विचित्र रुसी बोलता रहा। उसकी आत्मकथा, उसके व्यक्तिगत अनुभव एवं अनुभूतियां,उसके विभिन्न समयों के कथन, उसकी डायरी, उसके साहित्यिक और विधात्मक निबन्ध, सभों में उसका 'अहं' बिना किसी पर्दे के सामने आया और संसार उसे विश्वस्तर के लेखन के समतुल्य इकट्ठा करता रहा। उसकी

आत्मकथा, जो एक रंगहीन सादगी के साथ लिखी गई, उसकी "वार एंड पीस" या "अन्ना कारनीना" से कम रुचिकर नहीं और वस्तुतः इन दोनों में भी हम उसके अहं की पुकार ही सुन रहे हैं। समय की गति उसके लेखन की चमक को मद्धिम नहीं कर सकी। पिछले युद्ध के समय लोग उसकी 'वार एंड पीस' नए सिरे से ढूंढने लगे थे, अब फिर ढूंढ रहे हैं।

वर्तमान युग में टॉलस्टाय की महानता एक चिन्तक के रूप में बहुत कम लोगों को आकर्षित कर सकेगी। यूरोप और अमेरिका के बुद्धिजीवी वर्ग में बहुत कम लोग ऐसे निकलेंगे जो उसके सामाजिक, दार्शनिक और सौन्दर्य बोधात्मक विचारों को उस दृष्टि से देखने के लिए तैयार हों जिस दृष्टि से इस शताब्दी के प्रारंभिक काल के लोग देखा करते थे। फिर भी उसके अहंवादी साहित्य की मोहकता को कोई नकार नहीं सकता। उसके अदभुत जीवन का रहस्य अब भी वाद विवाद का एक रोचक विषय है। हर दूसरे तीसरे वर्ष कोई नई पुस्तक आती रहती है।

पिछली शताब्दी के अंतिम और वर्तमान शताब्दी के प्रारम्भिक काल में बड़ी संख्या में आत्मजीवनियां लिखी गईं। कहा जा सकता है कि इस काल के हर चौथे लेखक ने आवश्यक समझा कि अपने बीते हुए जीवन को अंतिम अवस्था में फिर एक बार दुहरा ले। विश्व भर के पुस्तकालयों ने उन सबको अपनी अलमारियों में स्थान दिया परन्तु दिमागों में स्थान बहुत कम के लिए निकल सका।

गुबारे-खातिर

अहमदनगर जेल से लिखे पत्रों के संग्रह से

9 जनवरी, 1943 ई०

13

प्यारे भाइयो, आप जानते हैं कि वह कौन-सी जंजीर है जो मुझे यहाँ खींच लाई है। मेरे लिए शाहजहाँ की इस यादगार मस्जिद में यह लोगों का मजमा नया नहीं। मैंने उस जमाने में भी जबकि इस पर एक लम्बी अवधि बीत चुकी है। तुम्हें सम्बोधित किया था जब तुम्हारे चेहरों पर उदासी की जगह इत्मीनान था और तुम्हारे दिलों में शंका की जगह विश्वास। आज तुम्हारे चेहरों की व्याकुलता और दिलों की परेशानी देखता हूँ तो मुझे अकस्मात पिछले चंद वर्षों की भूली-विसरी कहानियाँ याद आ जाती हैं। तुम्हें याद है मैंने तुम्हें पुकारा और तुमने मेरी जबान काट ली। मैंने लेखनी उठाई और तुमने मेरे हाथ काट दिये। मैंने चलना चाहा, तुमने मेरे पैर काट दिये। मैंने करवट लेना चाहा, तो तुमने मेरी कमर तोड़ दी। यहाँ तक कि पिछले सात वर्षों की कटुतापूर्ण राजनीति जो तुम्हें आज जुदाई रूपी कलंक दे गई है, उसके उत्कर्ष युग में भी मैंने तुम्हें हर खतरे के राजपथ पर झिंझोड़ा, लेकिन तुमने मेरी आवाज की न सिर्फ आलोचना की, बल्कि गफलत और इन्कार की सारी सुन्नतें ताजा कर दीं। परिणामस्वरूप उन्हीं खतरों ने तुम्हें घेर लिया है जिनकी शंका तुम्हें सेराते मुस्तकीम (सीधे रास्ते) से दूर ले गई थी।

सच पूछो तो अब मैं एक जमूद (जमा हुआ) हूँ, स्तब्ध हूँ, या दूर चली गई आवाज, जिसने वतन में रहकर वतन से दूर रहने का जीवन व्यतीत किया। इसका तात्पर्य यह नहीं कि जो स्थान मैंने पहले दिन अपने लिए चुन लिया था वहाँ मेरे बाल और पर काट लिये गये हैं या मेरे घोंसले के लिए जगह नहीं रही, बल्कि यह कहना चाहता हूँ कि मेरे दामन को तुम्हारी ज्यादतियों से शिकायत है। मेरी अनुभूति घायल है और मेरे दिल को दुःख है। सोचो तो सही, तुमने कौन सा मार्ग चुना, कहाँ पहुँचे और अब कहाँ खड़े हो ? क्या यह खौफ की जिन्दगी नहीं और क्या तुम्हारी समझ में विघ्न नहीं पड़ गया ? यह भय तुमने स्वयं प्राप्त किया है।

अभी बहुत दिन नहीं बीते जब मैंने तुम्हें कहा था कि दो कौमों का दृष्टिकोण वास्तविक जीवन के लिए मृत्यु रोग का दर्जा रखता है, इसको छोड़ो। यह स्तम्भ जिनपर तुमने भरोसा किया हुआ है बहुत तेजी से टूट रहे हैं। लेकिन तुमने सुनी अनसुनी बराबर कर दी और यह न सोचा कि समय और उसकी गति तुम्हारे लिए अपना नियम नहीं बदल सकते। समय की गति रूकी नहीं। तुम देख रहे हो कि जिन सहारों पर तुम्हारा भरोसा था वे तुम्हें लावारिस समझकर तकदीर के हवाले कर गये हैं, वह तकदीर जो तुम्हारे दिमागी शब्दकोश में तुम्हारी इच्छानुसार विभिन्न अर्थ रखती है, यानी तुम्हारे पास साहस के अभाव का नाम तकदीर है।

अंग्रेज की शक्ति तुम्हारी इच्छा के विरूद्ध उलट दी गई और पथ-प्रदर्शन के लिए तुमने जिन प्रतिमाओं का निर्माण किया था वे भी धोखा दे गईं। हालांकि तुमने समझा था कि यह शक्ति हमेशा के लिए कायम की गई है और उन्हीं प्रतिमाओं की पूजा में तुम्हारा जीवन है। मैं तुम्हारे घावों को कुरेदना नहीं चाहता और तुम्हारी बेचैनी में और वृद्धि करने की मेरी इच्छा नहीं है। लेकिन कुछ दूर भूतकाल की तरफ पलट जाओ तो तुम्हारे लिए बहुत सी गिरहें खुल सकती हैं। एक समय था, मैंने हिन्दुस्तान की आजादी की प्राप्ति की अनुभूति कराते हुए तुम्हें कहा था :

जो होने वाला है उसको कोई कौम अपने दुराग्रह से रोक नहीं सकती हिन्दुस्तान के भाग्य में भी राजनीतिक क्रान्ति लिखी जा चुकी है और इसकी गुलामी की जंजीरें बीसवीं शताब्दी के विप्लव के झोंके से कटकर गिरने वाली हैं, यदि तुमने समय के पहलू-ब-पहलू कदम उठाने में असमंथता प्रदर्शित की और जड़ता की वर्तमान जीवन-धारा को अपना स्वाभाविक आचरण बनाए रखा तो भविष्य का इतिहासकार लिखेगा कि—

"तुम्हारे गिरोह ने जो सात करोड़ आदमियों का एक झुंड था, देश की आजादी के बारे में वह रवैया अपनाया जो अस्तित्व के पन्ने से मिट जाने वाली कौमों का आचरण हुआ करता है। आज हिन्दुस्तान आजाद है और तुम अपनी आँखों से देख रहे हो वह सामने लाल किले की दीवार पर आजाद हिन्दुस्तान का झंडा पूरे शान से लहरा रहा है। यह वही झंडा है जिसकी उड़ानों की, हाकिमाना अहंकार के दिल दुखाने वाले कहकहे हँसी उड़ाया करते थे।"

यह ठीक है कि समय ने तुम्हारी इच्छाओं के अनुकूल अंगड़ाई नहीं ली, बल्कि उसने एक कौम के जन्मसिद्ध अधिकार के सम्मान में करवट बदली है और यही वह क्रान्ति है जिसकी एक करवट ने तुम्हें बहुत हद तक भयभीत कर दिया है। तुम ख्याल करते हो कि तुमसे कोई उत्तम वस्तु छिन गई और उसकी जगह कोई बुरी वस्तु आ गई। यह सच्चाई नहीं, भ्रम है। वास्तविकता यह है कि बुरी वस्तु चली गई और उत्तम वस्तु आ गई। हाँ, तुम्हारी व्याकुलता इसलिए है कि तुमने अपने को अच्छी चीज के लिऐ तैयार नहीं किया था और बुरी चीज को ही वास्तविक मुक्ति समझ रखा था मेरा तात्पर्य विदेशी गुलामी से है जिसके हाथ में तुमने बहुत दिनों तक हाकिमाना ख्वाहिश का खिलौना बनकर जीवन व्यतीत किया है। एक दिन था जब तुम किसी जंग के शुरू करने की फिक्र में थे और आज उस जंग के अंजाम से व्याकुल हो। आखिर तुम्हारी उस जल्दबाज़ी पर क्या कहूँ कि उधर अभी यात्रा की जिज्ञासा समाप्त नहीं हुई और इधर भटकने का खतरा सामने आ गया है।

मेरे भाई, मैंने हमेशा राजनीति को व्यक्तिवाद से अलग रखने की कोशिश की है और कभी उस कंटकपूर्ण घाटी में कदम नहीं रखा। यही कारण है कि मेरी बहुत सी बातें संकेतों का पहलू लिये होती है। लेकिन मुझे आज जो कहना है मैं बेरोक होकर कहना चाहता हूँ। संयुक्त हिन्दुस्तान का विभाजन बुनियादी तौर पर गलत था। धार्मिक मतभेदों को जिस ढंग से हवा दी गई उसका अनिवार्य परिणाम यही प्रभाव और दृश्य थे जो हमने अपनी आँखों से देखे और दुर्भाग्यवश कुछ स्थानों पर अभी भी देख रहे हैं।

पिछले सात वर्षों की दशा दुहराने से कोई खास लाभ नहीं और न उससे कोई अच्छा नतीजा निकल सकता सकता है। बेशक हिन्दुस्तान के मुसलमानों पर जो विपत्तियों का पहाड़ टुटा है वह निश्चय ही मुस्लिम लीग के गलत नेतृत्व की खुली गलती का स्पष्ट परिणाम है। यह सब कुछ मुस्लिम लीग के लिए तो आश्चर्य का कारण हो सकता है, लेकिन मेरे लिए इसमें कोई नई बात नहीं। मैं पहले दिन ही से इन परिणामों पर नजर रखता हूँ।

अब हिन्दुस्तान की राजनीति का रूख बदल चुका है। मुस्लिम लीग के लिए यहाँ कोई जगह नहीं है। अब यह हमारे अपने दिमागों पर निर्भर है कि हम किसी अच्छी चिन्तन-पद्धति के अनुकूल सोच भी सकते हैं या नहीं।

इस विचार से मैंने नवम्बर के दूसरे सप्ताह में हिन्दुस्तान के मुसलमान नेताओं को दिल्ली बुलाने का इरादा किया है। निमंत्रण-पत्र भेज दिये गये हैं। अभी जो स्थिति है, वह अस्थायी है। मैं तुमको विश्वास दिलाता हूँ कि हमको हमारे सिवा कोई कमजोर नहीं कर सकता।

मैंने हमेशा कहा और आज भी कहता हूँ कि शक शुब्हे का रास्ता छोड़ दो। शक से हाथ उठा लो और निष्क्रियता को तिलांजली दे दो। यह तीन धार का अनोखा खंजर (कटार) लोहे की उस दो धारी तलवार से अधिक घातक है जिसके घाव की कहानियाँ मैंने तुम्हारे नौजवानों की जबानी सुनी हैं।

यह भाग-भगाव का जीवन जो तुमने हिजरत के पवित्र नाम पर अपनाया है, इस पर गौर करो। तुम्हें महसूस होगा कि यह गलत है। अपने दिलों को मजबूत बनाओ और अपने दिमागों को सोचने की आदत डालो और फिर देखो कि तुम्हारे ये फैसले कितने जल्दबाजी के हैं। आखिर कहाँ जा रहे हो और क्यों जा रहे हो? यह देखो, मस्जिद के मीनार तुमसे झुककर सवाल करते हैं कि तुमने अपने इतिहास के पृष्ठों को कहाँ गुम कर दिया है? अभी कल की बात है कि यहीं जमना के किनारे तुम्हारे काफिलों ने वुजू (प्रक्षालन) किया था और आज तुम हो कि यहाँ रहते हुए खौफ महसूस होता है, हालाँकि दिल्ली तुम्हारे खून की सींची हुई है।

अजीजो अपने भीतर एक बुनियादी परिवर्तन पैदा करो जिस तरह आज से कुछ दिन पहले तुम्हारा जोश और आवेश अनुचित था, उसी तरह आज तुम्हारा खौफ और भय भी अनुचित है। मुसलमान और बुजदिली या मुसलमान और उत्तेजना एक जगह जमा नहीं हो सकते। सच्चे मुसलमान को न तो कोई लालच हिला सकता है और न कोई खौफ डरा सकता है। चंद इन्सानी चेहरों के दृष्टि से ओझल हो जाने से डरो नहीं। उन्होंने तुम्हें जाने के लिए ही एकत्र किया था। आज उन्होंने तुम्हारे हाथ में से अपना हाथ खींच लिया है, तो यह आश्चर्य की बात नहीं। यह देखो कि तुम्हारे दिल तो उनके साथ ही रुखसत नहीं हो गये। अगर दिल अभी तक तुम्हारे पास है तो उसको अपने उस खुदा की जलवागाह बनाओ जिसने आज से तेरह सौ वर्ष पहले अरब के एक उम्मी (पैगम्बर) के द्वारा फरमाया था—

"जो खुदा पर ईमान लाये और उसपर जम गये तो उनके लिए न तो किसी तरह का डर है और न कोई गम।" हवाएँ गुजर जाती हैं। यह झंझावात सही, मगर उसकी उम्र कुछ ज्यादा नहीं। अभी देखते-देखते विपत्तियों का यह मौसम गुजरने वाला है। यों बदल जाओ जैसे तुम पहले कभी इस हालत में न थे।

मैं भाषण में पुनरावृत्ति का अभ्यस्त नहीं हूँ, लेकिन मुझे तुम्हारी असीम बेपरवाई को दृष्टि में रखते हुए बार-बार कहना पड़ता है कि तीसरी शक्ति अपने घमंड का बोझ उठाकर रवाना हो चुकी है। जो होना था, वह होकर रहा है। राजनीतिक मानसिकता अपना पिछला साँचा तोड़ चुकी और अब नया साँचा ढल रहा है। अगर अब भी तुम्हारे दिलों का मामला बदला नहीं और दिमागों की चुभन खत्म नहीं हुई तो फिर हालत दूसरी है। लेकिन अगर वास्तव में तुम्हारे भीतर सच्चे परिवर्तन की इच्छा उत्पन्न हो गई है तो फिर इस तरह बदलो जिस तरह इतिहास ने अपने को बदल लिया है।

आज भी जबकि हमने एक क्रान्ति के दौर (युग) को पूरा कर लिया है, हमारे देश के इतिहास में कुछ पृष्ठ खाली हैं, और हम इन्हीं पृष्ठों में शीर्षक-शृंगार बन सकते हैं। मगर शर्त यह है कि हम इसके लिए तैयार भी हैं।

प्यारे, परिवर्तनों के साथ चलो। यह न कहो कि हम इस परिवर्तन (क्रान्ति) के लिए तैयार न थे, बल्कि अब तैयार हो जाओ। सितारे टूट गये, लेकिन सूरज तो चमक रहा है। उससे किरणें माँग लो और उन अंधेरे मार्गों में बिछा दो जहाँ प्रकाश की नितांत आवश्यकता है।

मैं तुम्हें यह नहीं कहता कि तुम प्रशासन रूपी शिक्षालय से वफादारी का प्रमाण-पत्र प्राप्त करो और खुशामद (जी-हुजूरी) वाली वही जिन्दगी अपना लो जो विदेशी शासकों के युग में तुम्हारा आचरण रहा है। मैं कहता हूँ जो उज्ज्वल फूल-पत्ती और बेल-बूटे तुम्हें इस हिन्दुस्तान में भूतकाल की यादगार के रूप में नजर आ रहे हैं उन्हें तुम्हारा वही काफला लाया था। इन्हें भुलाओ नहीं, इन्हें छोड़ो नहीं। इनके वारिस बनकर रहो और समझ लो कि अगर तुम भागने के लिए तैयार नहीं तो फिर तुम्हें कोई ताकत नहीं भगा सकती।

आओ प्रतिज्ञापूर्वक स्वीकार करो कि यह देश हमारा है। हम इसके लिए हैं ओर इसके भाग्य के मौलिक निर्णय हमारी आवाज के बिना अधूरे ही रहेंगे।

आज भूकम्प से डरते हो, कभी तुम स्वयं एक भूकम्प थे। आज अंधेरे काँपते हो। क्या याद नहीं रहा कि तुम्हारा अस्तित्व एक उजाला था। यह बादलों के पानी का बहाव क्या है कि तुमने भीग जाने की आशंका से पाजामें की मोहरी ऊपर चढ़ा ली है। वे तुम्हारे ही पूर्वज थे जो समुद्रों में उतर गये, पर्वतों की छातियों को रौंद डाला। बिजलियाँ आई तो उनपर मुस्कराये। बादल गरजे तो कहकहों से जबाब दिया। झंझावात आए तो उनका रूख फेर दिया। आंधियां आई तो उनसे कहा कि यह तुम्हारा मार्ग नहीं है। यह ईमान की नितान्त कमजोरी है कि सम्राटों के गिरेबानों से खेलने वाले आज खुद अपने ही गिरेबान के तार बेच रहे हैं और खुदा से इस प्रकार गाफिल या लापरवाह हो गये हैं मानो उसपर कभी ईमान ही नहीं था।

प्यारो, मेरे पास तुम्हारे लिए कोई नया नुस्खा नहीं है, चौदह सौ वर्ष पहले का नुस्खा है, वह नुस्खा जिसको मानव जगत का सबसे महान मुहसिन (उपकारक) लाया था।

जामा मस्जिद दिल्ली का भाषण

अक्तूबर, 1947 ई०

14

मुसलमानों की वर्त्तमान स्थिति और देश के भविष्य को देखते हुए इससे अधिक आवश्यक कोई बात नहीं हो सकती कि जहाँ तक देश के राजनीतिक जीवन का सम्बन्ध है, सांप्रदायिकता को, जो धर्म के नाम से उभारी गई है, सदा के लिए दफन कर दिया जाए। किसी एक पक्ष की सांप्रदायिकता नही, किसो एक समुदाय की सांप्रदायिकता नहीं, सब की सांप्रदायिकता। उन बर्बादियों में, जो 15 अगस्त के बाद से होती रही हैं, दुर्भाग्यवश प्रत्येक सांप्रदायिक वर्ग के लोग बढ़ोत्तरी ही करते रहे और कोई सुमुदाय ऐसा नहीं जिस पर खून का धब्बा न लगा हो। मुसलमानों के हाथ पर खून का धब्बा है, हिन्दुओं के हाथ पर भी खून का धब्बा और सिखों के हाथ पर भी खून का धब्बा लगा हुआ है। मुझसे कोई नहीं कह सकता कि मुसलमानों के हाथ पर खून का धब्बा नहीं है और वह स्वच्छ है। जहाँ तक सांप्रदायिकता का सम्बन्ध है, स्पष्ट है कि यह सांप्रदायिकता एक दरवाजे से नहीं आई बल्कि कई दरवाजों से आई है, तो यह सब दरवाजे बंद होना चाहिए। मैं आपसे निवेदन करता हूँ कि अगर यह चाहते हैं कि हिन्दुस्तान, जिसकी आजादी का हम 70 वर्षों से ख्वाब देख रहे थे, बर्बाद न हो और बर्बादी किसी नए दरवाजे में न घुस जाए तो हमारा यह कर्तव्य हो जाता है कि जिस दरवाजे से यह सांप्रदायिकता आई है, उसी दरवाजे को बंद कर दें और इसको खत्म कर दें। इसमें शक नहीं कि इस संप्रदायिकता का एक बहुत बड़ा दरवाजा मुस्लिम लीग की वजह से खुला। मैं नाम न लेता, इसलिए कि मैंने अभी कहा कि मैं किसी पक्ष की निंदा नहीं करना चाहता परन्तु घटना एवं स्थिति से स्पष्ट होता है कि सांप्रदायिकता का दरवाजा मुस्लिम लीग ने खोला और पिछले दस वर्ष का इतिहास इसका गवाह है। अब अगर वह दरवाजा बंद नहीं

किया जाता है तो इसमें शक नहीं है कि वर्तमान कठिनाइयों के सामाधान की बहुत बड़ी जिम्मेदारी मुसलमानों के कन्धे पर बची रहती है। इसीलिए जो बात 15 अगस्त से पहले हमारे लिए सही थी वह कम से कम हमारे निकट आज भी सही होनी चाहिए। यदि आज भी आप इसको सही नहीं देखते हैं तो मैं समझता हूँ कि आप से फिर मुसलमाननों की भलाई की कोई आशा नहीं रखी जा सकती। बहरहाल जो चीज इस समय मुसलमानों के लिए सबसे अधिक आवश्यक है वो यह है कि सांप्रदायिकता को रोक कर अपने राष्ट्रीय जीवन को बचाएँ और यथाशीघ्र बचाएँ। मैं समझता हूँ कि जो संगठन एक दिन का भी इस निर्णय में विलंब करता है वो देश की बर्बादी के भार को और बढ़ाता जाता है, देश को बर्बादी के जो ईंट चुने हुए हैं वो इस निर्माण में और नई ईंट चुनता जाता है।

परन्तु जहाँ तक इस सम्मेलन का सम्बन्ध है, आप साफ दो टूक निर्णय लें कि अब आइन्दा कोई मुस्लिम संगठन कोई मुस्लिम संघ राजनीति के क्षेत्र में सांप्रदायिक आधार पर स्थापित न करेंगे, और किसी संगठन के उद्देश्य पर सांप्रदायिकता की परछाईं भी न पड़नो चाहिए। इसमें शक नहीं कि अपने धार्मिक अधिकारों के लिए अपने धार्मिक हितों के लिए, अपने सांस्कृतिक उद्देश्यों के लिए विभिन्न संगठनों की आवश्यकता है। यदि वो चाहें ऐसे संगठन रखें इसमें कोई आपत्तिजनक बात नहीं। यही नहीं बल्कि आवश्यक है कि कोई ऐसा संगठन हो जो मुसलमानों के धार्मिक, सांस्कृतिक और शैक्षिक हितों की देखरेख करे। यह महत्वपूर्ण कालम है और इसको भरना है। इसे खाली नहीं छोड़ना चाहिए। परन्तु आज आपको यह निर्णय करना है कि जिन संगठनों का राजनीतिक उद्देश्यों से सम्बन्ध है उन में सांप्रदायिकता का कोई आधार, अर्थात यह कि यह मुसलमान है, यह हिन्दु है, यह सिख है, नहीं होना चाहिए। पर यदि आप समझते हैं कि ऐसा होना देश के हित में घातक है तो आपको साफ-साफ निर्णय लेना चाहिए कि जहाँ तक मुसलमानों का सम्बन्ध है वह नहीं चाहते कि हिन्दुस्तान के आकाश तले कोई सांप्रदायिक व्यवस्था बची रहे।

इसके बाद भी एक व्यवहारिक प्रश्न बचा रहता है वो यह कि आपको चाहिए कि कल नहीं तो परसों ही बैठकर यह निर्णय ले लें। परन्तु केवल निर्णयों से काम पूरा नहीं होता। अगर आपने यहाँ प्रस्ताव पारित कर लिया और घर जा कर चुप बैठ गए तो इससे कोई नतीजा नहीं निकल सकता और न देश का वातावरण जो दूषित हो गया है ठीक हो सकता है। यह तो जब ही हो सकता है कि आप कोई न कोई ऐसी मशीन तत्काल बना लें जो इन निर्णयों को कर्म के धरातल पर खड़ा करे और सभी मुसलमानों के भीतर एक नया वातावरण पैदा कर दे। आप को मालूम है कि पिछले दस वर्षों के भीतर किस प्रकार का वातावरण पैदा किया जा चुका है यदि अब आपने यह निर्णय लिया कि एक नई कार्य पद्धति से हम वातावरण निर्मित कर लेंगे तो फिर उसके लिए एक मशीन होनी चाहिए। तब मेरा मशविरा यह है कि आप एक कमीटी बनाएँ जो असांप्रदायिक हो। क्योंकि यदि आप यह निर्णय लेते हैं कि आपको इन उद्देश्यों के लिए कोई सांप्रदायिक संगठन नहीं बनाना चाहिए तो फिर इस कमोटी का भो असांप्रदायिक होना आवश्यक है। इस कमीटी का यह काम हो कि इस कान्फ्रेंस के निर्णयों को सामने रखते हुए देश में वातावरण तैयार करे। यह तीन चीजें यदि आप इस कांफ्रेंस म तय कर लें तो आप समय की बड़ी सेवा कर लेंगे।

मुसलमानों का

आगामी कार्यक्रम

लखनऊ की मुस्लिम कांफ्रेंस में मौलाना आजाद के भाषण से

दिसम्बर, 1947 ई०